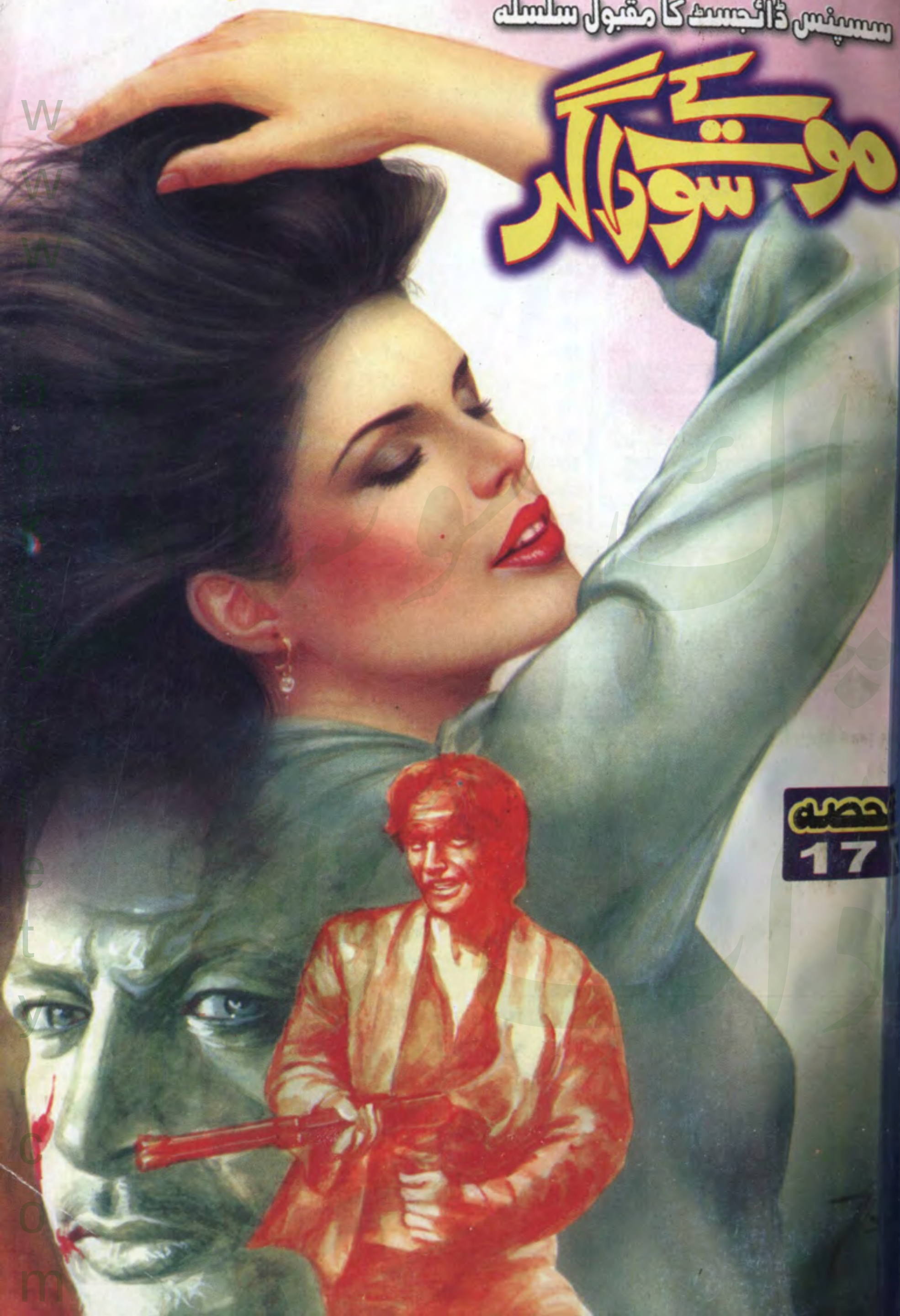

سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
موت کے سوداگر
حصہ
17

موت کے سوداگر

اقلیم علیم

ایک نوجوان کی خود نوشت اس نے منشیات کے عالمی اسمگلروں کے خلاف ذاتی طور پر محاذ کھولا اور وطن عزیز سے ان ملک دشمنوں کا صفایا کرنا اپنا ایمان بنالیا۔ شہر، شہر، ملک ملک، اور براعظم براعظم اپنے مشن کی تکمیل کے لئے خاک اڑانا اس نوجوان کا شغل ہو گیا مگر موت کے سوداگر بھی تو اس کی جان کے دشمن بن گئے۔ انھوں نے بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک جنگ جو ابھی جاری ہے۔

سسپنس کا تعمیری سلسلہ۔ آئندہ نسلوں کو زہر فروخت کرنے والوں کی تصویریں

ہر طرف شور و غوغا مچنے پر اگر دونوں ہی ٹیکسی ڈرائیور فرض شناسی کے جذبے سے مغلوب ہو کر زبان کھولنے پر تل جاتے تو سب سے پہلا نکتہ یہ سامنے آتا کہ گیتا کے ساتھ ادھیڑ کے راستے اس کے گھر تک پہنچنے والا۔ شخص گورا چٹا ہونے کے باوجود ایک ایشیائی باشندہ تھا جب کہ مقتول گورے کا پیچھا کرنے والی لڑکی سر سے پیر تک مغربی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اس واردات میں ایک خوبرو مغربی دوشیزہ اور صحت مند ایشیائی شخص کا کردار سامنے آتے ہی پولیس کو ایک راہ مل جاتی۔

لندن انسانوں کا ایک سمندر ہے جہاں مصروف شاہراہوں اور ٹیوب اسٹیشنوں پر انسانوں کے ریلے چلتے ہیں اور ان سبک رفتار انسانی لہروں میں کسی ایک فرد کو شناخت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ لندن شہر کے نئے اور پرانے باسیوں کی اس بھیڑ میں دنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے وہ رنگا رنگ سیاح بھی شامل ہوتے ہیں۔ جنہیں رنگ و نور میں بسے ہوئے اس شہر کی رنگینیاں عزت و احترام سے اپنی طرف بلاتی ہیں۔

عام حالات میں یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اس دہرے قتل کے بعد لندن پولیس براہ راست میری اور ویرا کی طرف متوجہ ہو جاتی لیکن مغربی لڑکی اور ایشیائی مرد پر مشتمل جوڑے کی بات بہت مختلف تھی۔ وہ راز فاش ہوتے ہی ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا جنرل منیجر رینی کیریان خود ہی پولیس کو فون کر کے باخبر کر دیتا کہ اس کے ہوٹل کے کمرا نمبر سات میں ایسا ہی ایک جوڑا ٹھہرا ہوا ہے۔

وہ خیال آتے ہی میرے جسم کے سارے مساموں میں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ خارج ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا...... سنسنی اور خوف سے مضطرب ہو کر میں مسہری سے اٹھ گیا۔

ویرا نے لندن سے کسی اور شہر کی طرف کوچ کرنے کی بات کی تھی۔ اگر معاملہ صرف لندن پولیس کا ہوتا تو وہ

تجویز بہت جان دار تھی۔ مجھے صورت حال اس سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔ بات کھلتے ہی وہ قصہ پورے ملک کے طول و عرض میں پھیل جاتا۔

لندن بڑا اور رنگا رنگ شہر ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے ایک بہتر جائے امان تھا۔ چھوٹے شہروں میں ہماری گرفت کے امکانات بہت بڑھ جاتے۔ ہمیں انسانوں کے اسی سمندر میں رہ کر اپنی چمڑی بچانے کی کوشش کرنی تھی۔

''یہ تم کیا خرافات دیکھ رہی ہو؟'' میں نے ٹیلی وژن کی اسکرین پر چیختے چلاتے عجوبوں کو دیکھ کر اضطراری لہجے میں ویرا کو ٹوکا۔

''خرافات نہیں، یہ اس دور کی کریز ہے اور اسے مائیکل جیکسن کہتے ہیں جس کا مجسمہ تمہیں مادام تساؤ کے موی عجائب گھر میں رنگ بدلتی ہوئی ڈسکو لائٹس میں گنگناتا ہوا نظر آئے گا۔''

''میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے موڈ کو سمجھ کر بے بسی سے کہا۔

''دیکھو یہ ایک مرد ہے۔'' وہ میری بات کو نظر انداز کر کے ٹیلی وژن اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔ ''جب یہ اپنی کمر لچکا کر اور کولھے مٹکا کر کسی روبوٹ کی طرح بریک ڈانس کے ٹھمکے لگاتا ہے تو مسرت سے اس کے سارے تماشائیوں کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھ کر تم بھی اسے دیکھو۔ عورتوں جیسی صورت والا یہ رقاص گلوکار ایک ہی سوراخ سے لوگوں کو بار بار ڈستا ہے۔''

''کیا بک رہی ہو؟'' میں نے جھلا کر کہا ''مجھے مائیکل جیکسن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''نہ ہو لیکن میرا فرمایا ہوا مستند ہے۔ تمہاری اردو کی ہی کہاوت ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا مگر یہ گانے بجانے والا مستقل مزاجی سے یہی سب کر رہا ہے۔ یہ کراچی ایئر پورٹ پر ٹرانزٹ میں ذرا سی دیر کے لیے رکا تھا تو بدمست لڑکے اور لڑکیاں اس کے کپڑوں کی ایک ایک دھجی نوچ کر یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تم کیسے بدذوق ہو کہ اپنی نئی نسل کے ایسے محبوب و مرغوب فن کار میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہے۔ دیکھو، دیکھو، وہ پھر ٹھمکا... ہا ہے۔''

''ویرا تم پر لعنت ہو۔ میں سنجیدگی سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''سنجیدہ باتیں اس وقت صرف ایک ہی موضوع پر ہو سکتی ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا ''اور وہ موضوع تم نے اس کمرے کے لیے ممنوع قرار دے دیا ہے۔ کوئی ہلکی پھلکی بات کرو۔ مائیکل جیکسن پسند نہیں تو میں ہوٹل کا وڈیو والا چینل لگائے دیتی ہوں۔ اس پر خاصی بے ہودہ فلم چل رہی ہے۔''

ویرا کی وہ بے نیازی میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے جھپٹ کر ٹیلی وژن کا سوئچ بند کر دیا۔

ویرا کے ستواں اور گلابی ہونٹوں پر ایک نخوت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی جو اس وقت میری ہڈیوں تک کو سلگا دینے کے لیے کافی تھی۔

''بیٹھ جاؤ!'' ویرا نے ناصحانہ لہجے میں کہا ''اب ہم آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی طرح آنے والی مشکلات کے حل کی کوئی سبیل نکل آئے۔''

''میں سنگین خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔'' میں نے لمحہ بھر توقف کے بعد کہا۔

''چٹکی سے اپنے دونوں نتھنے دبا لو، بو ختم ہو جائے گی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''آخر تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری اجازت کے بغیر میں کیا چاہ سکتی ہوں؟''

''میں نے تم پر ایسی کوئی پابندی تو نہیں لگائی۔'' میں نے احتجاج کیا۔

وہ تلخی سے ہنس پڑی ''سنو ڈینی! ہم دونوں دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ ہے اور وہی تمہیں کھائے جا رہا ہے۔ یہاں تم اس سے گریز کیوں کر رہے ہو، یہ ہوٹل کا پرائیویٹ کمرا ہے، ابھی قتل کا راز فاش نہیں ہوا۔ ہم اردو میں باتیں کر رہے ہیں پھر یہاں کیا خطرہ ہے؟ ہم نے وقت برباد کر دیا تو پھر ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ لندن میں گوریوں اور کالوں کی آشنائیاں تو ہزاروں سے بھی متجاوز ہوں گی مگر ہم دونوں کی طرح ایک دوسرے سے چپکے ہوئے جوڑے چند ہی ہوں گے۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیوروں کے بیان نشر ہوتے ہی اس ہوٹل کی انتظامیہ پولیس کو بلا لے گی۔''

''اوہ! تو تم بھی یہی سوچ رہی ہو۔ اس خطرے نے میرا سکون چھین لیا ہے۔''

''یہ بے کار اور جذباتی باتیں ہیں۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟''

''عقل ماؤف ہے۔ اسی لیے تم سے بات کرنی چاہ رہا تھا، تم کیا کہتی ہو؟''

''فوراً سے پیشتر لندن چھوڑ دو۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''انگلستان ہریالی میں نہایا ہوا حسین ملک ہے۔ یہاں سے چند گھنٹوں کی مسافت پر لیک ڈسٹرکٹ کا حسین ترین علاقہ ہے۔ کرائے پر گاڑی لے کر ہم دو چار ہفتوں کے لیے آسانی سے وہاں کی کسی کیمپنگ سائٹ پر ہنی مون منا سکتے ہیں۔ ان دور افتادہ مضافات میں کسی کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ لندن میں کیا ہو رہا ہے۔ خدمت گاروں کو فراخ دلی سے ٹپ دیتے رہو گے تو وہ شبہ ہونے کے باوجود کسی سے مخبری نہیں کریں گے۔ اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے ویسے بھی بہت حریص اور کنجوس ہوتے ہیں۔ لیک ڈسٹرکٹ سے ذرا آگے نکل جاؤ گے تو پیسے کے زور پر بہت کچھ جیت لو گے۔ آج لندن میں بھی روایت پرست انگریز کم ہی رہ گئے ہیں۔ جوں جوں شمال کی طرف بڑھتے جاؤ گے ان کی ساری روایات ہائی لینڈز کی گھاٹیوں میں سسکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔''

''مگر مائی ڈارلنگ! تم یہ بات بھول رہی ہو کہ ہم نے یہ سفر بدری ناتھ کے ایما پر کیا ہے۔ میں نے آج ہی کراچی والوں کو ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا فون نمبر دیا ہے۔ بدری اور رمیش کل یا پرسوں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بلکہ میں غلط کہہ رہا ہوں، مجھے یہاں موجود رہ کر اس کے فون کا جواب دینا ہے۔ ہم اپنے پیدا کیے ہوئے مسئلے کی وجہ سے میدان چھوڑ گئے تو سب کچھ چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔''

''ہاں...... اپنے موجودہ مسائل میں الجھ کر میں ناک میں پڑی ہوئی اس نکیل کو بھول ہی گئی تھی۔''

''نکیل کا دھیان آ گیا ہے تو اب کوئی نیا حل بھی سوچو۔ انگلستان کے مڈلینڈز، ہائی لینڈز اور لیک ڈسٹرکٹ کی سیاحت کے ارمان میرے دل میں بھی مچلتے ہیں مگر یہ ان تفریحات کا موقع نہیں ہے۔ اگر بدری ناتھ یہاں آنے کے بعد امریکا کے سفر پر نکل گیا تو سب کچھ بکھر کر رہ جائے گا۔''

''یہ ہماری اولین اور بنیادی مجبوری ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''دہرے قتل کی واردات میں ملوث ہونے کے بعد میں اس اصل مقصد کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھی تھی۔''

''میری ایک رائے ہے۔'' میں نے پرخیال لہجے میں ویرا سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم دو آرا بتاؤ۔ میں پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''بات کھل گئی تو انہیں ایسے جوڑے کی تلاش ہوگی جس میں مرد ایشیائی اور لڑکی مغربی ہے۔ مجھے بدری ناتھ کے انتظار میں یہاں رہنا ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم ماسٹر رابرٹ سے کہیں اور منتقل ہو جاؤ؟''

''میں اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جاتی ہوں مگر تم اس طرح کیا مقصد حاصل کرنا چاہ رہے ہو؟''

''مشکوک جوڑا نظر نہیں آئے گا تو ہم دونوں اپنی اپنی جگہ زیادہ محفوظ رہیں گے۔''

''یہ تمہاری بھول ہے۔'' وہ کمرے میں موجود برقی کیتلی کا پلگ آن کرتے ہوئے بولی ''اس ہوٹل کا خاصا

عملہ ہم دونوں کو یک جا دیکھ چکا ہے۔ میں قطب شمالی پر بھی چلی جاؤں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بات کھلتے ہی تم اشتباہ آمیز نگاہوں کا نشانہ بن جاؤ گے۔"

"میں تمہیں بائیبل والی مس سینڈی کی طرح ایک عارضی ساتھی قرار دے کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"ضرور کر لینا مگر تم ناکام رہو گے۔ بائیبل کے خالی ورق پر پیغام لکھنے والی کوئی مقامی لڑکی ہے جب کہ ہم دونوں یہاں غیر ملکیوں کی حیثیت سے ٹھہرے ہیں۔ ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارے سارے کوائف درج ہیں۔ تم انہیں کیسے جھٹلا سکو گے؟"

ہڈی واقعی حلق میں پھنس گئی تھی جسے اگلنا آسان تھا اور نہ نگلنا ممکن نظر آرہا تھا۔

بات گھوم پھر کر وہیں آ پھنسی تھی کہ ہمیں اپنی جان بچانی ہوتی تو ہوٹل کو خیرباد کہہ کر بہت آسانی سے انسانوں کے بے کراں سمندر میں گم ہو سکتے تھے لیکن میرے لیے اہم ترین مسئلہ لندن میں بدری ناتھ سے رابطے کا تھا۔ ہوٹل چھوڑنے کے بعد ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

ویرا ایک کرسی کے کنارے پر ٹکی پورے انہماک سے چائے کا پانی کھولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ماسٹر رابرٹ ہوٹل میں صبح کا پرتکلف اور بھرپور انگلش ناشتا کمرے کے کرائے میں شامل نہیں تھا لیکن کمرے میں چائے بنانے کی سہولت نے بڑی حد تک اس کمی کا ازالہ کر دیا تھا۔

گرم اور خوشبودار چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مجھے مدن موہن کے پاکستانی ہمدرد کا خیال آیا اور میں نے فوراً ہی اس کا کارڈ نکال کر اس سے فون پر رابطہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

ویرا کوئی سوال کیے بغیر میرا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے چائے نوشی میں مصروف رہی اور میں نے فون پر چیرنگ کراس کے رائل ہوٹل کا اکلوتا فون نمبر ملا لیا۔

دوسری گھنٹی پر ہی سلسلہ مل گیا اور ریسیور میں ایک کسل مندانہ نسوانی آواز سنائی دی "ہیلو۔ یہ رائل ہوٹل ہے۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"کل رات سلیم اکبر خان تمہارے ہوٹل میں پہنچا ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے انگریزی میں کہا کیونکہ فون اٹھانے والی اپنے لب و لہجے سے مقامی معلوم ہو رہی تھی۔

"ہولڈ کرو۔ میں اسے دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر ریسیور کسی میز وغیرہ پر رکھ دیا گیا۔

سلیم اکبر خان کے پسندیدہ ہوٹل کے معیار کا اندازہ لگانے کے لیے وہ فون کال ہی کافی تھی۔ وہاں کمروں میں فون کی لائنیں دینے کے بجائے کاؤنٹر پر موجود مشترک فون سے ہی سارا کاروبار چلایا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ فون وصول کرنے والی عورت ہی آپریٹر کی ذمے داریاں انجام دینے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی خبر گیری اور ہوٹل کے دوسرے اوپری کام بھی کرتی ہو۔

مغرب میں اگر عورت مرد کی برابری کا دعویٰ کرتی ہے تو اس میں وہ کسی حد تک حق بجانب بھی ہے۔ میں نے بارہا پرہجوم تفریحی مقامات اور سستے ہوٹلوں میں محض دو تین لڑکیوں کو اتنی محنت، تندہی اور پھرتی سے ساری میزیں لگاتے اور صاف کرتے دیکھا تھا کہ پاکستان میں لڑکوں سے بھی اتنی نمایاں کارکردگی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور پھر یہ جواں سال، خوبرو لڑکیاں سدا مسکراتی نظر آتی ہیں۔ گاہکوں کے ذومعنی اور بسا اوقات ناروا تبصروں کا ملائمت سے ہنس کر جواب دینا ان کے لازمی فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ ہاں کوئی بدذوق ان سے جسمانی چھیڑ چھاڑ کی جسارت کر بیٹھے تو اسے بدلے ہوئے تیوروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زبانی زیادتیوں کو یہ ہنس کر سہنے کی عادی ہوتی ہیں۔

آٹھ دس گھنٹے کی ڈیوٹی میں کچھ اور میزوں کے درمیان دوڑ دوڑ کر اپنی روزی کمانے والی ایسی کسی لڑکی کو محض اقامتی ہوٹل میں ملازمت مل جائے تو اسے زندگی کی رفتار تھمی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ صبح کے مخصوص اوقات میں کمروں وغیرہ کی صفائی کے سوا دن میں عیش ہی

عیش رہتا ہے۔ شاید اسی ڈھیلے ڈھالے معمول نے رائل ہوٹل کی آپریٹر کو سست بنا دیا تھا۔

ایک ڈیڑھ منٹ کے انتظار کے بعد میرے کانوں میں سلیم کی آواز آئی "ہیلو! کون بول رہا ہے؟" اس نے تحیر آمیز لہجے میں انگریزی میں سوال کیا تھا۔

"تمہارا ہم سفر اسلم بول رہا ہوں۔ تمہارا کیا حال چال ہے؟" میں نے اردو میں کہا۔

"آخاہ..... تو یہ تم ہو۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ لندن پہنچتے ہی کسے میری ضرورت پڑ گئی۔ ابھی تو میں پوری طرح تازہ دم بھی نہیں ہوا ہوں۔" مجھے پہچانتے ہی وہ چہکنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کراچی سے یہاں تک کے سفر نے تمہیں زیادہ ہی تھکا دیا۔"

"تھکا دینے والی بازار گئی ہوئی ہے۔ گھوم پھر کر لوٹے گی تو میں اسے لے کر نکل جاؤں گا۔ تمہاری تتلی کا کیا حال ہے۔ ابھی تک تمہارے ساتھ چپکی ہوئی ہے یا اڑ چکی ہے۔"

"ایئر پورٹ سے نکل کر ہمارے راستے جدا ہو گئے تھے۔ بس اس کی وجہ سے سفر ذرا مزے سے گزر گیا۔ تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟ وہ تمہاری بیوی تو نہیں ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ...... ولایت بھلا بیوی کے ساتھ آنے والی جگہ ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آدمی شادی کی دعوت میں اپنے گھر سے مونگ کی دال ساتھ لے جائے۔ یہ لندن ہے۔ یہاں نئی ڈشوں کی بات کرو۔"

"چلو یہی سہی۔ اس وقت کس ڈش میں تیر رہے ہو؟" میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ہر بار ایک ہی جگہ ٹھہرنے میں بڑے فائدے ہیں۔ چھوٹے ہوٹلوں میں گاہک کو خاص الخاص توجہ ملتی ہے۔ کل یہاں کوئی کمرا خالی نہیں تھا۔ ہوٹل کی مالکہ نے ڈبل روم میں ٹھہری ہوئی ایک پولش لڑکی سے بات کی اور اس نے جڑی ہوئی مسہری الگ کر کے مجھے اپنے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی۔"

"اس سے پولش لڑکی کو کیا فائدہ ہوا؟" میں نے حیرت سے پوچھا "اس کے لیے تو تم اجنبی ہی تھے۔"

"اس کا کرایہ آدھا ہو گیا۔ میں نے اپنے حصے کی رقم اسے ادا کرنے کے بعد ہوٹل والی کو سنگل اور ڈبل روم کے فرق کی معمولی سی رقم دی اور بس کام بن گیا۔"

"تم مبالغہ آرائی کر رہے ہو۔" میں نے بے اعتباری سے کہا۔ "ایک سفید فام لڑکی کسی ایشیائی اجنبی پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتی۔"

"اعتبار؟ کس بات کا اعتبار؟" میری بات پوری ہوتے ہی اس کی آواز ابھری "ہم کمروں سے عیاشی کے لیے سیاحت پر نکلتے ہیں۔ ان اکیلی لڑکیوں کی سیاحت اور آوارہ گردی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ کم سے کم پیسوں میں دنیا کی ہر لذت نچوڑ ڈالیں۔ آدمی معاملہ فہم ہو اور ستارے یاوری کر رہے ہوں تو بات بن ہی جاتی ہے..... اور یہاں تو ویسے بھی عزت اور آبرو کے معنی ہی بدلے ہوئے ہیں۔ تفریح اور تجربہ حاصل کرنے کے نام پر آوارگی کا چلن برسوں سے عام ہے۔"

"تو کیا تمہارے ساتھ اکثر ایسے تجربات پیش آتے رہے ہیں؟" میں نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" اس بار اس نے کسی مبالغے کے بغیر کہا "یہ میرا پہلا تجربہ ہے لیکن دوسروں سے میں ایسی کہانیاں سنتا رہا ہوں۔ مادر پدر آزاد لڑکے اور لڑکیاں گھروں سے نکلتے ہیں تو چند پاؤنڈ کمانے یا بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ غور کرو تو سیر و سیاحت کے اصل رنگ ان ہی کے دم قدم سے نمایاں ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے کمرے میں میرے مل بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"وقت بتا دو اور آ جاؤ۔ ہوٹل کا کامن روم بہت بڑا اور آرام دہ ہے۔ مہمان داری کے لیے اس سے بہتر جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ لڑکیوں کا کیا ہے۔ وہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔ اچھا دوست مشکل سے ہی ملتا ہے۔ تم نے میری

خاطر روزی کو لعنت ملامت کر کے میرا دل جیت لیا ہے۔ اس وقت جہاز کے سارے مسافروں میں صرف تم ہی میرے ہمدرد اور غم گسار تھے۔''

''روزی جا چکی ہے۔ میں مہنگے ہوٹلوں میں بے مقصد زر مبادلہ ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ سیزن کی وجہ سے چھوٹے ہوٹلوں میں جگہ نہیں رہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہارے پاس ہی منتقل ہو جاؤں۔''

''اس وقت تم کہاں ہو؟'' میری الجھن سنتے ہی اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''زبردستی ایک دور کے رشتے دار کے گھر پہنچ گیا تھا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا کاؤنٹی ہاؤس ہے۔ یہاں زیادہ دیر تک گزارا نہیں ہو سکے گا۔ ان کے بچوں نے خراب تیوروں کے ساتھ میرے لیے اپنا کمرا خالی کیا تھا۔ میں آج رات ہی کہیں اور منتقل ہو جانا چاہتا ہوں۔''

''ایسی مجبوری ہے تو آنکھ بند کر کے آ جاؤ۔ کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔''

''پولش لڑکی کے ساتھ تمہاری شام کی تفریح کا کیا بنے گا؟'' میں نے پوچھا۔

ریسیور پر اس کی ہنسی کی آواز گونجی پھر دھیمی آواز ابھری۔ ''تفریح تو رات ہی ہو گئی تھی۔ الکحل میں سب سے بڑی خرابی یا اچھائی یہی ہے کہ یہ معدے میں بیٹھتی ہے تو ذہن کے نامعلوم گوشوں میں دبی ہوئی باتیں ابھر کر زبان پر آنے لگتی ہیں۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ میرے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رات کو تو میں فضاؤں سے بھی اونچا اڑ رہا تھا۔ اب یہ ساری باتیں میں فون پر نہیں دہرا سکتا۔''

''ٹھیک ہے، پھر میں سات بجے تمہارے ہوٹل پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چاہو تو چیرنگ کراس یا لیسٹر اسکوائر کے ٹیوب اسٹیشن پر تمہیں لینے آ سکتا ہوں۔'' سلیم اکبر خان نے پورے خلوص سے پیشکش کی جسے میں نے شکریے کے ساتھ رد کر دیا۔ رائل ہوٹل کا کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ وہ علاقہ کسی حد تک میرا دیکھا بھالا تھا اور پھر میں لندن میں تھا جہاں ہر شخص روانی سے انگریزی بولنے اور سمجھنے پر قادر تھا۔

گفتگو کے دوران میں ویرا حیرت اور تعجب کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں محض وقت گزاری کے لیے سلیم سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر وہاں معاملہ ہی دوسرا نکلا۔ فون بند ہوتے ہی ویرا نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا ''اب یہ کیا چکر چلا رہے ہو تم؟''

''سلیم اکبر خان لندن میں میری بے گناہی کا سب سے بڑا گواہ ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے اسے سمجھایا ''وہ حلفیہ بیان دے سکتا ہے کہ میں کراچی سے اکیلا یہاں آیا ہوں۔ جہاز پر ایک لڑکی سے میری دوستی ضرور ہوئی مگر سفر ختم ہوتے ہی وہ اپنی راہ ہو لی۔''

''اس لیے تم نے اس اہم گواہ کو پوری طرح اپنے قابو میں کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ تلخی سے بولی ''شاید اس طرح تمہاری بچت کی راہ نکل آئے لیکن میرا کیا ہوگا؟''

''اسی میں تمہاری نجات کی راہ بھی پوشیدہ ہے۔'' میں نے وضاحت کی ''پھنسے تو ہم ایک ساتھ پھنسیں گے۔ الگ الگ رہ کر ہم دونوں محفوظ رہیں گے۔ یہ بہت دور کی احتیاطی تدابیر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی کوئی صورت حال پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ اس کا انحصار ٹیکسی ڈرائیوروں کے ردعمل پر ہوگا۔ ان کے سوا ہمیں کسی بھی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''اور وہ پولش لڑکی کا کیا قصہ تھا؟'' ویرا نے اشتباہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

''سلیم نے اسے دوست بنایا ہے۔'' تفصیل میں جانے کے بجائے میں نے بات بتا دی۔

''تو کیا تم نے اسی کے ساتھ ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا ہے؟'' ویرا اس وقت تک مطمئن نہیں تھی۔

''ضروری نہیں۔ اس کے ہوٹل میں کمرا مل جائے تو زیادہ اچھا رہے گا۔ حیرت ہے کہ اس نے کراچی میں اپنے

دفتر پر ہونے والی کارروائی کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں اسے مزید ٹٹولنا چاہتا ہوں۔"

"درآمدی مال میں چوری کا الزام ایسا نہیں ہے کہ آدمی اس کی تشہیر کرتا پھرے۔ وہ بےفکری سے یہاں خوش فعلیوں میں مصروف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے اپنے دفتر کی خبر ہی نہ ملی ہو۔"

اول خان نے سلیم اور اس کی فرم کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کی تھیں وہ تشویشناک تھیں۔ وہ ملک کے ایٹمی اور تھرمل بجلی گھروں کو اہم فاضل پرزے فراہم کرنے والے غیر ملکی اداروں کا نمائندہ تھا اور مدن موہن کے مقربین میں شامل تھا۔ مدن موہن کے اعتراف جرم کی روشنی میں یہ بات ہر شبہے سے بالا تھی کہ سلیم اکبر خان اسے بجلی گھروں کے بارے میں اہم دستاویزات فراہم کرتا رہا تھا۔ میں گیتا سے چھیڑ چھاڑ کر کے بعد کے واقعات سے پریشان تھا اس وجہ سے میں نے سلیم سے لندن میں کوئی ٹکر مول لینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ میری پوری کوشش ہوتی کہ وہ پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات کی پروا کیے بغیر وہاں واپس پہنچے اور پھر اول خان کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ جائے۔

میں پاکستان سے ڈیوڈ اسٹارز کو تباہ کرنے کا جو مشن لے کر نکلا تھا وہ اتنا عظیم تھا کہ اس کی خاطر مجھے چھوٹے موٹے دیگر معاملات سے دامن بچا کر رکھنا تھا۔ اگر میں امریکا پہنچنے سے پہلے ان الجھنوں میں پھنس جاتا تو پاکستان سے روانگی کا اصل مقصد پس پشت چلا جاتا۔

ویرا اس بارے میں کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ ابتدا میں اس کے ذہن میں اس شبہے نے سر ابھارا تھا کہ اس بار غزالہ نے اپنی ذات کے سحر سے کام لے کر ویرا کے خلاف میری ایسی برین واشنگ کی تھی کہ میں تنہائی میں اس کے ساتھ شب و روز گزارنے کے تصور ہی سے بدک رہا تھا اور شاید اسی خوف سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے سلیم اکبر خان کی پناہ میں جانا چاہ رہا تھا۔

غزالہ کو میں ایک مدت سے چاہتا چلا آ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میں اس دور میں پارسائی کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ خود ویرا ہی میری گہری دوست تھی جس سے خلوت میں بہتیرے راز و نیاز ہو جاتے تھے۔

اپنی زندگی کو ایک خاص گھریلو ڈھب پر لانے کے بعد میں غزالہ کے ساتھ گھر بسانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مکاؤ کے ڈون کوانگ فو کے محل میں چین سے لائے گئے ایک منحنی اور خوف زدہ مسلمان مولوی نے مجھے اور غزالہ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

مکاؤ کے قلعے نما محل سے میری اور غزالہ کی زندہ واپسی کے لیے وہ ڈون کوانگ فو کی ایک اٹل شرط تھی اور یوں ہم دونوں جبری طور پر ایک کر دیے گئے۔ اپنی زندگی کے اس اہم ترین موڑ کے بعد ہمیشہ میری شعوری کوشش ہوتی تھی کہ غزالہ کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر بھی میں اس رشکِ زمیں دوشیزہ سے بےوفائی کا ارتکاب نہ کروں اور میں بڑی حد تک اپنے اس ارادے پر قائم رہنے میں کامیاب رہا تھا۔

مگر ویرا سرکش طبیعت کی مالک تھی۔ اس حوالے سے وہ ہمیشہ مجھے چڑانے، سلگانے اور اکسانے کی کوششوں میں لگی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ کھلے سمندر میں بلیک سی نامی اسپیڈ بوٹ پر رات کے اندھیرے میں رونما ہونے والا واقعہ زیادہ پرانا نہیں تھا اور شاید ویرا لندن کی سرزمین پر اسی کے اعادے کا منصوبہ بنائے بیٹھی تھی۔ ماسٹر رابرٹ ہوٹل سے میری اچانک روانگی کے پروگرام نے اس کی ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ابتدا میں مشکوک تھی۔

میں اس طویل سفر پر اسے ساتھ لا کر ایک خطا کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اس کے ازالے کے لیے مجھے اس شام دوسری خطا کا بوجھ بھی اٹھانا پڑا۔ میں نے اسے والہانہ اپنائیت سے اپنے خلوص کا یقین دلایا اور غنیمت ہوا کہ بات زیادہ بڑھنے سے پہلے ہی وہ مطمئن نظر آنے لگی۔

اس خود پرست اور ضدی عورت کے لیے صرف یہ احساس ہی کافی تھا کہ میں نے اسے اپنے لیے شجر ممنوعہ تصور نہیں کیا ہوا تھا۔ میں ہر وقت اس کی دسترس میں تھا۔

ماسٹر رابرٹ ہوٹل میں دو مسافروں کے لیے اس کمرے کا کرایہ اسی پاؤنڈ اور اکیلے شخص کے لیے ستر پاؤنڈ تھا۔ وہ رقم قابل ذکر نہیں تھی لیکن ہوٹل کے ریکارڈ اور متوقع شہادتوں کو حسب منشا رکھنے کے لیے میں نے کاؤنٹر پر اس وقت تک کا حساب بے باق کر کے اپنے چیک آؤٹ کا اندراج کرایا، وہاں ویرا سے دانستہ چند ایسے بازاری فقرے کہے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ محض اتفاق کے سہارے میسر آنے والی اس کی رفاقت میرے لیے یادگار ثابت ہوئی تھی۔

ویرا سے اگلے کسی ہوائی سفر میں کہیں دوسری ملاقات کی امید ظاہر کرتے ہوئے میں ماسٹر رابرٹ ہوٹل کے وسیع برآمدے سے گزرتا ہوا صحن میں نکل آیا جہاں دو خالی ٹیکسیاں نظر آ رہی تھیں۔ ویرا کو وہیں رہنا تھا۔ میرے مڑتے ہی وہ بھی کہیں غائب ہو گئیں۔

پورٹر میرا ہلکا سا سوٹ کیس ٹیکسی میں رکھ چکا تھا۔ ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے میں نے اپنی ابتدائی منزل کے بارے میں سوچا تو پہلی بار اس ہوٹل کی ایک خامی کا احساس ہوا۔

اے فوریا گریٹ ویسٹ روڈ نامی شاہراہ پر واقع اس ہوٹل کے قرب و جوار میں کوئی ٹیوب اسٹیشن نہیں تھا۔ ہیتھرو ائرپورٹ جاتے والی پکاڈلی لائن کا مشرقی ہیرو والا اسٹیشن سڑک کے پار خاصا دور تھا جب کہ اس سمت میں اندر سے گزر کر ساؤتھ آل سے بھی آگے نارتھولٹ کے ٹیوب اسٹیشن تک لمبی دوڑ لگانی پڑتی جہاں سے چیئرنگ کراس پہنچنے کی کوئی راہ نکالی جا سکتی تھی۔

اس وقت ایک مرتبہ پھر میرے لیے وقت، فاصلے یا رقم کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ساری اہمیت سراغ کی تھی۔ ماسٹر رابرٹ ہوٹل والوں یا ٹیکسی ڈرائیور کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر کہاں گیا تھا۔ اس کی واحد صورت یہی تھی کہ میں ہوٹل سے ملنے والی ٹیکسی کو کسی اور ہی سمت میں لے جاتا۔

ہوٹل کا گیٹ چھوڑنے سے پہلے ڈرائیور.... نے اپنے لگے بندھے معمول کے مطابق میری منزل کا پتا پوچھا تو میں نے پورے اعتماد سے اسے نارتھولٹ ٹیوب اسٹیشن کا نام بتا دیا۔

گاڑی اے فور پر آ کر ہوٹل کی عمارت کے گرد گھومی اور بغلی سڑک پر تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ ڈرائیور نے مجھے منزل تک پہنچانے کے لیے صاف اور سیدھا راستہ اختیار کیا تھا۔ کھلی اور کشادہ سڑکوں پر ٹریفک کی بدنظمی کے خوف کے بغیر سفر کرتے ہوئے میں نے گرد و پیش پر نگاہ رکھی اور جوں ہی منظر تبدیل ہونا شروع ہوا، میرے وجود میں ایک بےچینی سی انگڑائیاں لینے لگی۔

بھارتی اور ایشیائی چہروں کی بہتات کے ساتھ مجھے ساؤتھ آل کے بعض شناسا حصے بھی نظر آنے لگے تھے۔ اسی بستی کے کسی مکان میں گیتا اور اس کے مددگار کی بے گور و کفن لاشیں اپنے کریا کرم کے انتظار میں پڑی سوکھ رہی تھیں۔

میں نے سیٹ پر پہلو بدل کر نظریں باہر جما دیں۔ ہر طرف زندگی اپنے معمول کی طرف رواں دواں تھی۔ کہیں بھی کسی افراتفری یا خوف و ہراس کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ اس وقت تک علاقے میں دہرے قتل کی واردات کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔

ٹیکسی ٹریفک سگنل پر ساؤتھ آل کی براڈوے کو عبور کرتی ہوئی لیڈی مارگریٹ روڈ پر چڑھ گئی۔ وہ ایشیائیوں کی گنجان آبادی کا علاقہ تھا جہاں سفید چمڑی خال خال ہی نظر آ رہی تھی۔

میں چند گھنٹوں کے وقفے سے ایک مرتبہ پھر اس علاقے سے گزر رہا تھا جہاں میں ایک دوغلے سفید فام کو قتل کر چکا تھا۔ اس احساس سے میرے بدن میں سنسنی کی لہریں سرایت کر گئی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر یوں محسوس ہو رہا تھا

جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں بے شمار چیونٹیوں نے رینگنا شروع کردیا ہو۔

آخر... مارگریٹ روڈ کا سفر ایک چوراہے پر ختم ہوگیا۔ وہاں سے ٹیکسی بائیں طرف گھوم گئی۔ ایشیائیوں کی بہتات ختم ہونے لگی۔ ایک مرتبہ پھر آبادی پر خالص سفید فاموں کا غلبہ نظر آنے لگا۔ ان میں بعض سیاہ فام بھی تھے مگر وہ بھی مقامی ہی نظر آتے تھے۔

''سر! میرا خیال ہے کہ نارتھولٹ کے ٹیوب اسٹیشن سے تمہیں کہیں اور جانا ہے۔'' سفر کا بڑا حصہ خاموشی سے طے کرنے کے بعد ڈرائیور آخر کار بول ہی پڑا۔

اس کی قیاس آرائی نے مجھے بری طرح چونکا دیا ''تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''وہ صرف ٹیوب اسٹیشن ہے۔ اس کے ایک طرف جنک یارڈ ہے۔ آبادی اس سے پہلے ختم ہوجاتی ہے یا اس سے کافی آگے شروع ہوتی ہے۔ اگر تم صحیح پتا بتا سکو تو میں تمہیں تمہارے مطلوبہ گھر کے دروازے پر اتار سکتا ہوں۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

اس کی وضاحت نے مجھے مطمئن کردیا اور میں نے کہا ''تمہارا اندازہ ٹھیک تھا۔ مجھے نارتھولٹ سے آگے جانا ہے۔ وہاں میرا ایک رشتے دار مجھے لینے آئے گا۔''

''ایسا ہی تھا تو تم نے ٹیکسی میں یہاں تک آکر اپنے کافی پاؤنڈ ضائع کیے ہیں۔ تم ہوٹل سے ہانسلو کے اسٹیشن پر چلے جاتے تو کسی بھی جنکشن سے ٹیوب میں اپنی منزل تک پہنچ جاتے اور پیسے بھی کم خرچ ہوتے۔ ہانسلو تمہارے ہوٹل سے بہت قریب ہے۔''

''یہ بات تم ہوٹل میں ہی بتا دیتے تو میری بچت ہوسکتی تھی۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے خیال سے کہہ ڈالا ورنہ میں نے وہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

''اچھا مشورہ کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ یہ آئندہ تمہارے کام آئے گا۔ اس شہر میں ٹیوب سفر کا سب سے سستا، آرام دہ اور تیز رفتار ذریعہ ہے۔ وقت بچانے کے لیے تنگ چڑھے امرا بھی بعض اوقات ٹیوب کا سہارا لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ زیادہ سفر کرنا ہو تو ٹکٹ گھر سے ٹریول کارڈ لے لینا۔ وہ اور بھی سستا پڑتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو کبھی کبھار لندن آنے والے دوسرے برطانوی بھی نہیں جانتے۔''

میں اخلاقاً ہنس کر بولا ''میری معلومات میں اتنا اضافہ نہ کرو کہ میں تمہیں نیچے اتار کر تمہاری سیٹ پر قبضہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگوں۔''

''یہ لندن میں سب سے مشکل کام ہے۔ ٹیکسی چلانے کا لائسنس لینے کے لیے تمہیں شہر کے سارے پتے ازبر کرنے ہوں گے۔'' اس نے ہلکے سے جوابی قہقہے کے ساتھ کہا ''بیشتر لوگ اس امتحان میں ناکام ثابت ہوتے ہیں اور پھر ہونقوں کی طرح شہر کی کوچہ نوردی کرتے نظر آتے ہیں۔''

اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھے نارتھولٹ کے ٹیوب اسٹیشن کے سامنے پہنچا دیا۔

ایک پاؤنڈ ٹپ کے ساتھ کرایہ وصول کرکے وہ بھی خوش نظر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مہنگائی بڑھ جانے کے باوجود لندن میں ایک پاؤنڈ کی خاصی وقعت تھی۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ ڈرائیور کو کرائے سے بچی ہوئی ریزگاری پر ٹرخاتے ہوں۔ اس بارے میں انگریزی محاورہ کم از کم یہی کہتا تھا۔

نارتھولٹ عظیم تر لندن کا ایک غیر معروف مضافاتی ٹیوب اسٹیشن ہے جہاں ٹیوب سرنگوں کے بجائے سطح زمین پر دوڑتی ہے۔ اس بار لندن میں ٹیوب سے وہ میرا پہلا سفر تھا۔

اسٹیشن کی عمارت مختصر اور انتہائی غیر متاثر کن تھی۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے شفاف شیشے کے پیچھے ایک باوردی، سیاہ فام اور موٹی سی معتک خاتون براجمان تھی۔

''ڈے ٹریول کارڈ اور جرنی پلانر!'' میں نے شیشے کی نچلی جھری میں سے پانچ پاؤنڈ کا نوٹ اسٹیل کی ٹرے میں ڈال کر فرمائش کی۔

اس نے بے پروائی سے مجھے ایک دن کا ٹریول کارڈ،

ٹیوب کے راستوں کا جیبی نقشہ اور ایک ایک پاؤنڈ کے تین کھنکتے ہوئے سکے اسی ٹرے کے راستے سونپ دیے۔

آگے سخت زینے دوطرفہ پلیٹ فارم تک اترے ہوئے تھے۔ اوپر سے صاف نظر آرہا تھا کہ طویل پلیٹ فارم اس وقت تقریباً ویران پڑا ہوا تھا۔ اس پر اِکا دُکا مسافر آگے سے آنے والی ٹیوب کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔

پلیٹ فارم کی دونوں سمتوں میں نصب نمایاں تختیوں پر ان مقامات کے نام درج تھے جہاں کے لیے ان سمتوں سے ٹیوب پکڑی جاسکتی تھی۔

بائیں طرف والی فہرست میں صرف تین مقامات کے نام درج تھے۔ داہنے پلیٹ فارم والی فہرست بہت طویل تھی لیکن اس میں چیرنگ کراس کے ٹیوب اسٹیشن کا نام نہیں تھا۔

میں نے لندن کے اس زیر زمین اور بالائے زمین سفری نظام کے بارے میں راستے میں ہی اپنی یادداشت تازہ کرلی تھی۔ بورڈ پڑھنے سے بات واضح ہوگئی۔ نارتھولٹ کے مضافاتی اسٹیشن سے صرف سنٹرل لائن گزرتی تھی۔ اس کے ذریعے مجھے شہر کے مرکزی حصے میں کسی ایسے جنکشن تک پہنچنا تھا جہاں سے چیرنگ کراس کے لیے دوسری لائن کی ٹیوب مل سکے۔

اس مرحلے کو سر کرنے کے لیے مفت میں ملنے والے ٹیوب کے جیبی نقشے کا جائزہ لینا ضروری تھا۔

فہرست سے اندازہ ہوچکا تھا کہ میرا وہ سفر خاصا طویل ہوگا۔ پلیٹ فارم پر موجود مسافروں کی تعداد سے یہ بھی ظاہر تھا کہ شہر کے وسط تک جانے والی ٹیوب میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوگی اس لیے میں نے نقشہ بینی کا کام کچھ دیر کے لیے ملتوی کردیا۔

لندن کے مستقل باسی ویسے بھی پبلک ٹرانسپورٹ کے دوران میں کچھ نہ کچھ پڑھنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہر مسافر کے ہاتھ میں کچھ اور ہو یا نہ ہو، کوئی کتاب، رسالہ یا اخبار ضرور موجود ہوتا ہے...... ان کی دیکھا دیکھی بہت سے غیر ملکی سیاح اپنے گھٹنوں پر مختلف زبانوں میں چھاپے گئے وہ متعدد سیاحی نقشے پھیلائے نظر آتے ہیں جو لندن میں فروغ سیاحت کا ادارہ بہت فراخ دلی سے سیاحوں میں مفت تقسیم کرتا ہے اور یہ ایک سرخ تختی پر انگریزی کا چھوٹا آئی دکھانے والے ہر سائن بورڈ کے قریب بہت آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔

اس شہر میں بہت سے لوگوں کو اپنی ملازمت یا کاروبار کے لیے اتنا طویل سفر طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ سفر کے دوران میں ہی پورا اخبار چاٹ لیتے ہیں اور پھر یہ ردی گھر لے جانے کے بجائے اپنی خالی کی ہوئی نشست پر چھوڑ جاتے ہیں جسے کوئی نہ کوئی وہاں سے اٹھا لیتا ہے۔

تقریباً دو منٹ بعد ہی شفاف پٹریوں پر سنسناتی ہوئی ٹرین تیز رفتاری سے پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہوئی اور ایک گہرا سانس لیتی ہوئی ٹھہر گئی۔ ٹیوب کہلانے والی اس برق رفتار ٹرین کے خودکار دروازے سرکے اور میری قریبی بوگی یا ڈبے کا فرش پلیٹ فارم کی سطح سے تقریباً ملا ہوا نظر آنے لگا۔

پلیٹ فارم پر نصب ریڈیو پیجنگ سسٹم پر شاید ٹیوب کی آمد اور سفر کی سمت کا اعلان [illegible] تھا۔ میرے سامنے والے دروازے میں اترنے والا کوئی نہیں تھا۔ پورے ڈبے میں دو چار ہی مسافر نظر آرہے تھے۔ میں لپک کر ڈبے میں سوار ہوگیا۔

دروازے کے ساتھ معمر اور معذور افراد کے لیے مخصوص نشست کو چھوڑ کر میں دیواروں کے متوازی لگی ہوئی آرام دہ نشست پر بیٹھ گیا۔ اس ڈبے میں بیٹھنے والوں کے لیے جگہ کم اور کھڑے ہونے والوں کے لیے زیادہ گنجائش تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی دروازے ایک ہم آہنگ سسکاری کے ساتھ بند ہوئے اور ٹیوب ایک خوش گوار جھٹکے کے ساتھ رفتار پکڑنے لگی۔

میں نے سوٹ کیس قدموں میں جما کر نقشہ سنبھال لیا۔ بظاہر مشکل اور پیچیدہ نظر آنے والا وہ نقشہ اپنی اصل

میں بہت آسان تھا۔ اس کے مطابق اگر میں آکسفورڈ سرکس کے ٹیوب اسٹیشن پر اتر کر متعلقہ پلیٹ فارم سے بیکر لوائن کی ٹیوب پکڑتا تو اگلا اسٹیشن چیرنگ کراس ہی ہوتا۔

سفر کے ساتھ ساتھ ٹیوب میں مسافروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی پھر درمیانی جگہ میں بھی لوگ جمع ہونے لگے۔ کافی دیر تک ٹیوب سطح زمین پر دوڑتی رہی پھر ایک دو مقامات پر مختصر سرنگوں سے گزرنے کے بعد آخر کار زیر زمین راستوں پر دوڑنے لگے۔

کسی بھی قسم کی آلودگی نہ پیدا کرنے والے انجنوں سے محفوظ اور براہ راست برقی طاقت سے چلنے والی اس ٹیوب میں گھٹن کا احساس تک نہیں تھا۔ محرابی صورت میں بنی ہوئی ان مسلسل سرنگوں میں داخل ہونے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی روشنی میں کمی کا احساس نہیں ہوا کیونکہ اندر روشنی کا معقول انتظام تھا اور سنگل ٹریک سرنگوں میں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر روشنی نظر آرہی تھی۔

میں اپنے سفر کی جزئیات سے محظوظ ہونے کے ساتھ ہی سلیم اکبر خان کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت تک اسے میری کسی بات پر شبہ نہیں ہوسکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں اس کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرتا جارہا تھا۔

گزرتے ہوئے اسٹیشنوں کے ساتھ میری نگاہیں غیر ارادی طور پر بار بار ٹیوب کے روٹ کے اس نمایاں نقشے کی طرف اٹھ رہی تھیں جو سامنے والی دیوار اور چھت کی نیم گولائی میں جگہ جگہ بنا ہوا تھا۔ گو میرے پاس کافی وقت تھا لیکن میں اپنا مطلوبہ اسٹیشن بھول لینے یا چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

وائٹ سٹی اور شیفرڈ زبش کے اسٹیشنوں سے ہمارے ڈبے کے دروازوں پر مسافروں کی بھاری یلغار ہوئی۔ اگلا ریلا ناٹنگ ہل گیٹ سے آیا۔ اسٹیشن گزرتے رہے اور جب ٹرین یا ٹیوب بونڈ اسٹریٹ پر رکی تو میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی کیونکہ مجھے اگلے اسٹیشن پر اترنا تھا۔

میں خالی ہاتھ ہوتا تو مجھے دروازے پر پہنچنے میں چند سیکنڈ بھی نہ لگتے لیکن میرا مسئلہ میرا ہلکا سا سوٹ کیس تھا جو رکاوٹ بن سکتا تھا۔

ایک دوسرے سے چپکے ہوئے مسافروں کی بھیڑ میں مرد یا عورت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ نسوانی چہروں میں ایسے ایسے حسین پیکر بھی نظر آرہے تھے جن پر کسی بھی جمال پرست کا دل مچل سکتا تھا۔ اسی طرح مردوں میں سب شرفا اور معززین نہیں تھے۔ ان میں ہر عمر اور ہر ذوق کے مسافر شامل تھے لیکن اس بھیڑ میں ایک نظم تھا۔ کہیں کوئی ہڑبونگ تھی، نہ کوئی شکایت۔

اس وقت مجھے ٹیوب کے ڈبے کی ملی جلی بھیڑ کا وہ نظم وضبط بہت پسند آیا۔ اپنی شہری آزادیوں کی حدود میں رہتے ہوئے وہ لوگ دوسروں کی شخصی آزادیوں کا پورا پورا احترام کرنے کے عادی تھے۔ یہی نہیں، ان کے اس اجتماعی رویے میں ایسی اثر انگیزی تھی کہ ان کے درمیان آئے ہوئے نگر نگر کے سیاح بھی ان کی تقلید کرنے پر مجبور تھے۔

وہ میرا اس وقت کا تجزیہ اور تاثر تھا۔ بعد میں میں نے اس شہر کی ان ہی ٹیوبوں اور ٹیوب اسٹیشنوں پر ایسے واقعات بھی دیکھے جو گھٹیا اور قابل نفرت کہے جاسکتے ہیں اور اسی کے بعد میری رائے بدل گئی۔ پانچوں انگلیاں کہیں بھی یکساں نہیں ہوتیں پھر لندن کے سارے گورے اور گوریاں کس طرح شریف، امن پرور اور انسان دوست ہوسکتی تھیں۔

میں محتاط رہ کر حسین اور نازک اندام عورتوں سے بچتا اور کہیں اس آتشیں لمس کی تپش سے گزرتا ہوا دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ بونڈ اسٹریٹ سے ٹیوب نے ایک ہی سانس میں مختصر سی دوڑ لگائی اور پھر آکسفورڈ سرکس کے پلیٹ فارم پر لگ گئی۔

یہاں اترنے والوں کا ایک انبوہ تھا۔ میں بھی اس عجلت پسند بھیڑ میں شامل ہو کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ اس زیر زمین پلیٹ فارم میں سرد اور تیز ہوائیں آرہی تھیں۔ ہر طرف تیز تیز چلتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں کہیں رک کر

کسی چیز کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ ہر مسافر نکاس کے اپنے مطلوبہ راستے کی طرف یوں تیزی سے چل رہا تھا جیسے اسے باوثوق ذرائع سے اس سرنگ کے کسی بھی لمحے بیٹھ جانے کی خبر مل چکی ہو۔ ایک طویل مدت کے بعد مرکزی لندن کے ایک زیر زمین ٹیوب اسٹیشن میں وہ تماشا دیکھنا میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔

نئے مسافروں کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر ٹیوب تیزی سے آگے بڑھ کر سرنگ کی گولائیوں میں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ میں ٹرین کے نظارے سے فارغ ہوا تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ زمین کے نیچے اندر ہی اندر بنے ہوئے پر پیچ راستے اس منزل کے سارے مسافروں کو نگل چکے تھے۔ تقریباً خالی پلیٹ فارم کی ویرانی دیکھ کر شبہ سا ہو رہا تھا کہ چند ثانیوں پہلے میں نے جو کچھ دیکھا، وہ خواب تھا۔

مجھے چھت سے لٹکے ہوئے روشن نشانات میں بیکر لوائن کا نام نظر آگیا۔ نام کے نیچے بنا ہوا تیر سنگی دیوار میں بنے ہوئے ایک تنگ راستے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں اسی طرف چل دیا۔

اس دوران میں دیوار میں بنے ہوئے سوراخوں یا تنگ محرابی دروازوں نے نئے مسافر اگلنے شروع کر دیے تھے جنہیں اگلی ٹیوب کے پیٹ میں سما جانا تھا۔

وہ دروازہ بہت موٹی دیوار اور درمیانی تعمیرات میں آر پار ملا ہوا تھا۔ ساری سرنگیں سنگل ٹریک تھیں اس لیے دوسرے متوازی پلیٹ فارم پر مخالف سمت میں جانے والی سنٹرل لائن کی ٹرین رکتی تھی۔ اس کا اندازہ دونوں طرف لکھے ہوئے اسٹیشنوں کے نام سے ہوتا تھا۔

بیکر لوائن کا اگلا روشن اشارہ نیچے جانے والے زینوں کی طرف رہنمائی کر رہا تھا۔ پہلی لینڈنگ سے گھوم کر زمین کی مزید گہرائی میں اترتے ہوئے مجھے سیڑھیوں کے اختتام پر واقع دیوار پر دونوں سمتوں میں جانے والی بیکر لوائن کی ٹرینوں کے اسٹیشن ترتیب وار لکھے ہوئے نظر آئے اور میں اس سمت میں ہولیا جدھر چیرنگ کراس کا نام سب سے اوپر نمایاں تھا۔

میں اس وقت زمین سے کئی سو فٹ نیچے تھا۔ اسٹیشن کی پہلی منزل سے سطح زمین تک آمدورفت کے لیے استعمال ہونے والے دیوہیکل مشینی زینے مجھ سے بہت اوپر تھے۔ میں پرسکون انداز میں مطلوبہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو چھت سے لٹکی ہوئی گھڑی سوا چھ بجا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے پاس سلیم اکبر خان کے پاس پہنچنے کے لیے کافی وقت تھا۔

پلیٹ فارم سے نیچے چمکتی ہوئی برقی پٹریوں کے اس پار سرنگ کی دوسری دیوار پر مختلف مصنوعات، تھیٹر، فلموں اور کتابوں کے جہازی اشتہار آویزاں تھے۔ سرنگوں کی تنگ اور مخصوص ساخت کی وجہ سے وہ اشتہار دیواروں سے یوں چپکے ہوئے تھے کہ ان ہی کا ایک حصہ معلوم ہو رہے تھے۔

بیکر لو لائن کی ٹیوب میں مجھے جس ڈبے میں گھسنے کا موقع ملا، اس میں صحت مند سیاہ فام لڑکے لڑکیوں کی کثرت تھی۔ وہ سفید فاموں کے برعکس اونچی آوازوں میں ہنس بول رہے تھے اور آپس میں فحش مذاق بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کے رویے سے شوریدہ سری نمایاں تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بے رحمی سے دوسروں کو نظر انداز کر رہے ہیں یا پھر بلند آہنگ لب ولہجہ اختیار کر کے سب کو اپنی موجودگی کا پختہ احساس دلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

رنگ، سماجی مرتبے یا معاشی ناآسودگی میں سے کوئی بھی بات ان لڑکے لڑکیوں کے احساس محرومی کا سبب ہو سکتی تھی۔ وہ واضح طور پر اپنے سفید فام ہم وطنوں سے یکسر مختلف تھے۔

ٹیوب نے قلیل سی مدت میں مجھے چیرنگ کراس اسٹیشن پر اتار دیا۔ وہاں بھی مسافروں کی بڑی تعداد اتری۔ سیاہ فاموں کا غول بھی دھکا پیل کرتا اور آپس میں ہاتھا پائی کرتا ہوا وہیں اتر گیا۔ ان میں سے کئی کے ہاتھوں میں بیئر کے المونیم کین تھے جن سے باری باری سب ہی استفادہ کر رہے تھے۔

ان کے تیور خاصے جارحانہ بلکہ للکارنے والے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ ان کی منہ زوریوں اور بدتمیزیوں پر کوئی انہیں ٹوکے اور وہ سب مل کر نہ صرف اس کا بھرکس نکال دیں بلکہ اس کا مال ومتاع چھین کر اپنی شام خوشگوار تر بنانے کا اہتمام کر سکیں۔

لندن کے ان منہ توڑ اور لڑاکا کالوں کے بارے میں میری سنی سنائی معلومات خاصی تلخ تھی۔ میں ان سے بچ کر راستہ طے کرتا رہا۔ اچانک ایک لڑکے نے اپنی ایک ساتھی کے کولھوں پر پرشور آواز کے ساتھ ایک تھپڑ رسید کیا، لڑکی نے پلٹ کر اپنے کین میں بچی ہوئی یخ بیئر اس کے منہ پر دے ماری اور پھر اس دوطرفہ مذاق پر وہ سب ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر تالیاں پیٹ پیٹ کر ہنسنے لگے۔

ان کی پیش قدمی رک گئی۔ انہوں نے پھیل کر اپنے پیچھے آنے والوں کا راستہ مسدود کر دیا۔ بھیڑ رک گئی۔ لوگ ان کے بڑھنے کا انتظار کرنے لگے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کے درمیان سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا مگر ایک دراز قامت، قوی الجثہ اور مہذب سیاہ فام اپنے ہم نسلوں کی وہ کھلی بدمعاشی برداشت نہیں کر سکا۔

وہ انہیں برا بھلا کہتا ہوا ان کے درمیان گھسا ہی تھا کہ انہوں نے اسے گھیر لیا۔ اس سے لپٹ پڑنے کے چکر میں وہ راستہ چھوڑ کر اس کے گرد مرکوز ہو گئے تھے۔ جگہ بنتے ہی مسافروں نے وہاں سے کھسکنا شروع کر دیا۔ آگے بڑھتے بڑھتے میں نے یہ دیکھا کہ ان کے تھپڑوں اور گھونسوں میں مہذب سیاہ فام کی غصیلی اور ناصحانہ تقریر ادھوری رہ گئی تھی۔ کچھ اسے مار رہے تھے اور کچھ اس کی جیبیں پھاڑنے کی براہ راست کوششوں میں مصروف تھے۔

رات گئے سنسان مقامات اور غیر مصروف ٹیوب اسٹیشنوں پر اس قسم کے اکادکا واقعات کے بارے میں سنسنی خیزی کے رسیا اخبارات خبریں چھاپتے رہتے تھے لیکن سرشام ایک مصروف اسٹیشن پر اس واقعے کا رونما ہونا

میرے لیے حیران کن تھا۔

''پولیس!'' اچانک فضا میں کسی خاتون کی خوف زدہ چیخ لہرائی جو بے ساختہ تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا کہ پولیس کا نام سنتے ہی سیاہ فام آوارہ گردوں کی ٹولی نے اپنے شکار کو چھوڑ کر واپس اندر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

اس افسوسناک واقعے کا یہ ایک اچھا پہلو تھا کہ اس شہر کے لچے لفنگے پولیس کے نام سے ڈرتے تھے۔ کسی دہشت زدہ عورت کی آواز سننے کے بعد انہوں نے یہ جاننے کی کوشش تک نہیں کی تھی کہ اس عورت نے پولیس کی آمد کا اعلان کیا تھا یا مدد کے لیے پولیس کو پکارا تھا، بس قانون کے آہنی ہاتھ سے اپنی گردنیں بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ لیے تھے۔

وہ سب مکار اور عادی لفنگے معلوم ہوتے تھے۔ لندن پولیس کے کسی بوبی سے اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے اسٹیشن سے نکلنے کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ افراتفری اور بھاگ دوڑ کے عالم میں انہوں نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو لندن ٹرانسپورٹ کے عملے کا کوئی بھی ذمے دار رکن باز پرس کے لیے انہیں روک کر پولیس کے حوالے کر دے گا۔

پلیٹ فارموں کی طرف دوڑ لگانے کی صورت میں کوئی ان پر زیادہ دھیان نہ دیتا۔ ہر دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ کچھ لاابالی لڑکے لڑکیاں بروقت کہیں پہنچنے کی عجلت میں پہلی ٹیوب پکڑنے کے لیے بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ بکھر کر مختلف پلیٹ فارموں کی طرف ہو لیتے۔ ایک دو اسٹیشن دور جا کر باہر نکلے بغیر کسی مقررہ مقام کی طرف واپس لوٹتے اور وہاں یکجا ہو کر کسی نئی واردات کی تیاری شروع کر دیتے۔

میرے لیے وہ ایک نیا اور سبق آموز تجربہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ لندن میں رہنے والوں میں نظر آنے والی باہمی رواداری ایسے ہی تلخ تجربات سے پیدا ہونے والی لاتعلقی کا نتیجہ ہو۔ کسی کی پیشانی پر نہیں لکھا ہوتا کہ کون

شریف اور کون بدمعاش ہے۔ اسی وجہ سے لوگ ہر تماشا سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے سرد مہری سے آگے بڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں، کوئی دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑاتا۔ ناگہانی ٹوٹ پھوٹ سے بچنے کے لیے شہریوں نے شرپسند عناصر کی سرکوبی کی ساری ذمے داری پولیس کے سر ڈالی ہوئی ہے جسے قانون کی پشت پناہی کے ساتھ نیک نامی کا موثر ہتھیار بھی حاصل ہے۔

جب قانون اپنا عمل شروع کرتا ہے تو شہریوں کی ساری رواداری، لاتعلقی یا بزدلی رخصت ہو جاتی ہے اور بیشتر شہری قانون کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھنے لگتے ہیں۔

لندن کے شہریوں میں پائے جانے والے فرض شناسی کے ان ہی جراثیم کے خوف نے مجھے ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا آرام دہ کمرا چھوڑ کر سلیم اکبر خان کے رائل ہوٹل کی طرف دوڑ لگانے پر مجبور کیا تھا۔

گیتا اور اس کے ساتھی کی لاشیں دریافت ہونے کے بعد لندن کے کم از کم دو شہری میرے اور ویرا کے خلاف دو تباہ کن شہادتیں دینے کی پوزیشن میں تھے۔

چیرنگ کراس کے روشن اور پرہجوم علاقے میں جہاں محبت کے نشے سے سرشار اور گرد و پیش سے بے خبر، ہر عمر کے جوڑے نظر آ رہے تھے وہاں منتظر نگاہوں، سوالیہ چہروں اور اضطرابی اشاروں کا نظارہ بھی ایک دلچسپ شغل تھا۔ میرے ہاتھ میں لٹکا ہوا ہلکا سا سوٹ کیس اس وقت میری مجبوری کا نمایاں اشتہار تھا۔ دیکھنے والوں کو دور ہی سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ جو شخص خود اپنا بوجھ اٹھائے، سر چھپانے کے کسی ٹھکانے کی تلاش میں سرگرداں ہو، اسے فوری طور پر کسی ترغیب کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔

اسٹیشن سے نکل کر میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک دیوار کے سائے میں کھڑی ہوئی ایک معقول صورت، [illegible] سے حرکت میں آگئی اور میرے شانے پر جھک کر رازدارانہ لہجے میں منمنائی

"تم اکیلے ہی ہو..... بزنس کا ارادہ ہے۔"

کتابوں میں لکھے ہوئے قانون کی پابندیوں کی وجہ سے وہاں مشتبہ مصروفیات کے ابتدائی طور پر ایسی ہی محتاط زبان استعمال کی جاتی ہے۔ میں نے رک کر لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موجود شکاری جیسی تیز چمک نے واضح کر دیا کہ اس کا تعلق اسی مس سینڈی کے قبیلے سے ہے، جس نے ماسٹر رابرٹ ہوٹل کے کمرا نمبر سات میں رکھی ہوئی بائیبل کے سادہ ورق کے ذریعے اپنا پیغام عام کرنے کی کوشش کی تھی۔

"نو بزنس!" میں نے صنفِ لطیف کا خیال کرتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "فی الحال میں کمرے کی تلاش میں رائل ہوٹل تک پہنچنا چاہ رہا ہوں۔ اس کے بعد کچھ سوچوں گا۔"

"میرے پاس ٹیوڈر ہوٹل میں پرائیویٹ کمرا ہے۔" اس نے میرے شانے سے شانہ ملا کر چلتے ہوئے کہا "پچیس پاؤنڈ یومیہ کرایہ ہے۔ آج رات کے پچاس ہوں گے۔ صبح میں تمہارے لیے کمرا چھوڑ دوں گی۔ بہت عمدہ ہوٹل ہے۔ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔ یہ بہت مناسب ڈیل ہے۔"

میں نے اس مرتبہ ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تیس کے لگ بھگ، دلکش خدوخال والی عورت تھی مگر ہلکے سے میک اپ کی تہ میں جھانکتی ہوئی اپنی جلد کی رنگت کی وجہ سے وہ مجھے مدقوق سی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے، سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے جنہیں آئی شیڈز کی مدد سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ موسم خنک ہونے کے باوجود اس کے جسم پر گرمیوں کا لباس تھا جس میں کپڑے کے استعمال میں خاصی کنجوسی سے کام لیا گیا تھا۔

نیچے گلے والے جالی دار کپڑے کے بلاؤز کے نیچے اس نے جو کچھ پہنا ہوا تھا وہ اس کی جلد سے ہم رنگ تھا۔ مختصر الفاظ میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ اس نے اپنے لباس سے ستر پوشی سے بڑھ کر جسم نمائی کا کام لینا چاہا تھا اور اس میں ناکام نہیں رہی تھی۔

"میم! تمہاری پیش کش کا شکریہ۔ مجھے رائل ہوٹل ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو! تو وہیں پہنچا دیتی ہوں۔ پانچ پاؤنڈ دے دینا....." اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ وہ بہت کھلے دل سے تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی کی قائل معلوم ہوتی تھی۔

افراط زر اور مالیاتی دباؤ کی وجہ سے پاؤنڈ بھی دھیرے دھیرے اپنی وقعت کھو رہا تھا۔ ایک پاؤنڈ کی مالیت نوٹ سے وزنی سنہرے سکے کے روپ میں ڈھل چکی تھی مگر پھر بھی اس وقت تک پاؤنڈ، پاؤنڈ ہی ہوتا تھا اور پھر پانچ پاؤنڈ کی رقم تو کافی تھی۔

میں نے ازراہِ مذاق کہا "ذرا سے کام کے اتنے پیسے؟ پانچ پاؤنڈ میں تمہیں میرا سوٹ کیس بھی لے کر چلنا ہوگا۔"

اس نے زبان سے کچھ کہے بغیر فوراً ہی میرے ہاتھ سے سوٹ کیس تقریباً چھین لیا اور مجھ پر اپنا یہ فلسفہ واضح کر دیا کہ وہ سب کچھ کر سکتی تھی لیکن ہاتھ آتے ہوئے پاؤنڈ نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

چند لمحوں کے لیے میرے اندر سویا ہوا وہ خود غرض، ایذا پرست، متکبر اور خود پرور انسان جاگ اٹھا جو دوسروں کی تحقیر اور تذلیل کر کے خوش ہوتا ہے۔

چند برسوں بعد ہم انگریز کی صد سالہ غلامی سے اپنی آزادی کی پچاسویں دہلیز میں داخل ہونے والے تھے۔ انہوں نے طاقت کے بل پر ہمارے پرکھوں کی ہڈیوں اور بزرگوں کی محنت پر راج کیا اور اس روز اسی انگریز کی ایک آبرو باختہ بیٹی کسی زر خرید باندی کی طرح میرا سوٹ کیس اٹھا کر میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی قیمت صرف پانچ پاؤنڈ تھی۔ پچاس پاؤنڈ اس پورے وجود کی قیمت تھی۔

حرم سراؤں، کنیزوں اور بازارِ مصر کے نیلاموں کا مذاق اڑانے والوں کے شہر کا چیرنگ کراس خود رضا کارانہ بردہ فروشی کا ایک مرکز بنا ہوا تھا جہاں شام کے دھندلکوں میں راتوں کے سودے ہو رہے تھے اور اس وقت میں خود بھی اس بازار کا ایک غیر اہم اور چھوٹا سا خریدار تھا۔

جسم پابند ہوتے ہیں مگر ذہن اور خیالات ہر قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس لڑکی کا مجھ سے یوں آٹکرانا ایک بہت معمولی سا واقعہ تھا لیکن اس عبرت اثر تماشے نے پل بھر میں میری ذہنی رو کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ میرے لیے وہ خیالات اور برتری کا عارضی احساس آسودگی، سرور بلکہ ذہنی لذت کا سبب بن گیا۔

میری وہ کیفیت بس ذرا سی دیر رہی پھر میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا۔ دیارِ غیر میں میں اپنا ذرا سا بوجھ بھی خود نہیں اٹھا سکتا تھا، میرے سوٹ کیس کا وزن ہی کتنا تھا۔ میں اپنے کسرتی وجود کے ساتھ خالی ہاتھ جھلاتے ہوئے چل رہا تھا اور وہ نرم و نازک سی عورت سوٹ کیس سنبھالے ہوئے تھی۔

میں نے اس سے زیادہ پھرتی سے اس کے ہاتھ سے اپنا سوٹ کیس واپس چھین لیا۔

غلام قومیں اپنا سارا بوجھ اپنے رکھوالوں پر ڈال کر غفلت کی نیند سو جاتی ہیں۔ آزاد شہری اپنا ہر بوجھ فخر کے ساتھ خود اٹھاتے ہیں۔ خیالات کی پہلی رو کی تردید میں میرے ذہن میں ایک نئی لہر ابھری جس نے میرا سینہ قدرے پھلا دیا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ اور ایم آئی کی جگہ اب اسپیشل ٹاسک فورس اپنی سرزمین کی تمام سرحدوں کی نگہبانی کر رہی تھی اور دشمنوں کو چن چن کر ان کی گردنیں ناپ رہی تھی۔ آزادی کے بعد اپنے زور بازو پر انحصار کی راہ پر ہمارا سفر سست لیکن درست سمت میں تھا اور میرا راستہ بھی وہی تھا۔

"تم عجیب آدمی ہو!" میری ساتھی تعجب سے کہہ رہی تھی۔ "سوٹ کیس واپس کیوں لے لیا؟"

"میں مذاق کر رہا تھا۔ مرد ساتھ ہو تو عورت خالی ہاتھ ہی اچھی لگتی ہے۔"

"ایشیائی ہو۔" اس نے فیصلہ صادر کیا پھر پوچھا "کیا پاکستان سے آئے ہو؟"

میں چونک پڑا مگر میں نے اس کے سوال کا جواب ٹال کر سکون سے پوچھا "تمہیں یہ شبہ کیوں ہوا؟ کسی کی

شہریت اس کے چہرے پر تو لکھی نہیں ہوتی۔"

وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ لپ اسٹک لگے ہوئے ہونٹوں کے پیچھے اس کے موتی جیسے دانتوں کی قطار نمایاں ہوگئی "عورتوں کے لیے پاکستانی مرد ندیدے ہونے کے باوجود نرم خو اور تمہاری طرح شائستہ ثابت ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ چار بیویوں کے ساتھ گزارہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ دوسری بات......"

اس کی دوسری بات شروع ہونے سے پہلے میں نے بات اچک لی "تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ ہر پاکستانی کی چار بیویاں ہوتی ہیں؟"

"میں نے یہی سنا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی "کوئی غربت، بیماری یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے دو تین پر گزارہ کرتا ہو تو دوسری بات ہے۔"

"خدا کا خوف کرو بے بی!" میں نے اسے گھور کر کہا "بیوی کے روپ میں ایک زبان دراز اور لڑاکا عورت بھی اللہ کے عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ چار کی ہمت کون کرسکتا ہے؟ وہ صرف ایک مذہبی رعایت ہے جو عدل وانصاف کی کڑی شرائط کے ساتھ مردوں کو حاصل ہے۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والوں کی تعداد ملک بھر میں آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

"ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مجھے اس سے کیا لینا۔ میں کون سی تم سے شادی کی امیدوار ہوں! تم تو رات بھر کی دوستی پر بھی آمادہ نہیں ہو۔" اس کی بے پروائی بدستور قائم رہی۔

"میں نے تمہاری ایک غلط فہمی کا ازالہ کردیا۔ اب وہ دوسری بات بھی بتا ڈالو جو میری دخل اندازی کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"پتا نہیں میں کیا کہہ رہی تھی۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز میں کوئی مکاری نہیں تھی۔

"تمہیں یہ شبہ کیوں ہوا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں!" وہ چونک کر بولی "اگر تم پاکستانی ہی ہو تو برا نہ ماننا، تمہارے سوٹ کیس کے ناکافی وزن کی وجہ سے مجھے یہ خیال آیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پاکستانی گھر سے خالی ہاتھ آتے ہیں اور یہاں سے لدے پھندے واپس جاتے ہیں تو یہ تمہارے لیے اچھی بات ہے۔ وہ یہاں دل کھول کر زرمبادلہ خرچ کرتے ہیں......"

اس بار اس نے میری بات کاٹ دی "برٹش کسٹم والوں کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان سے کم سازو سامان کے ساتھ آنے والوں میں ہی ہیروئن کے اسمگلر شامل ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کم سامان کی وجہ سے کسٹم والے ان کی تفصیلی تلاشی نہیں لیں گے اور وہ وائٹ یا براؤن شوگر یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ یہاں پاکستان کی ہیروئن کی زبردست ڈیمانڈ ہے۔"

میرا سر گھوم گیا۔ بازاروں میں خریدار کی تلاش میں ماری ماری پھرنے والی ایک آوارہ صفت لڑکی مجھ سے ٹکرائی تو وہ بھی ہیروئن کی بین الاقوامی تجارت پر اتھارٹی بننے کی کوشش کررہی تھی۔

"تو تمہارا خیال تھا کہ میں دکھاوے کے لیے یہ ہلکا پھلکا سوٹ کیس لے کر پاکستان سے ہیروئن سمیت یہاں وارد ہوا ہوں؟"

میں نے تلخی سے سوال کیا۔

"میرے اندازے کا برا مت مانو۔" وہ جلدی سے بولی "میں نے تم سے پہلے ہی معذرت کرلی تھی۔ اگر تمہارے پاس واقعی کچھ مال ہے تو تم مجھ پر پورا پورا اعتماد کرسکتے ہو۔ میں مکمل رازداری کے ساتھ تمہیں ایسے دام دلواسکتی ہوں جو تمہیں فرانس اور جرمنی تک میں نہیں ملیں گے۔ اگر تم خالی ہاتھ آئے ہو تو نیور مائنڈ۔ میں تم سے ایک مرتبہ پھر اپنی غلط قیاس آرائی پر معافی چاہتی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہوتا کہ چیرنگ کراس پر تم سے ملاقات ہوگی تو میں ضرور پاکستان سے ہو کر آتا اور اپنے ساتھ ایک دو کلو ہیروئن ضرور لاتا۔" میں نے اس کے اندازوں کی نفی کرنے کے لیے نرمی سے جواب دیا۔

"سنا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان واقع آزاد قبائلی علاقوں میں بہترین ہیروئن نہایت ارزاں نرخوں پر ملتی ہے۔ شکر اور آٹے کی طرح چھوٹی بوریوں میں بھری ہوئی ہیروئن دکانوں میں سرعام بکتی ہوتی ہے۔ کوئی بھی اس کی خریداری کرسکتا ہے مگر اسے یہاں لانا مشکل ہے۔ جب سے امریکن ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے افسر پاکستان میں جم کر بیٹھے ہیں، مقامی کسٹم حکام اور اینٹی نارکوٹکس ایجنسیوں والے بھی بہت فعال ہوگئے ہیں......کاش، ایک بار میں بھی پاکستان کا چکر لگانے کے لیے وسائل جمع کرسکوں۔"

"میں کبھی پاکستان نہیں گیا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمہاری یہ سنی سنائی کہانیاں فرضی ہیں۔ بلی کو خواب میں ہمیشہ چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ہیروئن کی تیاری کی لاگت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی احمق بھی اسے شکر اور آٹے کی طرح بوریوں میں بھر کر نہیں بیچ سکتا۔ چرس اس سے ہزاروں گنا سستی ہوتی ہے لیکن اسے بھی سونے کی ٹکیوں کی صورت میں سیلوفین کی شفاف پنی میں لپیٹ کر بیچا جاتا ہے۔"

"چرس کے بارے میں زبان بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔" اس نے منہ بنا کر مجھے خاموش کردیا "میں نے اپنی آنکھوں سے سیاہی مائل سبز چرس کے گز جیسے ڈلے دیکھے ہیں۔ بعض اڈوں پر انہی ڈلوں سے کنارے توڑ توڑ کر گاہکوں کو چرس فراہم کی جاتی ہے۔ کئی بار میں خود ان ڈلوں میں سے چرس خرید چکی ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ لندن کے بے راہرو طبقے میں چرس ایک مقبول اور سستے نشے کی حیثیت رکھتی ہے مگر میں نے انجان بن کر اس سے پوچھا "تو کیا لندن میں ایسے اڈے کافی تعداد میں موجود ہیں؟"

وہ عارفانہ ہنسی کے ساتھ بولی "اب ہر چرسی کو پکاڈلی یا لیسٹر اسکوائر نہیں آنا پڑتا۔ سارے علاقے اس معاملے میں خودکفیل ہیں۔ جب سے ہیروئن کی وبا پھیلی ہے، رائل نارکوٹکس کمیشن اور اس کے سارے ذیلی اداروں کی توجہ اسی پر مرکوز ہوکر رہ گئی ہے۔ اب وہ چرس پر زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ پولیس والے چرس پینے والوں کو نظر انداز کرنے لگے ہیں۔ کسی کے پاس سے دس بیس گرام چرس برآمد ہو بھی جائے تو اسے زبانی تنبیہ اور تادیب کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

اپنی گھناؤنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود وہ عورت میرے لیے دلچسپ ثابت ہورہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ باتوں ہی باتوں میں، میں کافی دیر سے اس کے ساتھ چل رہا تھا لیکن رائل ہوٹل کے بورڈ کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ میں نے چونک کر قرب وجوار کا جائزہ لیا تو اس مصروف گلی کی دکانیں مجھے کچھ شناسا سی محسوس ہوئیں۔ شاید ہم تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں سے گزرے تھے۔

میں ایک دیوار سے ٹک کر رک گیا۔ میں نے سوٹ کیس فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔

"رک کیوں گئے؟" میری گھورتی ہوئی نظروں کا سامنا کرتے ہی اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"باتوں میں الجھا کر تم مجھے کہاں لیے پھر رہی ہو؟ ہم دوبارہ اس راستے پر کیوں آئے ہیں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر شرمسار لہجے میں بولی "کمال ہے کہ تم نے دوبارہ ادھر آتے ہی اندازہ لگالیا۔"

"آخر اس حرکت کا مطلب کیا ہے؟" میں نے تیزی سے سوال کیا۔ اس لڑکی کے بارے میں میرے ذہن میں یکایک ہی خطرناک شکوک وشبہات نے سر ابھارنا شروع کردیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میرے لہجے کی ترشی پر وہ پریشان ہوگئی "مختصر سی رفاقت کے لیے تم مجھے شریف اور اچھے آدمی نظر آرہے تھے۔ میں نے سوچا کہ باتوں میں لگا کر تمہارے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع حاصل کرلوں تو شاید تم رائل ہوٹل جانے کا ارادہ ترک کرکے میری پیش کش قبول کرلو۔"

اس کی احمقانہ پرامیدی نے میرا ذہن صاف کردیا

مگر اس کی زبان سے اپنی تعریف و توصیف سن لینے کے باوجود میں نے اپنی آواز کی تیزی برقرار رکھی ''ہر شریف اور اچھے آدمی کو تم چکمہ دے کر یوں ہی گلیاں گھماتی پھرتی ہو؟ کیا یہ میرے شریف ہونے کی کوئی سزا ہے؟''

''تم ذرا سی شرارت کا برا مان گئے۔ چلو اب ہم سیدھے رائل ہوٹل چلتے ہیں۔''

میری برہمی نے اسے مغموم اور سنجیدہ کر دیا۔ میں دوبارہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس بار اس نے رائل ہوٹل کے لیے بالکل ہی مخالف سمت پکڑی تھی۔

''شرارت ہر ایک کے ساتھ نہیں کی جاتی۔'' تھوڑی دیر کے بعد وہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگی ''لندن کے ان معروف علاقوں میں عورت کے قرب کے متلاشی سیکڑوں مرد ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں مگر خود میں کسی سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں پاتے۔ سرشام جو لڑکیاں بن سنور کر اپنے گھروں سے نکلتی ہیں اور سیاحوں کی اس کمزوری کو سمجھتی ہیں وہ کبھی بھی صبح سے پہلے اپنے گھر نہیں لوٹتیں۔ تمہیں ہوٹل پہنچانے کے بعد میں بھی کسی نہ کسی سے مل بیٹھنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ تم دوسرے مردوں سے مختلف نظر آئے تو میں نے چاہا کہ تمہیں شیشے میں اتار لوں۔ یہ کوئی اتنا بڑا قصور تو نہیں ہے کہ مجھے لٹکا دیا جائے......''

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے نرمی سے کہا ''تمہیں سولی پر کون لٹکا رہا ہے؟ میں خود بھی تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں میں محو تھا۔ اس وقت سات بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔ اگر میں سات بجے تک رائل ہوٹل نہ پہنچا تو فون پر کرائی ہوئی ریزرویشن منسوخ کر کے وہ کمرا کسی کو بھی دے دیں گے۔''

''اوہ...... یہ باریکی میرے علم میں نہیں تھی ورنہ میں تمہارا وقت برباد نہ کرتی۔ ہم بس دو تین منٹ میں رائل ہوٹل پہنچ جائیں گے۔ دراصل میں تم سے رائل ہوٹل سے تھوڑی دور ہی ملی تھی۔ باتیں شروع ہوئیں تو تمہیں پھسلا کر دوسری طرف لے آئی۔''

''دنیا جہان کی باتیں ہو گئیں لیکن تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔''

''میں تو بہت تفصیلی تعارف کرانا چاہ رہی تھی۔ تم راضی ہی نہیں ہوئے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''میں تمہارا نام پوچھ رہا ہوں۔ بار بار ان باتوں کو نہ چھیڑو جو طے ہو چکی ہیں۔''

''نام میں کیا رکھا ہے۔ ایک پتھر کا نام اگر تم گلاب، موم یا شکر قند رکھ لو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں بھی اس شہر کی ایک باسی ہوں اور بس۔''

مایوسی کے عالم میں انسان کو فلسفہ ہی سوجھتا ہے اور وہ بھی فلسفے پر اتر آئی تھی، جب کہ میں صرف پانچ پاؤنڈ میں ہاتھ آئی ہوئی مفت کی اس دوستی کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ضروریات، مصروفیات اور کردار کے اعتبار سے وہ کیسی بھی رہی ہو، دل کی بری نہیں تھی اور کسی آڑے وقت میں میرے کام آسکتی تھی۔ میں نے اصرار کیا ''لندن کے دوسرے باسیوں میں تمہاری کوئی الگ شناخت بھی تو ہوگی۔''

''تم مجھے شیری کہہ سکتے ہو لیکن نام جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رائل ہوٹل تمہیں دکھا کر میں دور ہی سے لوٹ جاؤں گی۔ لندن میں ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ دو بچھڑے ہوئے ملاقاتی پھر کبھی اتفاقاً ایک دوسرے سے مل سکیں۔''

میں خود بھی اسے سلیم اکبر خان کے سامنے یا رائل ہوٹل میں لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی باتوں کے جواب میں اخلاقاً مجھے پوچھنا ہی پڑ گیا ''دور سے کیوں لوٹو گی؟ میں تمہیں اپنے کمرے میں لے جا کر چائے، کافی یا اسکاچ پلاؤں گا، یہ تمہارا حق ہے۔''

اس کی وضاحت حیران کن بلکہ ناقابل یقین تھی ''رائل ہوٹل کی مالکہ مجھ سے جلتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں ٹیوڈر والوں کے لیے کام کرتی ہوں، وہ مجھے اندر ہی نہیں گھسنے دے گی۔''

''تو کیا تم ٹیوڈر ہوٹل میں کوئی ملازمت بھی کرتی

ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ ملازمت کے تقاضے ہی تو تھے جو مجھے تمہارے روبرو لائے تھے۔'' اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کک...... کیا یعنی تمہارا مطلب ہے کہ تم ہوٹل کے لیے گاہک گھیرتی ہو؟''

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔

''اس سیزن میں تو ہوٹل ویسے ہی بھر جاتے ہیں۔ انہیں تم کو بگاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم جس کاروبار میں جھانکو، تمہیں کوئی نہ کوئی مافیا کام کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ سیاحوں کی دلچسپی کے علاقوں میں ایسے ہوٹلوں کی بہتات ہے، جن میں پندرہ سے تیس پاؤنڈ یومیہ پر مختصر سا کمرا اور ناشتا ملتا ہے لیکن لڑکیوں کے ذریعے ہوٹلوں کی آمدنی بہت بڑھ جاتی ہے۔ ٹیوڈر میں بھی ریٹ پندرہ پاؤنڈ ہے لیکن تم سے ملنے والے پچاس پاؤنڈ میں سے صرف دس میرے حصے میں آتے، چالیس وہ لوگ لے لیتے ہیں۔ پندرہ کی جگہ چالیس پاؤنڈ کی آمدنی کون چھوڑتا ہے۔ دور افتادہ شہروں کی لڑکیاں لندن کی چمک دمک کے افسانے سن کر یہاں آتی ہیں تو بہت سادہ لوح ہوتی ہیں۔ انہیں ایسے ہوٹلوں میں سر چھپانے کا ٹھکانا اور آمدنی کا ایک ذریعہ مل جاتا ہے۔ جب وہ تجربے کار ہو جاتی ہیں تو پھر کسی بہتر ٹھکانے کی طرف پرواز کر جاتی ہیں۔''

''یہ باتیں پریشان کر دینے والی ہیں۔ تم اپنی مرضی اور خوشی سے جو چاہو، کرتی رہو لیکن یہ تو ذلت کی بات ہے کہ تم دوسروں کی تجوریاں بھرنے کے لیے ہر روز گندگی کے ڈھیر کریدنے پر مجبور ہو۔''

''تم سیاح ہو۔ چند روز کے لیے یہاں آئے ہو۔ رہو اور جی بہلا کے لوٹ جاؤ۔ اس راکھ کو زیادہ کریدو گے تو کوئی شرارہ تمہارے دامن کو بھی داغ دار کر دے گا۔ سنڈیکیٹ والوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ کوئی ان کے قبضے میں آئی ہوئی لڑکیوں کو ورغلانے کی کوشش کرے۔''

''یعنی یہ دھندا کوئی باقاعدہ سنڈیکیٹ چلا رہا ہے؟'' میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''چپ رہو'' وہ میرا بازو دباتے ہوئے خوف زدہ آواز میں بولی ''مجھے کچھ پتا نہیں۔ تم بھی ایسی باتیں نہ کرو۔ بعض اوقات میں بے دھیانی میں بے سروپا باتیں بھی کر جاتی ہوں۔''

اس کا لب ولہجہ اور چہرے کی اڑی ہوئی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ اس کی بے سروپا باتیں نہیں تھیں۔ ان کے پس پشت جو کچھ بھی تھا، وہ خوف آور تھا۔ وہ لڑکی اپنے انجام سے ڈرتی تھی۔

ایک موڑ گھوم کر وہ رک گئی ''سامنے رائل ہوٹل ہے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

بڑے نیون سائنز میں لکھا ہوا وہ روشن بورڈ دور ہی سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ اپنا نام بتا دینے کے باوجود اس نے رسماً بھی مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا تھا۔ رخصت کا لمحہ آ جانے پر میں نے از خود کہا ''میرا نام اسلم خان ہے۔ تم سے دوبارہ کہاں رابطہ ہو سکتا ہے؟''

اس نے جھٹ اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر مجھے تھما دیا۔ کارڈ پر اس کا پورا نام شیری رینڈل اور نیچے ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ کارڈ پر پتا سرے سے موجود نہیں تھا۔

میرے متوقع سوال سے بچنے کے لیے وہ خود ہی بولنے لگی ''میں ٹیوڈر ہوٹل میں رہتی ہوں۔ یہ وہاں میرا پرائیویٹ فون ہے۔ میں نہ ملوں تو مشین پر اپنا پیغام ریکارڈ کرا دینا۔ میں پہلی فرصت میں تم سے رابطہ کر لوں گی۔''

میں نے اپنی جیب سے نکالا ہوا دس پاؤنڈ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا ''تم نے میرے ساتھ اپنا کافی وقت برباد کیا ہے اس لیے باقی پانچ پاؤنڈ میری طرف سے ٹپ سمجھ لو۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک مجروح مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس نے میرا ہاتھ واپس دھکیلتے ہوئے کہا ”میری خالص ذاتی آمدنی ہے۔ اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرے طے شدہ معاوضے کے پانچ پاؤنڈ کو اپنے اس وقت کی قیمت سمجھ لو جو میں نے تمہیں بھٹکا کر ضائع کیا ہے۔ ٹپ کا مجھے حق ہی نہیں ہے۔“

میں اسے نوٹ دینے پر مصر تھا، وہ خالی ہاتھ لوٹنے پر ضد کر رہی تھی۔ تھوڑی سی تکرار ہوئی مگر پھر لندن کی وہ جسم فروش عورت میرے مقابلے میں جیت گئی۔

”گڈ لک، سوئٹ مین!“ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں ہونٹوں سے چوم کر بوسہ فضا میں اچھالا اور تیز قدموں سے موڑ گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس کے کارڈ پر نام سے پہلے کچھ درج نہیں تھا کہ وہ کنواری تھی یا زندگی کے کسی مرحلے پر شادی کے تجربے سے گزر چکی تھی۔

وہ جو بھی تھی اور جیسی بھی تھی، میرے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کر مجھے شدت سے یہ احساس دلا گئی تھی کہ بیشتر بنیادی اور اخلاقی قدروں سے محروم، مغربی تہذیب کے جھلستے ہوئے صحرا کی بے وقعت ریت میں کچھ ایسے آبدار جوہر بھی پوشیدہ تھے جو اپنی آبرو کے لیے کسی جوہری کی نظر کے منتظر تھے۔

شیری کسی شکار کی تلاش میں نکل گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی تنہائی کے ایک کرب ناک احساس نے مجھے آگھیرا اور میں بوجھل قدموں سے رائل ہوٹل کی طرف ہو لیا۔

☆☆☆

رائل ہوٹل لب سڑک بنے ہوئے رہائشی طرز کے ایک سہ منزلہ مکان میں واقع تھا۔

فٹ پاتھ کے ساتھ لگی ہوئی خوب صورت آہنی گرل کے پیچھے تقریباً دس فٹ تک رنگا رنگ پھولوں کے تختے نظر آ رہے تھے۔ ان تختوں کے درمیان سرخ بجری کی روش عمارت کے داخلی دروازے تک جا رہی تھی۔

عمارت کے سامنے کے حصے میں کنکریٹ یا پتھر کا استعمال بس اسی حد تک کیا گیا تھا کہ عمارت کا ڈھانچا اپنی بنیادوں پر کھڑا رہ سکے۔ اس کے بعد ہر جگہ بہت فراخ دلی سے لکڑی اور شیشے کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس قطار کی بیشتر عمارات اسی طرز کی تھیں اور وہاں کے شہری قوانین کے باعث عمارات کے استعمال کی نوعیت بدل جانے کے باوجود کم از کم سامنے کے رُخ پر کسی نمایاں تبدیلی سے محفوظ تھیں۔

داخلی دروازہ سطح زمین سے تین فٹ سے زیادہ بلند تھا۔ وہاں تک جانے والے پختہ زینوں کے دونوں طرف لمبے لمبے روشندان نظر آ رہے تھے جو عمارت کے نیچے تہ خانے کی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے۔

شہر کا مطلع ابتدا ہی سے ابر آلود تھا۔ لندن بلکہ پورے انگلستان کا آسمان سال کے بارہ مہینے بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ کہیں کہیں ان کی کثافت کم ہوتی ہے تو اجالا سا پھیل جاتا ہے ورنہ ہر طرف ملگجی سی روشنی کا راج ہوتا ہے۔ جس دن کسی علاقے میں سورج چمکتا نظر آ جائے، لوگوں کی عید ہو جاتی ہے۔ موسمی حالات سے گفتگو کی ابتدا کرنے والے روایت پسند انگریز اپنے دوستوں کو فون پر برائٹ سنی ڈے کی مبارک باد دیتے ہیں۔

کھلے آسمان اور تیز چمکیلی دھوپ سے محروم اس قوم کو موسم کی یہ خرابی کبھی بھی ترقی اور لگن سے کام کرنے سے نہیں روک سکتی۔ پھوار اور برسات کی جھڑی یہاں کے معمولات میں شامل ہیں۔ چمکیلے دن میں بھی لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے تہ ہو کر جیب میں سما جانے والی برساتی یا چھتری لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ مطلع صاف ہونے کے باوجود کسی سمت سے اچانک کالی کالی گھٹائیں امڈتی ہیں اور پھوار پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ ہوا کا دباؤ کم ہو تو یہی بوندا باندی ذرا سی دیر میں دھواں دھار برسات کا روپ دھار لیتی ہے۔

میں نے رائل ہوٹل کی روش پر قدم رکھا ہی تھا کہ پھوار پڑنے لگی۔ میرے پاس باران رحمت سے محفوظ رہنے کا کوئی فوری وسیلہ نہیں تھا۔ میں نے رفتار تیز کر دی۔

سطح زمین سے کئی فٹ کی بلندی پر ہوٹل کے داخلی ہال میں میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی سفید فام عورت بظاہر میز پر رکھا ہوا چھوٹا ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھی مگر اپنے فرائض سے غافل نہیں تھی۔ اس نے دروازے کے شفاف شیشے میں سے مجھے دیکھ لیا تھا۔

میں چند زینے طے کر کے جوں ہی شیشے اور لکڑی کے بنے ہوئے پرشکوہ دروازے پر پہنچا، برقی تالے کا بزر بولنے لگا۔ اندر والی نے مجھ سے انٹر کام پر کوئی استفسار کیے بغیر بٹن دبا کر تالا کھول دیا تھا کیونکہ میرے بائیں ہاتھ میں لٹکا ہوا ہلکا سا سوٹ کیس میری فوری ضرورت کا واضح اشتہار تھا۔

دروازہ کھولتے ہوئے میری نگاہ اندر جھولتی ہوئی تختی پر پڑی۔ پاکستان میں نو ویکنسی کا بورڈ ملازمت کے امیدواروں کو باہر ہی سے بھگانے کے لیے کام آتا ہے۔ رائل ہوٹل میں اسے خالی کمروں کی فراہمی سے معذوری کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

میرے داخل ہونے پر خودکار دروازہ پھر سے مقفل ہو گیا۔ کرسی پر موجود صحت مند خاتون ٹی وی بھول کر میری طرف متوجہ ہو چکی تھی کہ اچانک سلیم اکبر خان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”ویری گڈ...... تم ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ یہاں تک پہنچنے میں تمہیں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟“

میرے لیے سلیم کا انداز پیشوائی دیکھ کر وہ عورت دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی جس پر کوئی فٹ بال میچ دکھایا جا رہا تھا۔ میں سلیم کی طرف بڑھ گیا۔

ہاتھ ملانے کے بعد اس نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر وہیں ایک کنارے سے رکھ دیا اور ایک دروازے میں گھس گیا۔ وہاں بھی ٹیلی وژن پر میچ چل رہا تھا۔ وہ کمرا بیک وقت دس بارہ آدمی آسانی سے استعمال کر سکتے تھے مگر اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

چوبی فرش پر بلکہ اس کو چھپانے اور موسم کی سردی سے محفوظ رہنے کے لیے دبیز فرشی قالین کا استعمال ٹھنڈے ملکوں کے باشندوں کے لیے ایک ناگزیر مجبوری کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارے یہاں لوگ ہزاروں اور کبھی کبھی لاکھوں کی اضافی لاگت سے قیمتی پتھروں سے خوب صورت فرش بنواتے ہیں اور یورپ والوں کی معاشرتی نقالی میں اسے کسی بھی قالین کے نیچے دفن کر دیتے ہیں۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ سلیم نے میرے ساتھ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا ”تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔ اسی ہوٹل میں ایک کمرا خالی ہوا تھا۔ ایلیزا نے مجھے بتایا اور میں نے اسے فوراً ہی بک کرا لیا۔ اب تم مزے سے یہیں رہ سکتے ہو۔“

”اور تم میرے ساتھ رہو گے؟“ میں نے اپنے شبہے کی تصدیق چاہتے ہوئے پوچھا۔

وہ پہلی بار مسکرایا اور بولا ”میں اتنا بدذوق نہیں ہوں۔ تھوڑی سی تنگی ترشی میں اسی پولش لڑکی کے ساتھ گزارہ کر لوں گا۔ بے چاری کی کچھ بچت ہوتی رہے گی۔“

میں نے شیری سے حاصل ہونے والی معلومات سلیم کے کانوں میں انڈیلنے کا ارادہ کیا لیکن بروقت یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس معاملے میں ہوٹل والی نے سلیم سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ بیشتر رعایت اس نے اور لڑکی کو ہی منتقل کر دی تھی۔

سلیم نے مجھ سے کچھ پوچھا لیکن فٹ بال میچ پر کمنٹری کرنے والے کی پرجوش آوازوں اور تماشائیوں کے غلغلے کی وجہ سے بات میرے پلے نہیں پڑ سکی۔

”اسے بند کر دو یا چینل بدل دو......“ میں نے ٹیلی وژن کی طرف اشارہ کر کے بیزاری سے کہا۔

سلیم نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر...... اسکرین تاریک کر دی ”اس وقت ہر چینل پر ایک ہی کہانی چل رہی ہو گی۔ اسے بند کرنا ہی سب سے بہتر ہے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے ریموٹ کنٹرول میز پر رکھ دیا۔

میرے کان کھڑے ہوئے ”کون سی کہانی کا ذکر

کرر ہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ساؤتھ آل میں گولیاں مار کر ایک جوڑے کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنا کر بے زاری سے کہا'' آدھے گھنٹے پہلے یہ خبر آئی تھی۔ اب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے چکر میں ہر چینل اسی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کوئی بھی حادثہ یا واقعہ ہو جائے تو یہ لوگ اسے یوں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جیسے وہ دنیا کی سب سے بڑی خبر ہو۔ وہ ہر قیمت پر گیتا اور جیمز پنڈت کو ہیرو بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''گیتا تو خیر کسی بھارتی عورت کا نام ہو سکتا ہے مگر یہ جیمز پنڈت کیا بلا ہے؟'' اس موضوع سے گہری دلچسپی ہونے کے باوجود میں نے محض سرسری سی حیرت سے پوچھا۔

''گیتا کے ساتھ مرنے والا کوئی حرام کا جنا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''لو خود ہی سن لو۔''

یہ کہہ کر سلیم نے ٹیلی وژن کھول دیا۔ وہ کوئی مقامی چینل تھا جس پر جائے واردات کی فلموں کے ساتھ مرنے والوں کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔

''اگر ان خبروں میں دلچسپی ہے تو میں ذرا اوپر کمرے تک ہو آؤں؟ اتنی دیر میں نیچے کچن سے چائے تیار ہو کر آ جائے گی۔'' اس نے پہلو بدل کر کہا۔

''اسے بند ہی کر دو تو بہتر ہے۔ میں یہاں خبریں سننے نہیں، تم سے باتیں کرنے اور پینے پلانے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے بے فکری سے کہا۔ میرے لیے وہ خبریں لاکھ اہم سہی مگر ان میں میری غیر معمولی دلچسپی میری اپنی سلامتی کے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ خبریں میں اخبارات میں زیادہ تفصیل سے پڑھ سکتا تھا۔

میرے لیے ان خبروں کی اہمیت صرف اتنی تھی کہ گیتا کے فلیٹ میں مقفل دونوں لاشیں زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکی تھیں۔ چند گھنٹوں میں ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

''میرے لیے یہ اچھا ہے کہ تم تھوڑی دیر تک یہ خبریں دیکھتے رہو۔ پینے پلانے کے لیے ہم اوپر چلیں گے۔ میں ایلیزا کے ساتھ مل کر کمرے میں جگہ بنا کر آ رہا ہوں۔ دراصل مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔''

''اس بے یقینی کی وجہ؟ اور پھر تم نے میرے لیے ایک کمرا بک کیوں کرایا؟''

''بس میرا دل کہہ رہا تھا۔ تم بھی میری طرح دل پھینک معلوم ہوتے ہو۔ راستے میں کوئی شہزادی مل جاتی تو یہاں کا راستہ بھول کر سوٹ کیس سمیت اسی کے پیچھے ہو لیتے۔ تم ساڑھے سات بجے تک نہ آتے تو میں بکنگ کینسل کرا دیتا۔ میری گرہ سے ایک پینی بھی نہ جاتی۔''

ہم دونوں ہی ہنسنے لگے اور میں نے اسے اپنی پولش محبوبہ کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔

اس دوران میں ٹیلی وژن مسلسل چلتا رہا تھا۔ سلیم سے باتیں کرتے ہوئے بھی میرے کان اسی پر لگے ہوئے تھے۔ اناؤنسر اسے لندن کی تاریخ کا ایک سنسنی خیز دہرا قتل قرار دے رہا تھا کیونکہ ان میں سے گیتا براہ راست انڈین فارن سروس کی ملازمہ تھی اور جیمز پنڈت کے بھی انڈین ہائی کمیشن سے گہرے روابط تھے۔

ٹیلی وژن پر مرنے والوں کی تصاویر بار بار مختلف زاویوں سے دکھائی جا رہی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کی زندگی کی تصاویر بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ گیتا کے کچن کے ڈسٹ بن میں پڑے ہوئے اومیز کے خالی ڈبے اور کھانے کے برتن بھی سراغ رسانوں اور ٹی وی کیمروں سے محفوظ نہیں رہے تھے۔

وہ تفصیلات جو شاید خاصی دیر سے بتائی جا رہی تھیں، میرے لیے دلچسپ تھیں۔ گیتا انڈین فارن سروس میں دس سال سے ملازمت کر رہی تھی اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی کرتے کرتے سب سے بڑے نان گزیٹڈ عہدے پر پہنچ چکی تھی جو چیف کلرک کے عہدے کے مساوی تھا۔ وہ لندن میں انڈین ہائی کمیشن کے تجارتی شعبے میں سینئر آپریٹر کے عہدے پر مامور تھی۔

گیتا کے بارے میں بقیہ باتیں شاید ٹیلی وژن

دوبارہ آن ہونے سے پہلے ہی بتائی جا چکی تھیں لیکن جیمز پنڈت کے بارے میں پوری تفصیلات میں نے سنیں۔

وہ بظاہر کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی کبھی تنگ دستی کا شکار نہیں رہا تھا۔ وہ اکثر انڈین ہائی کمیشن میں دیکھا جاتا تھا جس کی بنا پر ساؤتھ آل میں رہنے والے بیشتر لوگوں کو شبہ تھا کہ وہ برٹش حکام سے سوشل سیکیورٹی وصول کرنے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ہائی کمیشن کے لیے مخبری بھی کرتا تھا۔ ایسے ہر معاہدے پر اسے معقول رقم ملتی تھی جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ثابت ہوتی تھی۔

انڈین ہائی کمیشن کے ایک ترجمان نے جیمز پنڈت سے کسی بھی قسم کے مراسم یا لین دین سے انکار کیا تھا۔ انہیں انکار کرنا ہی تھا کیونکہ اسے خفیہ عارضی روزگار فراہم کرنے پر ان کے خلاف سوشل سیکیورٹی کے قواعد پامال کرنے کا الزام لگایا جا سکتا تھا جس کے نتائج ناخوشگوار ہوتے۔ پھر جیمز پنڈت کے عجیب نام، سفید فام رنگت اور دوغلی نسل کا عقدہ بھی حل ہو گیا۔ اس کی ماں لیلا پنڈت لندن میں آباد ایک متوسط بھارتی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جوان ہونے کی بنا پر وہ برطانوی قانون کے مطابق اپنے گھر والوں کے ہر دباؤ سے آزاد اور مکمل طور پر خود مختار تھی۔

گمراہ کن صحبتوں میں اپنے شب و روز بسر کرتے ہوئے اس نے پیٹر براؤن نامی ایک آوارہ گرد مقامی سے شادی کر لی۔ پیٹر سوشل سیکیورٹی سے ہفتہ وار رقم وصول کر کے چند دن میں شراب نوشی میں اڑا دیتا، جب گھر میں چولہا ٹھنڈا ہوتا تو بیوی کی ٹھکائی کر کے اسے کمانے پر مجبور کرتا۔ ان ہی جھنجٹوں میں شادی کے چار ماہ بعد جیمز کی ولادت ہوئی، اس کا ابتدائی نام جیمز براؤن تھا۔

صاحب اولاد ہونے کے بعد لیلا پنڈت اور پیٹر براؤن کے درمیان تلخیوں کی خلیج روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ پیٹر نشے میں ہوتا تو اسے جیمز کے خدوخال اور بالوں میں میاں بیوی کے متعدد مشترکہ دوستوں کی شباہت نظر آنے لگتی اور وہ لیلا پر الزام تراشیاں کر کے اسے بری طرح زدوکوب کرتا۔

وہ گاڑی ایک سال بھی نہ چل سکی۔ اپنے گھر بار سے کٹی ہوئی لیلا اپنی ذات پر ستم سہتی رہی اور پھر ایک دن جوانی کی بھوک کی وہ المناک کہانی اپنے فطری انجام کو پہنچ گئی۔ شوہر کے ہاتھوں پٹ کر لیلا قریب المرگ پہنچ گئی۔ پیٹر سمجھا کہ اس نے بیوی کو مار دیا ہے۔ وہ روپوش ہو گیا۔

لیلا پنڈت کو مہینوں بعد پتا چلا کہ پیٹر اسپین کی ساحلی تفریح گاہ ٹین ریف میں ایک اسٹیٹ ایجنسی چلا رہا ہے اور اس کے دن پھر چکے ہیں۔ وہ اپنے شیر خوار بچے کو لے کر ٹین ریف پہنچی تو پیٹر نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ لیلا کے رونے پیٹنے پر اسے دھکے دے کر باہر نکلوا دیا۔

لیلا کو معلوم ہوا کہ پیٹر نے ٹین ریف میں ایک نوخیز کلب ڈانسر سے شادی کر لی ہے۔ وہ مایوس ہو کر لندن لوٹ آئی۔ اپنے بے وفا شوہر سے مایوس ہو کر اس نے اس پر لعنت بھیجی اور اپنے نام کا آخری حصہ اپنے بیٹے کے نام کا جز بنا دیا۔ یہ مغرب میں کنواری ماؤں کا ایک معروف طریقہ ہے کہ ان کے بچے ولدیت کا سایہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے زندگی بھر اپنی ماؤں کے سر نیم یا خاندانی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ جیمز براؤن سے جیمز پنڈت بن گیا۔ باپ سے ملے ہوئے رنگ روپ کی وجہ سے وہ انگریز معلوم ہوتا تھا۔ ماں نے اسے پنڈت بنا دیا۔ ساؤتھ آل کے ماحول میں اس نے انگریزی پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہندی بھی سیکھ لی تھی۔

وہ سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہیں تھا۔ لیلا پنڈت یقیناً اونچی ذات کے کسی ہندو گھرانے کی بیٹی رہی ہو گی۔ اس نے جوانی کے جوش میں اپنے پورے گھرانے کے چہروں پر کالک مل دی۔ وہ عمر کے آخری حصے میں ساؤتھ آل ہی کے ایک گھر میں اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی اور اس وقت ٹیلی وژن اسکرین پر آنسوؤں کی جھڑی میں اپنے ماضی کو یاد کر رہی تھی۔

اس کے بڑھاپے کا اکلوتا سہارا اور اس کا گبرو جوان

اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ صرف اس کا نام اور اس کی یادیں باقی رہ گئی تھیں۔

سلیم اکبر خان نے وہ سب سنے بغیر تھوڑی ہی دیر پہلے جمز پنڈت کو بے ساختہ حرام کا جنا کہا تھا۔ لیلا پنڈت نے شادی کے صرف چار ماہ بعد ماں بننے کا اعتراف کر کے سلیم کی دی ہوئی اس گالی کو حق بجانب ثابت کر دیا تھا۔

وہ مغرب میں آباد ہونے والے گھرانوں کا ایک عام المیہ تھا جس کی بازگشت گاہے گاہے سنائی دیتی تھی۔ مضبوط مشرقی خاندانوں کی اس بے رحمانہ ٹوٹ پھوٹ میں اس سرزمین کے قانون کا بڑا دخل تھا۔ والدین کو بچے پیدا کرنے کا پورا حق حاصل تھا لیکن ان کی تربیت کے لیے وہ مغربی قانون کی پیروی کرنے پر مجبور تھے۔ بچوں کی نگرانی اور تعزیر کے مشرقی طریقے اس سرزمین پر جرم کا درجہ رکھتے تھے۔ اولاد کے بالغ ہونے کے بعد کسی کا کسی پر کوئی حق نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ آزاد اور خود مختار تھے۔ کسی کی اولاد فرماں بردار اور والدین کی اطاعت گزار تھی تو یہ بس اللہ کی دین یا اولاد کی مہربانی ہی تھی ورنہ کوئے کی کان میں اتر کر کس کا منہ کالا نہیں ہوتا۔

ٹی وی پر تقریباً دس منٹ تک اسی واقعے کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہوتا رہا۔ اس میں شہریوں سے رازداری کی پوری ضمانت کے ساتھ قانون کی مدد کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

اس وقت تک انگلینڈ میں سگریٹ نوشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی بلکہ تمباکو نوشی فیشن میں شامل تھی۔ بس رسمی طور پر سگریٹ فروشوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ نابالغ بچوں کے ہاتھ...... سگریٹیں فروخت نہ کریں، بچوں کی اس محرومی کے ازالے کے لیے سگریٹ ساز کمپنیوں نے جا بجا ایسی خودکار مشینیں نصب کر دی تھیں جن میں مطلوبہ مالیت کے سکے ڈال کر اور مخصوص بٹن دبا کر اپنے پسندیدہ برانڈ کی سگریٹ حاصل کی جا سکتی تھی۔

خبرنامے میں دوسری خبریں شروع ہوتے ہی میں نے اپنے لیے سگریٹ سلگائی اور صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔

سلیم واپس آیا تو ٹیلی وژن پر خبروں کا دورانیہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا "آداب اوپر چلتے ہیں۔ تمہیں تمہارا کمرا بھی دکھا دوں۔"

"میری وجہ سے تمہاری ایلیزا تو بور نہیں ہو گی؟" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"پولینڈ سے دور چند روز گزار کر اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ اکیلا رہ کر کوئی سیر و تفریح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ سفر سے لطف اٹھانے کے لیے کسی ہم ذوق ساتھی کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"شاید اسی اکیلے پن سے اکتا کر اس نے تمہیں اپنے کمرے میں پناہ دی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ اپنے اس فیصلے پر خوش ہی نہیں، نازاں ہے۔"

ٹیلی وژن بند کر کے میں اس آرام دہ کامن روم سے باہر نکلا تو میرا سوٹ کیس غائب تھا۔

"فکر مت کرو۔ سوٹ کیس تمہارے کمرے میں محفوظ ہے۔" اس نے مجھے اطمینان دلایا۔

میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت میری طرف دیکھ کر مسکرائی، میں نے اس کی طرف ہاتھ لہرایا اور زینوں کی طرف ہولیا۔ زینے کشادہ اور عمارت روشن تھی۔ موسمی سختیوں کی وجہ سے مکان کا ہوادار ہونا شاید وہاں خرابی میں شمار ہوتا ہو اس لیے تہ خانے میں واقع کچن کی ملی جلی خوشبوئیں پوری عمارت میں رچی ہوئی تھیں۔

پہلی لینڈنگ پر یعنی تقریباً نصف منزل پر پیچھے کی طرف بڑھے ہوئے تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ سلیم نے بتایا کہ ان میں دو بیت الخلا اور تیسرا غسل خانہ تھا۔ ہر منزل پر چھ کمروں کے لیے یہ اہتمام موجود تھا۔

"غسل خانوں میں یہ کفایت کیوں کی گئی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

روز بلکہ دن میں دو بار نہانے کا مرض ہم لوگوں کو ہی لاحق ہے۔ گورے کبھی کبھار نہاتے ہیں ورنہ رگڑ پونچھ سے ہی اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ یہاں رہو گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ غسل خانے بھی ضرورت سے زیادہ ہیں۔''

میرا کمرا پہلی منزل کی ایک تنگ راہداری میں واقع تھا۔ وہ تقریباً دس فٹ لمبا اور شاید اسی قدر چوڑا مگر صاف ستھرا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ دو جڑی ہوئی سنگل مسہریاں تھیں جن پر سفید چادر والا بستر لگا ہوا تھا۔ اس مختصر سے کمرے میں ایک چھوٹی سی میز اور کرسی بھی پڑی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک مہمان کے لیے صوفے نما کرسی موجود تھی۔ دروازے کے ساتھ والی دیوار کے کونے میں واش بیسن لگا ہوا تھا جس پر شیشہ نصب تھا۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے وہ دیوار گیر واٹر ہیٹر بھی نظر آیا جسے سکے ڈال کر مقررہ مدت کے لیے چلایا جاسکتا تھا۔ یہ کمرا کشادہ یا پرتعیش نہیں تھا مگر اس مختصر جگہ میں بنیادی ضرورت کی چیزیں مہیا کردی گئی تھیں۔ کمی صرف ملحق باتھ روم کی تھی۔

میرے استفسار پر سلیم نے ہنس کر کہا ''نہانے دھونے کے لیے دو قدم اتر کر سہولتیں موجود ہیں۔ چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے یہ واش بیسن لگا ہوا ہے۔ گندا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ ذرا سا پانی بہاؤ اور واش بیسن پھر صاف ستھرا۔ ابھی تک میں صرف بڑی ضرورت کے لیے نیچے اترا ہوں ورنہ کمرا کافی ہے۔''

میں اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔ اپنا کمرا دیکھنے کے بعد میں نے ایلیزا کو بے آرام کرنے کا ارادہ منسوخ کردیا۔ بے تکلفی سے لیٹنے بیٹھنے کے لیے میرا ہی کمرا مناسب تھا۔

سلیم مجھے اپنے کمرے میں لے جانے اور ایلیزا سے میری مہمان داری کرانے پر مصر تھا مگر میرے دلائل نے اسے بے بس کردیا۔ ایلیزا نیچے آکر بھی مہمان نوازی کے جوہر دکھا سکتی تھی۔ جب تک چاہتی، وہ ہمارے ساتھ بیٹھتی پھر اپنے کمرے میں جا کر بے فکری سے سو جاتی۔

رائل ہوٹل کے اس کمرے کا کرایہ سترہ پاؤنڈ یومیہ تھا۔ دو افراد کے لیے یہ رقم اکیس پاؤنڈ ہوجاتی تھی جو ناشتے، صابن، پانی اور تولیے وغیرہ کے اضافی اخراجات کے پیش نظر مناسب تھی۔ یہ سلیم کا ہی دم تھا کہ میں نے لندن کے قلب میں اتنا سستا ہوٹل دیکھ لیا ورنہ مجھے تو ماسٹر رابرٹ ہوٹل بھی سستا نظر آیا تھا جہاں کمرے کا یومیہ کرایہ اسی پاؤنڈ تھا۔

اوپر سے بلیک لیبل کی بوتل اور برف کے ڈلے لانے کے بعد سلیم نے رائٹنگ ٹیبل کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ اس نے پیگ بنانے شروع کیے تو میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا ایلیزا کو یہاں آتے ہوئے شرم آرہی ہے جو تم ہی یہ کام کررہے ہو؟''

اس نے ایک گہرا سانس لے کر میری طرف دیکھا پھر قدرے توقف کے بعد بولا ''وہ تھوڑی دیر بعد آئے گی۔ میں اس کے آنے سے پہلے تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہ رہا ہوں۔''

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میری وہاں آمد کا ایک مقصد خود بخود پورا ہوتا نظر آرہا تھا۔

''بے فکر ہو کر بات کرو۔ میں حاضر ہوں۔'' میں نے مسہری پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے میں نے گھر پر فون کیا تھا۔'' وہ گلاس تیار کرتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنے لگا ''وہاں کی خبروں نے مجھے پریشان کردیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے منیجر کی بدعملیاں رنگ لائی ہیں۔''

اس نے مجھے درآمدی سامان میں سے اہم پرزوں کی چوری، انشورنس کلیم اور پھر ان پرزوں کی چور بازاری کے بارے میں وہی کہانی سنائی جو میں اول خان سے سن چکا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ وہ خود معصوم بن گیا تھا۔ اس نے ساری ذمے داری اپنے منیجر پر ڈال دی تھی۔

''کل کسی کی رپورٹ پر پولیس نے تلاشی لے کر میرے دفتر کو سیل کردیا ہے۔'' آخر میں یہ اطلاع دے کر

خاموش ہوگیا۔ وہ میرا گلاس میری طرف بڑھا رہا تھا میں سرک کر مسہری کے سرے پر پہنچ گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو گڈ لک کہہ کر گلاس ہولے سے ٹکرائے اور ہونٹوں سے لگا لیے۔

پہلا بھرپور گھونٹ لینے کے بعد میں نے کہا ''یہ پریشانی اور بدنامی کی بات ہے۔ تمہارے پاکستان لوٹے بغیر شاید یہ قصہ نہ نمٹ سکے۔ تمہیں اپنا کاروبار بچانے کے لیے فوراً رخت سفر سمیٹ لینا چاہیے۔''

''موجودہ حالات میں میں واپس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔'' وہ یک بیک فکرمند نظر آنے لگا۔

''اگر اصل مجرم تمہارا منیجر ہے تو تمہیں کیا خطرہ ہے؟'' میں نے براہ راست سوال کر ڈالا۔

''مجھے ڈر ہے کہ یہ سیل فوراً نہ توڑی گئی تو معاملہ کوئی اور رخ اختیار کرلے گا اور میری بھی گردن پھنس جائے گی۔ میں اس کام کے لیے تھوڑی بہت رقم بھی خرچ کرسکتا ہوں۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اردو میں یہ فقرے ادا کرتے ہوئے اس کی آواز خود بخود دھیمی ہوگئی تھی۔

''اگر صحیح مشورہ چاہتے ہو تو کھل کر بات کرو۔ ادھورا مسئلہ سن کر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''زبان سے نکلی ہوئی بات پرائی ہوجاتی ہے۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں میں خود ہی اپنی پریشانیوں میں اضافہ نہ کرلوں۔''

''اگر تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے تو خاموش ہی رہو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''اپنے رازوں میں کسی کچے آدمی کو شریک کرکے اچھائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔''

میں نے گلاس سے دوسرا گھونٹ لیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے چہرے کی تحریر سے میرے دل کا حال جاننا چاہ رہا ہو۔ میں نے اس کی طرف دھیان تک نہیں دیا بلکہ سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا تاکہ اسے اپنی کوئی رائے قائم کرنے کے لیے وقت مل سکے۔

''جہاز تک ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔'' خاصی طویل خاموشی کے بعد وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا ''اور اس وقت ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے پی رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں کیونکہ مجھے نقصان پہنچا کر تم کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکو گے۔''

''اچھی طرح غور کرلو۔ ہم کل پھر بات کرسکتے ہیں۔ پولیس کا نام سن کر میں چونکا تھا۔ کئی پولیس افسروں سے میری پینے پلانے کی حد تک دوستی ہے مگر میں نے اب تک تمہارے سامنے اپنی زبان بند رکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پولیس والے کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ پتا نہیں، وہ میری بات مانتے ہیں یا ٹال دیتے ہیں، میں تم کو امید میں کیوں رکھوں؟ اور پھر مجھے پوری بات بھی معلوم نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ مجھ سے جس طرح بن پڑا، میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ آگے تمہارا مقدر ہوگا۔ اس کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔''

پولیس افسروں سے میری دوستی کا ذکر سن کر وہ دانے پر ٹوٹتے ہوئے کسی بھوکے پنچھی کی طرح میرے جال میں آگیا ''میں نے غور کرلیا ہے۔ وقت گنوا کر میں خسارے میں رہوں گا۔ یہ سمجھ لو کہ چند روز میں میرا دفتر واگزار نہ ہوا تو میں کبھی پاکستان نہیں جاسکوں گا۔ مجھے کہیں اور پناہ لینی پڑے گی۔ جمے جمائے کاروبار کو بھول کر ایسا کرنا آسان نہیں ہوگا مگر میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔''

''تم بلاوجہ میرے ذہن میں تجسس پیدا کررہے ہو۔ آخر تمہیں کیا خوف ہے؟''

وہ چند ثانیوں کے لیے یوں خاموش ہوا جیسے اپنے خیالات کو مجتمع کررہا ہو پھر کہنے لگا ''تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے جہاز پر تم سے مدن موہن کا ذکر کیا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس سے میری گہری دوستی تھی اور اسی نے مجھ کو پاکستانی اسپیشل ٹاسک فورس کے بارے میں رونے

کھڑے کر دینے والی کہانیاں سنائی تھیں مگر اس وقت تک میں مدن موہن کے لیے کچھ بے ضرر سے کام کر چکا تھا۔ ان دنوں بھی اسے پاکستان کے بعض بڑے بجلی گھروں کے اہم نقشوں کی ضرورت تھی۔ پرزوں کی صحیح تصریحات پڑھنے کے بہانے ان نقشوں کو حاصل کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے وہ سب جمع کر کے ان کی نقلیں بنوالی تھیں کہ اچانک مدن موہن غائب ہو گیا۔''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے پوچھا ''کیا اس فہرست میں کراچی کا ایٹمی بجلی گھر بھی شامل تھا؟'' میرے سوال پر وہ قدرے ہراساں نظر آنے لگا۔

''ہاں!'' اس نے تھوک نگل کر بے بسی سے اعتراف کیا۔ ''بھارت والے اپنے ملک میں پورے بجلی گھر بنانے کے لیے وہ نقشے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان بڑی مشینوں کی تیاری پر اجارہ داری رکھنے والے اس بھارتی منصوبے سے ناراض ہیں۔ مدن موہن نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو میں نے نقشوں کی فراہمی اپنے ذمے لے لی۔''

''مگر ان سب باتوں کا تمہارے منیجر کی چوریوں سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ جب تک مدن موہن سامنے تھا۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ اس کے غائب ہونے پر میں خوف زدہ ہو گیا۔ میرے ذہن میں بار بار ایس ٹی ایف کا نام آنے لگا۔ اگر ان لوگوں نے مدن موہن پر ہاتھ ڈالا تھا تو کسی وقت میری باری بھی آ سکتی تھی۔ دوستی میں کیے ہوئے کاموں پر آسانی سے غداری کا لیبل لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے مدن موہن کی واپسی کی امید میں خفیہ نقشوں اور کاغذوں کی نقلیں اپنے دفتر کی تجوری میں رکھ دیں اور مدن موہن کا انجام سامنے آنے تک پاکستان سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ میرے دفتر سے وہ کاغذات کسی ایجنسی کے ہاتھ لگ گئے تو میرا کیا انجام ہوگا۔ چھوٹی موٹی چوریوں کی شکایت پر کی جانے والی کارروائی ایک بڑے اسکینڈل میں بدل جائے گی۔''

''تمہارا خوف بجا ہے مگر تم نے ایسے کام کیے ہی کیوں تھے؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''دوستی کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ اس وقت کوئی خطرہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ سب خطرات تو مدن موہن کے غائب ہونے کے بعد سوجھے ہیں۔''

''کیا تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ مدن موہن قیمتی شراب اور خوب صورت لڑکیوں کے ذریعے کام کے آدمیوں سے گہری دوستیاں کر کے کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟''

''خدا کی پناہ!'' حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں ''اس لمحے تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ تمہارے کہنے سے خیال آ رہا ہے کہ شاید کچھ ایسا ہی چکر تھا...... میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا...... یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ وہ شراب اور عورت کے بدلے خفیہ معلومات سمیٹ رہا تھا۔''

''یہ مت کہو کہ تم اس امکان سے بے خبر تھے۔ تمہارے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی کھٹکا موجود تھا۔ اس لیے تم نے ملک سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے تم اسے کیا دے چکے ہو؟'' اپنے صدمے اور غصے کو چھپاتے ہوئے میں اپنے لب و لہجے کو ہمدردانہ رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''میرا ماضی مت کریدو۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تو مجھے دفتر میں موجود کاغذات کی فکر ہے۔ وہ غلط ہاتھوں میں چلے گئے تو میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ ان کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تمہارے دفتر کو ان کاغذات کے لیے سیل نہیں کیا گیا؟''

''ہر جگہ صرف مسروقہ آلات کا ذکر ہے۔ میں نے یہ سوال ہر طرح سے کیا تھا۔ میرے منیجر کو ان چوریوں کے جرم میں پولیس گرفتار کر چکی ہے۔ کاغذات ہاتھ میں آنے کا یقین ہو تو میں واپس جا سکتا ہوں۔ مجھ سے بھی تفتیش ہو گی۔ میں بیان دے کر بری ہو جاؤں گا۔ ان معاملات میں، میں نے منیجر کو خود مختاری دی ہوئی تھی۔ اس نے میرے اعتماد کو بری طرح مجروح کیا اور میری فرم کی ساکھ تباہ کر دی۔''

''پھر بھی وہ تمہاری ہدایات پر عمل کرتا ہوگا۔ تم خود کو اتنا الگ تھلگ کیسے رکھ سکتے ہو؟''

''وہ میرا ملازم ہے، میری ہی مرضی سے کام کرتا ہے لیکن کاغذوں میں ہر جگہ اسی کے دستخط ملیں گے۔ میں تو تم کو وہ باتیں بتا رہا ہوں جو پولیس کی نظروں میں مجھے بے قصور ثابت کر سکیں گی۔''

''اپنی گردن پھنستی دیکھ کر منیجر ان کاغذات کا راز فاش نہیں کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ میری اور مدن کی دوستی سے بھی وہ لاعلم ہے۔ یہ سب میری نجی زندگی کے راز ہیں جو میری ذات تک محدود ہیں۔''

''اگر تم اس بارے میں اتنے پر یقین ہو تو میں کوشش کیے لیتا ہوں۔ چوری چکاری کے مقدموں میں پولیس والے ہزار کرتب دکھا سکتے ہیں۔ غداری جیسے الزامات ہوں تو ہر ایک دامن بچانے کی کوشش کرے گا۔ معاملہ سنگین ہوا تو میں خود بھی اپنی سفارش واپس لے لوں گا۔''

''یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا۔ یہ کام ہو گیا تو میں زندگی بھر تمہارا غلام رہوں گا۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔

''تمہاری طرح میں بھی صرف دوستی کی خاطر ایک کوشش کرنے کا وعدہ کر رہا ہوں۔ کام کا ہونا یا نہ ہونا میرے اختیار سے باہر ہے۔ میرے سامنے اس طرح مت گڑگڑاؤ کہ مجھے اپنے آپ پر نادم ہونا پڑے۔ میں تمہارے لیے فون پر جو کچھ کہہ سکتا ہوں اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔''

''میرے لیے تمہاری یہ یقین دہانی آج کا سب سے بڑا انعام ہے۔'' اس کی آواز تشکر کے جذبات سے لبریز ہو گئی ''تم چاہو تو اسی وقت نیچے چل کر کراچی فون کر سکتے ہو۔''

''احمق ہوئے ہو۔'' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''کراچی میں اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہوں گے۔ یہ معاملہ اب کل صبح ہی طے ہو سکے گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے بحث کیے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ میرے سامنے اپنے جرائم کا اعتراف کر لینے کے بعد وہ دبا دبا نظر آ رہا تھا۔ ذہنی طور پر بھی اس نے میری برتری تسلیم کر کے سپر ڈال دی تھی۔

اس نے اپنے نامہ اعمال کی سیاہی کے بارے میں مجھ سے صرف مشورہ کرنا چاہا تھا لیکن خلاف توقع اسے مدد کی امید بھی بندھ گئی تھی۔ اس یقین دہانی میں میری منصوبہ بندی کا پورا دخل تھا۔ اس نے مدن موہن کے لیے خفیہ ریکارڈ کی نقول فراہم کر کے جو حرکت کی تھی، اس کی سنگینی کا اندازہ کراچی میں بیٹھے ہوئے لوگ ہی لگا سکتے تھے اور میری دلی خواہش تھی کہ سلیم اکبر خان کراچی لوٹ کر ان ہی کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ طویل مدت تک پاکستان سے مفرور رہنے کا ارادہ ترک کر دے۔

اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرتے ہی سلیم نے مجھ سے کہا ''ایلیزا انتظار کرتے کرتے بور ہو گئی ہو گی۔ اب میں اسے بلا لاتا ہوں، اس سے مل کر تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔''

''اس سے تم ہی اپنی طبیعت خوش کرتے رہو۔ دو ملّاؤں میں ایک مرغی حرام ہو جاتی ہے۔''

وہ بھونڈے انداز میں ہنس پڑا ''وہ پسند آ جائے تو مجھے بتا دینا۔ میں فوراً ہی دست بردار ہو جاؤں گا۔ ہم میں سے کوئی بھی ملّا نہیں ہے بلکہ خشخشی داڑھی کی وجہ سے اکثر ملّا مجھے قادیانی سمجھتے ہیں......''

اسے ایک غلط موضوع کی طرف بہکتے دیکھ کر میں

نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا ”باتوں کو طول دینے کے بجائے ایلیزا کو بلا لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے ہاتھ سے بھی جاتی رہے۔“

وہ چلا گیا اور میں نے آسودگی کے احساس کے ساتھ اپنا گلاس خالی کر دیا۔ اس نے ایلیزا کے بارے میں کھلی پیش کش کر کے وہی حرکت کرنے کی کوشش کی تھی جس کے ذریعے مدن موہن نے اسے اپنے جال میں پھانسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار وہ مدن موہن سے سیکھے ہوئے سبق کے ذریعے میری خوشنودی حاصل کر کے ایک جنجال سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ میں صرف اس خیال سے وہ گھٹیا بات سہہ گیا کہ مصیبت سے نکلنے کی کوشش کرنا ہر شخص کا حق ہوتا ہے۔

ایلیزا کسی دلہن کی طرح شرماتی اور مسکراتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں جیسے اجالا پھیل گیا۔ مغربی آداب کے مطابق میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا تو اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ شاید سلیم نے راستے میں ہی اسے میرے بارے میں بریف کر دیا تھا۔

میری سوچی سمجھی رائے کے عین مطابق ایلیزا اپنے تل طور سے کوئی رنگین مزاج لڑکی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے ہر انداز میں شائستگی اور گھریلو رکھ رکھاؤ کا قرینہ نمایاں تھا۔ مالی مجبوری یا پھر طول پکڑتی ہوئی تنہائی سے اکتا کر وہ مجبوراً سلیم کے پھندے میں آ گئی تھی۔

وہ یورپ ہی کے ایک کم ترقی یافتہ علاقے کی باسی تھی۔ انگریزی وہ ذرا سہج سہج سے اور رک رک کر بولتی تھی۔ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا پہلا پیگ حلق سے اتارتے ہی محفل میں سرور کا رنگ آ گیا اور ہم تینوں نے تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر بے باکانہ انداز میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنی شروع کر دی۔

رائل ہوٹل میں رہنے والوں کے لیے ناشتے اور چائے کے سوا کھانے پینے کا اور کوئی بندوبست نہیں تھا مگر سلیم نے ہوٹل کی مالکہ سے پرانے مراسم کی بنا پر کچھ ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ ٹھیک ساڑھے نو بجے ایک نوخیز لڑکی ٹرے میں گرم کھانے کی قابیں اور پلیٹیں وغیرہ لے کر میرے کمرے میں آ پہنچی۔

تین آدمیوں کے کھانے کے لیے چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل ناکافی تھی۔ نیچے تہ خانے تک اترنے کا موڈ نہیں تھا اس لیے ہم تینوں ہی پلیٹیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ سلیم میز پر رکھی ہوئی قابوں کی طرف متوجہ ہوا تو ایلیزا غالباً سلیم کی ہدایت کے مطابق میرے شانے سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خمار کے ڈورے تیر رہے تھے جن کی وجہ سے وہ قدرے بے حجاب نظر آ رہی تھی۔

میں نے بس ذرا سا مسکرا کر لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ سلیم میری مدد حاصل کرنے کے لیے ایلیزا کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہ رہا ہے۔ سلیم کو گھیر گھار کر پاکستان کی طرف واپس دھکیلنے کی خاطر میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اول خان سے اس کے دفتر کی سیل کھلوانے کے لیے بات کروں گا۔ اگر میں ایلیزا کے نخروں سے ذرا بھی مسحور ہو جاتا تو سلیم یہی سمجھتا کہ اس نے ایلیزا کے ذریعے مجھے پھانس لیا ہے۔ میں کسی بت کی طرح بے جان اور خاموش کھڑا رہا۔

میری طرف سے کوئی حوصلہ افزا ردعمل نہ دیکھ کر ایلیزا نے میرے بازو پر اپنا کچھ وزن منتقل کر دیا۔ اس کے گداز اور آستین سے محروم بازو کے دباؤ سے عام حالات میں شاید مجھے کسی قدر تحریک ملی ہوتی مگر سلیم کے بارے میں ایک بات ذہن میں آ جانے کے بعد ایلیزا میرے لیے یک بیک اپنی ساری کشش کھو بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے ٹکے ہوئے نازک سراپا کا بوجھ ضرور سنبھال لیا لیکن میری وہ مروت کسی لطیف احساس سے یکسر عاری تھی۔ یہ بات ایلیزا نے فوراً ہی محسوس کر لی۔

”تم عورتوں کے معاملے میں کچھ شرمیلے معلوم ہوتے ہو۔“ ایلیزا نے میرے سینے کی طرف سر جھکا کر بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

”شرمیلے نہیں ڈرپوک کہو۔“ میں نے خوش دلی سے

کہا ”یہی واقعہ پاکستان میں ہوا ہوتا تو وہاں خونریزی سے مار دھاڑ تک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

وہ بے اختیار ایک جھرجھری لے کر میرے شانے سے الگ ہو گئی پھر اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا ”تم کس واقعے کی بات کر رہے ہو؟“

”کسی مرد کی گرل فرینڈ اس کی موجودگی میں دوسرے مرد کو کرنٹ مارنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ ہم لوگ ایک آدمی ایک ووٹ کے ساتھ ہی ایک مرد ایک عورت کے اصول پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس سے تجاوز کرتے ہی فساد ہو جاتا ہے۔“

وہ حسین ہونے کے باوجود ذہین بھی تھی۔ میری بات سمجھ کر کھسیائے ہوئے انداز میں ہنسنے لگی۔

اس کی ہنسی کی آواز سن کر سلیم یوں مڑا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو ”کیا ہو رہا ہے؟ بہت راز داری کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ نشے کی جھونک میں آ چکا تھا۔

”رازداری!“ میں نے اس کا مضحکہ اڑایا ”اس چھوٹے سے کمرے میں شاید ہم تینوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں تک سن رہے ہیں اور تم باتوں سے انجان بن رہے ہو۔“

سلیم کے ہٹنے سے میز پر جگہ پیدا ہو چکی تھی، ایلیزا آگے بڑھ گئی۔

”معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی تمہیں پسند نہیں آئی۔“ سلیم نے اردو میں تبصرہ کیا۔

”مجھے پلے ہوئے تیتروں کے شکار کا کوئی شوق نہیں۔“ میں نے منہ بنا کر کہا ”شکار کا مزہ اسی وقت آتا ہے جب سامنے جنگلی تیتر ہوں۔ تمہاری یہ لڑکی تم ہی کو مبارک ہو۔“

”تم مشکل کاموں کے عادی معلوم ہوتے ہو۔“ وہ بقیہ ساتھیوں کی شرکت کا انتظار کیے بغیر کھانے کا آغاز کر کے بولا ”یہ اپنے بس کی بات نہیں ہے۔“

”مدن نے تمہاری اس کمزوری کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ پلے ہوئے تیتر ڈال کر تمہیں شکار کھلاتا اور اپنا الو سیدھا کرتا رہا۔ تم خود کو شکاری سمجھ کر خوش ہوتے رہے۔“ میں نے اس کے بہکے ہوئے ذہن پر ہلکا سا چرکا لگایا ”تم ذرا بھی مشکل پسند ہوتے تو آج پریشان نہ ہوتے۔“

”میرے زخموں کو کرید کر نشہ خراب مت کرو۔“ وہ منہ چلاتے ہوئے بڑبڑایا ”کھانا کھاؤ...... مگر تمہاری پلیٹ اب تک خالی کیوں ہے؟“

”باری آئے گی تو کچھ لوں گا، ذرا ایلیزا کو ہٹنے دو۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”مائی ڈرٹی ڈارلنگ ایلیزا!“ سلیم نے اپنے قدموں پر قدرے ڈگمگاتے ہوئے ہانک لگائی ”میرے عظیم اور معزز دوست کی پلیٹ ابھی تک خالی ہے اور تم گوشت کے پارچے سمیٹ رہی ہو۔“

ایلیزا نے ہڑبڑا کر میرے لیے جگہ خالی کر دی۔ اس کی پلیٹ واقعی لبریز تھی۔

یہ ایلیزا کی خوبی تھی کہ اس نے بہت دھیرے دھیرے اسکاچ پی کر ہمارا ساتھ دیا تھا۔ یوں اس نے خود کو آپے سے باہر ہونے سے بچائے رکھا تھا۔ میرا اور سلیم کا معاملہ برابر رہا تھا لیکن وہ چکنی داڑھی والا مےنوش کسی بھی وقت بہکنے والا تھا۔

خوراک کے لقمے معدے میں اترنے کے ساتھ سلیم کی کھوپڑی پر اسکاچ کا رنگ گہرا ہو رہا تھا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی، وہ ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے یوں جھول رہا تھا جیسے گھومتے ہوئے فرش پر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہو مگر پھر بھی وہ اپنی دانست میں میری عزت افزائی کی مضحکہ خیز کوششیں کر رہا تھا۔ یہ بات اس کے لاشعور میں بیٹھ چکی تھی کہ اس وقت میں اس کے چکروں میں آ کر اس کے مسئلے کے حل کی کوئی صورت نکال سکتا ہوں۔

کھانا ختم ہونے تک سلیم کی حالت قابل رحم ہونے لگی تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تو وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ پڑی

ہوئی کرسی پر جم گیا۔ ہم دونوں فارغ ہوگئے مگر سلیم کا منہ چلتا رہا۔ وہ اپنی پلیٹ سے یوں ٹٹول ٹٹول کر لقمے لے رہا تھا جیسے اسے صاف نظر نہ آرہا ہو۔ جب اس نے اپنی پلیٹ چھوڑ کر ایلیزا کی پلیٹ میں سے اٹھا کر اس کی جھوٹی ہڈیاں بھی چوسنی شروع کردیں تو ایلیزا نہ رہ سکی۔ شرمندگی سے اس کا چہرہ گلنار ہوا جارہا تھا۔

”بس! تم بہت سیر ہوکر کھا چکے۔“ ایلیزا نے سختی سے کہا ”کیا اب میز کرسی بھی کھاؤ گے؟“

سلیم ہنسنے کے بجائے بس ہنہنا کر رہ گیا۔ ایلیزا نیپکن سے اس کے ہاتھ وغیرہ صاف کرنے لگی۔

”آج کی شام بہت خوب صورت اور پر لطف رہی۔“ ایلیزا نے مڑ کر مجھ سے کہا ”اب تم سے روز ملاقات ہوگی۔ اس وقت میں اجازت چاہوں گی۔“

”چلی ہی جاؤ تو بہتر ہے۔“ میں نے بے رحمانہ ہنسی کے ساتھ کہا ”دیر کی تو پھر سلیم کو اسٹریچر پر ہی یہاں سے لے جانا پڑے گا۔ اسے بری طرح چڑھ گئی ہے۔“

”نہیں!“ وہ ہاتھ فضا میں لہرا کے بولا ”مجھے نہیں چڑھی۔“ انگریزی میں یہ دعویٰ کرتے ہی وہ اردو میں گڑگڑایا ”اسلم بھائی...... تم میرے پکے دوست...... بڑے بھائی بلکہ میرے ابا ہو۔ بس صبح اٹھ جانا اور سالوں کی ایسی کی تیسی کروادینا۔ ان کی یہ مجال کہ تمہارے چھوٹے بھائی کا دفتر سیل کریں...... یہ کام ہونا ہے۔“ اس نے لہک لہک کر، جسم کو بل دے کر، الفاظ کو کھینچ کھینچ کر خاصی دقت سے وہ فقرے ادا کیے۔ اس کی سوچ کے مطابق اس کا ہر لفظ برمحل اور بامعنی تھا۔ نشے کی بگڑی ہوئی حالت میں بھی وہ اپنی اصل مصیبت کو نہیں بھول سکا تھا۔ وہ دہشت اس کے دل ودماغ کی گہرائیوں میں اتر چکی تھی۔

سلیم کے لیے از خود کرسی سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ ایلیزا نے اس کا ایک ہاتھ اپنے کندھے پر لے کر خاصی دقت سے اسے کھڑا کیا اور پھر بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

اس وقت تک میں مسہری پر بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔

ایلیزا کی پریشانی پر مجھے رحم آگیا۔ میں نے سلیم کو دوسری طرف سے سہارا دیا۔ اس کا دوسرا بازو اپنے کندھے پر لے کر ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد کس لیا۔ سلیم ہولے ہولے بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے الفاظ آپس میں یوں گڈمڈ تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

وہ اپنے قدموں پر اچھلتا کودتا میرے کمرے میں آیا تھا۔ واپسی پر اسے عملاً اٹھا کر لے جایا جارہا تھا۔

وہ راستے بھر بڑبڑاتا رہا لیکن اسلم، کراچی، دفتر اور سیل کے سوا کوئی پانچواں لفظ میرے پلے نہیں پڑسکا۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مادری زبان کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ وہ اپنی بساط سے زیادہ پی کر بھی سب سے بڑی پریشانی کو نہیں بھول سکا تھا۔ اس کے دفتر پر ہونے والی کارروائی مسلسل اس کے دماغ پر کچوکے لگا رہی تھی۔

ان دونوں کا کمرا بھی کم وبیش میرے کمرے جیسا ہی تھا۔ میرے استقبال کے لیے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان اور کپڑوں وغیرہ کو ادھر اُدھر اُڑسنے کی سر توڑ کوشش کی گئی تھی مگر اس کابک جیسے کمرے میں دو افراد کی روزمرہ ضروریات کی اشیا کو ایک حد تک ہی سمیٹا جاسکتا تھا۔ وہاں ہر چیز منہ کو آرہی تھی۔

ایلیزا کی مدد سے سلیم اکبر خان کو مدہوشی کے عالم میں مسہری پر ڈال کر میں سیدھا ہوا تو ایلیزا نے وحشت زدہ انداز میں میرا راستہ روک لیا۔

”اس نے بہت زیادہ پی لی ہے۔ یہ مر تو نہیں جائے گا؟“ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”فکر مت کرو۔“ میں نے اس کے بازو پر تھپکی دے کر مربیانہ لہجے میں کہا ”ہر روز مر کر زندہ ہونے والے سخت جان لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔ صبح تک یہ ٹھیک ہوجائے گا۔“

اس نے کسی خوف زدہ ہرنی کی سی نظروں سے مسہری پر پڑے ہوئے اپنے سفری محبوب کی طرف دیکھا پھر اس کی التجائیہ نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

میں نے سر جھکا کر نرمی سے اسے اپنے راستے سے ہٹایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں باہر نکلا تو میری نگاہ اس متوسط قامت فلسطینی پر پڑی جو پنڈلیوں تک آئے ہوئے ایک رنگین لبادے میں سیڑھیوں کے کنارے پر کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اس کے وہاں موجود ہونے کی وجہ بھی میری نظروں میں آگئی۔ اسی جیسے لبادے میں ملبوس ایک خاتون نچلی لینڈنگ پر واقع باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جارہی تھی اور وہ وہاں...... چوکیداری کررہا تھا۔

وہ یقینی طور میاں، بیوی ہی تھے ورنہ کوئی مرد اس طرح دوسری عورتوں کی چوکیداری نہیں کرتا۔

وہ جوڑا بچت کے لیے سلیم والے فلور پر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ ملحق باتھ روم سے محروم ایسے ہوٹلوں میں فیملی کے ساتھ قیام واقعی حوصلے کا کام ہے۔ ہر آن یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی راہداری یا باتھ روم میں کہیں کوئی بدقسمت شخص خواتین کے لیے عذاب نہ بن جائے۔

میں سگریٹ پھونکتے ہوئے اس فلسطینی کو سرسری نظروں سے دیکھتا ہوا نیچے اترتا چلا گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ لینڈنگ کے موڑ تک اس نے اعصابی دباؤ کے عالم میں میری نگرانی کی ہوگی۔

اس سستے ہوٹل میں روم سروس کا رواج نہ ہونے کے باعث گندے برتن صبح تک یوں ہی پڑے رہے تھے۔ بھوک کے عالم میں جو خوشبوئیں بھلی اور اشتہا انگیز معلوم ہورہی تھیں۔ پیٹ بھر جانے کے بعد بوجھل اور ناگوار لگ رہی تھیں۔ انتظامیہ نے اپنی سہولت اور عملے کے آرام کے لیے کمروں میں انٹرکام تک کی سہولت فراہم نہیں کی تھی۔ میں نے چند گہرے سانس لیے اور لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر گر گیا۔

اس وقت صرف گیارہ بجے تھے۔ ذہن پُرسرور خمار طاری ہونے کے باوجود آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ میں بستر پر پڑا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر اٹھ کر سگریٹ سلگالی۔

کمرا کچھ زیادہ ہی چھوٹا ہونے کے باوجود بستر آرام دہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بے چینی دور ہونے کے بعد ایک بار میری آنکھ لگ گئی تو دن چڑھے ہی ہوش آئے گا۔

رائل ہوٹل ایک بارونق علاقے میں واقع تھا۔ میں نے سونے سے قبل خود کو تھکانے کے لیے باہر نکلنے کا فیصلہ کرکے جیکٹ پہنی، جیبیں ٹٹول کر پاسپورٹ، ٹکٹ اور پاونڈز ہونے کا یقین کیا اور باہر نکل کر کمرے کا دروازہ مقفل کردیا۔

اسی وقت آہٹیں اور زور زور سے بولنے کی آوازوں کے ساتھ ایک قریبی کمرے سے شوخ رنگوں کے چست لباس میں ملبوس ایک سفید فام جوڑا برآمد ہوا۔ انگریزی کے لب ولہجے اور انداز سے وہ دونوں ہی امریکی نظر آرہے تھے۔

مرد کی توجہ دروازے پر مرکوز تھی۔ عورت نے میری طرف دیکھا اور تنبیہی انداز میں مسکرانے لگی۔ میں نے مسکرا کر ہی جواب دیا اور زینوں کی طرف چل پڑا۔ مرد لندن کے موسم کو گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے جلد از جلد فرانس کی طرف روانہ ہونے کے عزم کا اظہار کررہا تھا۔ عام امریکیوں کی طرح وہ بھی بالکل بے پروا تھا۔ اسے ذرا بھی فکر نہیں تھی کہ اس کے بے ہودہ تبصرے سن کر کوئی انگریز بھڑک بھی سکتا ہے۔

اس وقت نچلے ہال میں میز کے پیچھے ایک دبلی پتلی اور چڑچڑی سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مردوں نے لندن شہر کا کاروبار چلانے کی بیشتر ذمے داری صنف نازک پر ہی ڈالی ہوئی ہے۔ میں اس لڑکی پر ترس کھاتا ہوا میز تک پہنچا تو اس نے زبان ہلائے بغیر اپنی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کردیں۔ اس حالت میں وہ روبوٹ معلوم ہورہی تھی۔

میں نے ترکی بہ ترکی کے مصداق خاموشی سے اپنے کمرے کی چابی اس کے سامنے ڈالی اور کچھ کہے

بغیر دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس مرحلے پر وہ خاموشی توڑنے پر مجبور ہوگئی۔

''سر! کیا تم باہر جا رہے ہو؟'' ظاہر ہے کہ وہ سوال میرے لیے ہی تھا۔

''تو کیا یہ دروازہ تمہارے کچن میں کھل رہا ہے؟'' سیدھا جواب دینے کے بجائے میں نے اس سے ایک ٹیڑھا سوال کر ڈالا۔

میں نے اپنا لہجہ سپاٹ ہی رکھا۔

''اوہ! شاید میرا سوال غلط تھا۔'' وہ شپٹا گئی ''تم یقیناً باہر ہی جا رہے ہوگے۔ دو بجے تک میں یہیں موجود رہوں گی۔ تم اس کے بعد لوٹے تو شاید دروازہ کھلنے میں دیر ہوگی۔ دراصل میں دو بجے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی جاتی ہوں۔''

''تو کیا دو بجے سو جانا تمہاری ملازمت کا ایک حصہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یس سر!'' اس نے خشک لہجے میں کہا ''مجھے سات بجے بیدار ہو کر مہمانوں کے لیے ناشتا تیار کرنا ہوگا ......درمیان میں نیند خراب ہو جائے تو دوبارہ سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی میرے کمرے میں گھنٹی کی آواز کم ہی پہنچتی ہے۔''

اس نے مہذب پیرائے میں تاخیر سے لوٹنے کے جملہ نتائج سے آگاہ کر دیا تھا۔ ہوٹل کی مالکہ کرائے کم رکھنے کے لیے عملے سے دہرے کام لے کر خاصے جوڑ توڑ کر رہی تھی۔ مجھے اس لڑکی پر رحم آنے لگا' میں نے کہا ''ٹھیک ہے' مجھے بیرون ملک ایک فون بھی کرنا ہے۔ میں دو بجے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔''

''تھینک یو!'' پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

امریکی جوڑے کو اوپر سے نیچے آنے میں دیر ہوگئی تھی مگر وہ میرا دردِ سر نہیں تھا۔ کسی نے کہا تھا کہ دنیا میں بھٹکتے ہوئے لمبے چوڑے اور بسیار خور امریکی سیاح عام طور پر نیم پاگل ورنہ سنکی ضرور ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں نے کمرہ بند کرنے کے بعد سیڑھیوں پر ہی بیٹھ فیصلہ کرلیا ہو۔

میں رائل ہوٹل سے باہر نکلا تو اس وقت بھی پھوار پڑ رہی تھی۔ برسات کی اس جھڑی میں بھیگ چیرنگ کراس میں خوار ہونے سے بہتر تھا کہ میں اپ بستر ہی میں پڑا رہتا لیکن یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں تیز تیز قدموں سے ایک طرف ہوگیا۔

مسلسل برسات کی وجہ سے علاقے کی عمارتیں دھلی دھلی اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں مگر ہر طرف جگمگاتی ہوئی روشنیوں پر خواب ناک اداسی طاری تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں تھا۔ فٹ پاتھ پر بھی لوگ برساتیاں پہنے اور چھتریاں لگائے آ جا رہے تھے لیکن ان کی تعداد میں نمایاں کمی واقع ہو چکی تھی۔

ایک عمارت کی آڑ لینے تک میں خاصا بھیگ چکا تھا میری طرح برسات میں بھیگنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ میرے لیے یہی غنیمت تھا کہ وہاں میں اکیلا ہی احمق نہیں تھا۔

قریبی پب پر نظر پڑی تو میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔ اس موسم میں پب کا گرم ماحول' فضا میں رچی ہوئی خوشبوئیں اور لوگوں کا جوش و خروش ہی سب سے بہتر ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے دروازہ آزمایا تو وہ مقفل تھا۔ اندر لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ایسے مقامات پر روشنیاں عام طور پر کم ہی رکھی جاتی ہیں۔ میں گھوم کر دوسرے دروازے پر گیا تو وہ بھی بند تھا۔ معاً اندر سے گھنٹیوں کی آواز آئی اور میں وہاں سے آگے چل دیا۔

شہر کے پب عام طور پر گیارہ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ پانچ منٹ پہلے اطلاعی گھنٹیاں بجادی جاتی ہیں۔ ان پانچ منٹوں میں ندیدے اپنے جام دوبارہ لبریز کرا لیتے ہیں۔ گیارہ بجے والی گھنٹیوں کے ساتھ دروازے بند کر دیے جاتے ہیں تاکہ نئے گاہک اندر داخل نہ ہوں۔ اندر والوں کو اپنے پیمانے خالی کرنے کی سہولت حاصل رہتی ہے۔ بارٹینڈر ساقی گری کے لوازم سمیٹنے اور بساط لپیٹنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اندر رکے ہوئے گاہکوں کی یاددہانی کے لیے گیارہ بجے کے بعد بھی وقفے وقفے سے گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں۔ آخر میں کوئی مدہوش کسی میز پر سر اوندھائے نظر آئے تو عملہ اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے سیڑھیوں کے ساتھ ڈال دیتا ہے اور پب کو تالے لگا کر گھروں کو چل دیتا ہے۔

شہر کے سارے پب بند ہو جانے کے احساس سے مجھے جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ بارش میں بھیگ کر اسکاچ کا رہا سہا سرور بھی زائل ہو چکا تھا۔ میں نے واپسی کا راستہ لینے میں ہی عافیت جانی۔

سڑکوں پر کہیں بھی بارش کا پانی جمع نہیں تھا مگر گیلی سڑکوں پر چلتی ہوئی گاڑیوں کے ٹائر شوں شوں کی ایک مترنم آواز پیدا کر رہے تھے۔ ان کی طرف دیکھتے دیکھتے میری نگاہ ایک دکان پر پڑی جو شاید دیر تک کھلی رہتی تھی۔ وہاں بھانت بھانت کے بیگ' تھیلے' جیکٹ اور برساتیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے دیکھ بھال کر مٹھی میں سما جانے والی ایک نرم اور مضبوط برساتی پسند کی جس کے ساتھ سر' کانوں اور گردن کو اپنے حصار میں لینے والی ٹوپی بھی منسلک تھی۔ دام پوچھے تو پندرہ پاؤنڈ۔

پندرہ کو شرح تبادلہ سے ضرب دینے کا نتیجہ شاید سیکڑوں میں تھا۔ میں نے برساتی کا جائزہ لیا۔ وہ کسی طرح اتنی مہنگی نہیں لگتی تھی۔ مسئلہ رقم کا نہیں' ایک بھیگے ہوئے سیاح کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا تھا۔

''دس پاؤنڈ دے دوں؟'' میں نے اسے نہایت فراخ دلانہ پیشکش کی۔

''کیوں؟'' اس نے تنک کر پوچھا ''اس کی قیمت فروخت پندرہ پاؤنڈ ہے تو دس میں کیوں دوں؟''

میں لاجواب ہوگیا۔ اس کی بدتمیزی واضح تھی مگر مجبوری یہ تھی کہ اس وقت کوئی دوسری دکان نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جیب سے پانچ پانچ پاونڈ کے تین نوٹ نکال کر حقارت سے کاؤنٹر پر پھینکے اور آگے چل دیا۔ وہ گورا دکان دار میرا منہ دیکھتا رہ گیا۔

دکان سے آگے نکل کر میں نے سوچا کہ گیلے کپڑوں پر برساتی پہننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے بلاوجہ ہی اس دکان دار کو اپنی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا تھا۔ کئی دن بعد جب مطلع صاف تھا میں اسی دکان پر رکا۔ اس وقت برساتی پانچ پاونڈ کی تھی۔

میری غیر متوقع واپسی نے ہوٹل والی لڑکی کو حیران کر دیا۔ میں اس سے چابی لے کر اوپر گیا' گیلے کپڑے اتار کر دوسرا لباس پہنا اور پھر نیچے آگیا۔

''باہر سے کافی بھیگ کر آئے ہو۔ کیا ٹرافالگر اسکوائر کی طرف نکل گئے تھے؟'' مجھے کرسی پیش کر کے لڑکی نے پوچھا۔ ساتھ ہی وہ فون کے ڈائل پر لگا ہوا تالا بھی کھول رہی تھی۔

''کسی کو وقت دیا ہوا تھا۔'' میں نے خفت سے بچنے کے لیے بات بنائی۔

''میں سمجھ گئی تھی کہ ایسی ہی کوئی بات ہوگی ورنہ اتنے گندے موسم میں کون گھریا ہوٹل سے باہر نکلتا ہے۔'' وہ عالمانہ لہجے میں بولی۔ اس کے سامنے رکھا ہوا ٹیلی وژن اس وقت بے جان تھا۔

اس وقت ایک بھی نہیں بجا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ویرا میری کال کے انتظار میں سلگ رہی ہوگی۔ میں نے پہلے اسی سے بات کرنے کا فیصلہ کر کے ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا نمبر ملالیا۔

مسز روزی برڈ کا نام لیتے ہی آپریٹر نے کال ویرا کے کمرے میں منتقل کر دی۔ دوسری گھنٹی پر اس نے فون اُٹھالیا۔ اس نے خالص امریکی لہجے میں ''ہائے روزی اسپیکنگ'' کہا تھا۔

''میں نے کچھ خبریں دیکھی ہیں۔'' میں نے معروف انگریزی الفاظ کے استعمال سے بھی گریز

کرتے ہوئے خالص اردو میں کہا۔
''قصہ چل پڑا ہے۔ میں چگی داڑھی والے کے پتے پر ہی ٹھہرا ہوں۔ تم سترہ نمبر کمرے میں سے مجھے بلوا سکتی ہو۔''
''خبریں تشویش ناک ہیں۔ اس وقت بات نہیں ہو سکتی۔ صبح اخبار غور سے دیکھ لینا۔ میں تمہارے جانے کے بعد مسلسل......ٹی وی کھولے بیٹھی ہوں۔''
''ہو سکا تو کل کہیں ملیں گے مگر برساتی ضرور خرید لینا۔ یہاں اس وقت بھی خاصی بارش ہو رہی ہے۔''
''باہر سے آنے والی کسی بھیگی بلی کو دیکھ کر بتا رہے ہو یا خود باہر نکلے تھے؟''
''یہ آپ بیتی ہے۔ خود بھیگ کر آیا ہوں اور اب کراچی بات کروں گا۔''
''محتاط رہنا۔ پورا شہر ہل کر رہ گیا ہے۔ تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟''
''اس وقت بے حال بلکہ بے سدھ ہے اور پوری طرح قابو میں آ چکا ہے۔ یہاں آنے کا ایک مقصد تو شاید پورا ہو ہی جائے گا۔ وہ مشروط طور پر واپس جانے پر آمادہ ہے ورنہ اس کے دماغ میں وہی منصوبہ تھا جو میں پہلے سے سمجھ رہا تھا۔ اول خان سے اسی بارے میں بات ہو گی۔''
''سب کو میری نیک تمنائیں پہنچا دینا۔ ہو سکے تو کوئی مجھ سے بھی بات کر لے۔''
''میں سمجھ رہا ہوں۔ تمہارا یہ پیغام سلطان شاہ کو دے دوں گا۔''
''کال آئے گی تو وہ ضرور بات کرے گا۔ تمہیں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔''
مشکل یہ تھی کہ ہم فون پر اتنے سلگتے ہوئے مسائل کے بارے میں بات نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

''یہ بیرون ملک کال تو نہیں تھی۔'' میرے فارغ ہونے پر ڈیوٹی پر موجود لڑکی نے کہا۔
''وہ اب ہو گی۔ یہ لوکل تھی۔'' میں نے ہنس کر کہا اور کریڈل سے انگلی ہٹا کر نمبر ملانے لگا۔
''تمہارا نمبر مل جائے تو میں ڈائل مقفل کر کے سونے جا رہی ہوں۔ صبح برٹش ٹیلی کام سے اس کال کا بل معلوم کر کے تم سے رقم لے لوں گی۔ تمہارا نام سلیم اکبر خان ہے نا؟''
''اسلم خان۔'' میں نے نمبر ملاتے ملاتے بے ساختہ اس کی تصحیح کی۔
''حیرت ہے!'' اس نے چونک کر میز پر پڑا ہوا رجسٹر سنبھالتے ہوئے کہا'' ریکارڈ پر تو سترہ نمبر کمرا سلیم اکبر خان کے نام پر ہے پھر تم کیسے وہاں پہنچ گئے۔''
آخری ہندسہ بھی ڈائل کر کے میں نے فون بند کر دیا'' رجسٹر میں دماغ سوزی نہ کرو۔ سلیم اکبر اوپری منزل کے ایک کمرے میں ایلیزا نامی پولش لڑکی کے کمرے میں رہتا ہے۔ یہ کمرا اس نے آج ہی میرے لیے بک کرایا ہے مگر ریکارڈ میں اسی کے کوائف لکھے گئے ہیں۔''
''غیر ملکی سیاحوں کے بارے میں یہاں کے ضابطے بہت سخت ہیں۔ پتا نہیں یہ کس کی غلطی ہے۔'' وہ رجسٹر کے متعلقہ صفحے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی'' اس وقت سلیم اکبر خان عملاً ہوٹل کے دو کمروں میں رہ رہا ہے جب کہ تم کہیں بھی نہیں ہو۔''
''یہ غلطی نہیں، اسے تم رعایت کہہ سکتی ہو۔ سلیم اکبر اس ہوٹل کا پرانا گاہک ہے۔'' میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی نیت سے کہا'' تمہاری مالکہ نے میرا کمرا بھی اسی کے نام لکھ لیا ہے۔''
''اوہ! یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ دراصل اس ہوٹل میں آج میرا پہلا ہی دن ہے۔ کچھ بھی ہو، یہ ضابطے کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ میں صبح مسز رینالڈ سے بات کروں گی۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی الجھن ضابطے سے زیادہ فون بل کے بارے میں تھی۔ رقم سلیم اکبر دے گا یا میں اس کی ذمے داری قبول کرلوں گا۔

''مسز رینالڈ سے ضرور بات کرلینا۔ اب میں دوبارہ نمبر ملا رہا ہوں۔ فی الحال تم یہ رکھ لو۔'' اس سے بات کرتے ہوئے میں نے پچاس پاؤنڈ کا ایک نوٹ اس کے حوالے کردیا ''فون بل کاٹ کر بقیہ رقم صبح لوٹا دینا۔ یہ میں تمہاری تسلی کے لیے دے رہا ہوں۔''

''شکریہ!'' اس نے بلا تامل نوٹ لے لیا ''لمبے فاصلے کی فون کال بعض اوقات اس سے بھی زیادہ مہنگی ثابت ہوتی ہے۔ ایک دن کی ملازمت میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی۔''

''ابھی دو بجنے میں کافی دیر ہے۔ تم کال ختم ہونے پر بھی حساب کتاب کرسکتی تھیں۔''

''سب مہمان اندر آچکے ہیں۔'' اس نے خالی کی بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''مجھے سخت نیند آرہی ہے۔ تم بھی آگئے ہو تو اب نیند کو روکنا میرے بس سے باہر ہے...... ایسا نہ ہو کہ صبح ناشتے میں دیر ہو اور مجھے نوکری سے جواب مل جائے۔ تم بھی صبح فون کرسکتے تھے۔''

''صبح مطلوبہ آدمی نہیں ملے گا۔'' میں نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا ''پچاس پاؤنڈ تمہاری جیب میں ہیں۔ اب اس بحث کو ختم ہوجانا چاہیے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نمبر ڈائل کرکے سلسلہ ملنے کا انتظار کررہا تھا۔ طویل سکوت کے بعد کراچی میں میرے فلیٹ کے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ پھر دوسری گھنٹی بجی۔

اول خان سحر خیز آدمی تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ صبح کے ساڑھے چار بجے فون کے قریب موجود ہو۔ تیسری گھنٹی پر سلطان شاہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کیا حال ہے؟ میں لندن سے اسلم بول رہا ہوں۔'' میں نے خوش ہوکر کہا۔

گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتے ہی لڑکی نے ڈائل لاک کرکے میری طرف ہاتھ لہرایا اور سونے کے لیے چل دی۔ وہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ وہ بیٹھی بھی رہتی تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ وہ اردو میں ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔

''اوہ۔ خیریت تو ہے۔ تمہیں اس وقت فون کی ضرورت کیسے پیش آگئی؟'' صبح کے اولین لمحات میں میری آواز پہچان کر سلطان شاہ کی آواز سے نیند کے اثرات کافور ہوگئے تھے۔

''اگر اول خان موجود ہے تو اسے جگادو۔ مجھے اس سے اہم بات کرنی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ غزالہ کہاں ہے؟ کیا اس کے کمرے میں انسٹرومنٹ نہیں ہے؟''

''وہ خراب ہوگیا ہے۔ ویسے غزالہ بھی دروازے پر آگئی ہے...... لو تم اول خان سے بات کرلو۔''

شاید فون کی گھنٹی اور پھر سلطان شاہ کی آواز سے اول خان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''اگر تمہارے ذہن پر نیند کا خمار نہ ہو تو مجھے کچھ کہنا ہے۔'' اول خان کی آواز سن کر میں نے کہا۔

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ اپنی بات شروع کرنے سے پہلے یہ سن لو کہ تمہارے دونوں مہمان آج صبح کراچی سے روانہ ہورہے ہیں۔ اگر ان کا راستے میں رکنے کا پروگرام نہ ہوا تو وہ شام تک لندن میں ہوں گے اور پھر تمہاری مصروفیت شروع ہوجائے گی۔''

''مصروفیت شروع ہوچکی ہے۔ یہ اچھا ہے کہ وہ آج ہی نکل آئیں گے مگر سلیم کے بارے میں معاملہ گمبھیر ہے۔ دفتر کی سیل نہ ٹوٹی تو وہ پاکستان کا رخ نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پاکستان واپس آنے کا موقع دو۔ وہ لاعلمی میں خطرناک کھیل کھیلتا رہا ہے۔''

''تم جیسا چاہو گے، ہوجائے گا۔ یہاں جال تیار ہوگا۔ وہ آگیا تو پھر اسے نقشوں سمیت رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔ کیا یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آجائے گی کہ اسے گھیرا جارہا ہے۔''

''میں ایک اتفاقی دوست بن کر سیل کھلوانے کی کوشش کررہا ہوں' اس کے فرشتوں کو بھی اصل معاملے کی ہوا نہیں لگی ہے۔ اس نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ مدن کے غائب ہونے سے خوف زدہ ہوکر پاکستان سے فرار ہوا تھا اور اب اس کا دفتر عتاب کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سیل کھل گئی تو اسے کاغذات اور نقشوں کی نقلیں تلف کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ کاغذی خانہ پری کے بعد آج سیل ہٹوادی جائے گی مگر اس کا منیجر حراست میں رہے گا۔ کہانی کچھ یوں بنانی پڑے گی کہ چوری چکاری منیجر کررہا تھا۔ فرم کا ان غیر قانونی دھندوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے دفتر مالکان کو واپس کیا جارہا ہے۔''

''ویری گڈ...... وہ خود بھی یہی کہانی لے کر پاکستان پہنچے گا۔ میں اس سے یہی کہوں گا کہ میں نے اپنا کام کرلیا ہے۔ کام ہونے یا نہ ہونے کا انحصار اس کے مقدر پر ہے۔ خوش خبری اسے اپنے ذرائع سے ہی ملنی چاہیے۔ اس کام میں پولیس والے کچھ پیسے بنالیں تو اور بہتر ہوگا۔ سارا چکر حقیقی معلوم ہوگا۔''

اول خان کی ہنسی کے ساتھ آواز آئی ''ہماری ہدایت پر رشوت ستانی کی فرمائش بہت عجیب ہے۔ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ چاہو تو میں ہوٹل فون کرکے تمہیں کام پورا ہونے کی اطلاع دے دوں۔''

''میں اب وہاں نہیں ہوں' روزی وہاں منتقل ہوگئی ہے۔ میں ایک چھوٹے سے مرکزی ہوٹل میں ہوں جہاں فون کرنے یا سننے کے لیے سیڑھیاں اتر کر کاؤنٹر پر آنا پڑتا ہے۔''

''پھر وکرم تم سے کہاں رابطہ کرے گا؟'' اول خان کے اس بے ساختہ سوال نے مجھے چکرا کے رکھ دیا۔ اپنے چکر میں الجھ کر اس اہم ترین نکتے کو میں یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔

یہ ظاہر تھا کہ اول خان نے احتیاط کے طور پر بدری ناتھ کے لیے وکرم کا پرانا نام استعمال کیا تھا۔

''اس کے آنے کی اطلاع مل گئی ہے تو اس بارے میں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔'' میں نے پرفکر لہجے میں کہا ''تم میرا نیا نمبر لکھ لو اور ہاں، ذرا ماسٹر رابرٹ ہوٹل فون کرکے روزی سے بات کرلینا۔ وہ تم لوگوں کی آواز سننے کو ترسی ہوئی ہے اور بالکل تنہا ہے۔''

''ہوٹلوں کا یہ ہیر پھیر میری سمجھ سے باہر ہے۔'' اول خان ایک گھاگ آدمی تھا اور اپنے شعبوں میں اڑتی چڑیاں کے پر گن لینے کا وصف رکھتا تھا۔ اس نے میری باتوں سے لندن میں گڑبڑ کی بو سونگھ لی تھی۔

''یہ باتیں پھر کسی وقت ہوں گی۔'' میں نے موضوع بدلنے کے لیے جلدی سے کہا ''یہاں کی فکر مت کرو۔ موقع نکال کر میں کسی پبلک بوتھ سے بات کروں گا تو تمہیں کچھ اچھی خبریں سناؤں گا۔''

''یہاں بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' مجھ سے چھپانے کے باوجود اول خان اپنی بعض پریشانیوں کے اظہار پر مجبور تھا ''وہ نادرہ کے گھر پر بھیجی جانے والی فضائی مہم کی مکمل ناکامی پر سخت برہم تھا۔ میرے آدمی نے اپنے لاسلکی آلے پر ہونے والی اس کی اور وکرم کی جو باتیں سنی تھیں ان کی رپورٹ ملنے پر مجھے قوی اندیشہ تھا کہ وکرم کا پروگرام ٹھپ ہوکر رہ جائے گا اور تمہیں واپس آنا پڑے گا مگر وہ آج نکل رہے ہیں۔ میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ اس پورے قصے میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہوچکی ہے۔''

''تم کس قسم کی گڑبڑ کا اندیشہ محسوس کررہے ہو؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوتا تو تمہیں ضرور بتاتا۔ ہوسکتا ہے کہ علی شیر کے غائب ہونے کی خبر سے اسے شبہ ہوا ہو۔ وکرم کا ساتھی راجن بھی اسے دغا دے سکتا ہے۔

اسے اندر کی بہت سی باتیں معلوم ہیں۔‘‘

’’ایسی خطرناک باتیں مت کرو۔ اگر راجن کو لاسلکی آلے پر قبضہ کرکے اپنے بڑے سے بات کرنے کا موقع مل چکا ہے تو سمجھ لو کہ وقت کا پہیہ الٹا چل پڑے گا۔ اس نے بتا دیا ہوگا کہ علی شیر کو یرقان نہیں ہوا تھا۔ وہ اس سے ملنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے علم کے مطابق علی شیر شمالی علاقوں کی طرف نکلا ہے۔ راجن نے علی شیر کی کسی دوست کے گھر منتقلی کی رپورٹ دی ہوگی۔ یہ تضاد اس کے علم میں آچکے ہیں تو کھیل ختم سمجھو۔‘‘

’’ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو۔‘‘ اول خان نے میری تشویش کا اندازہ لگا کر تشفی آمیز لہجے میں کہا ’’مگر یہ امکانات اپنی جگہ پر بہت قوی ہیں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم محتاط رہو۔‘‘

’’میں تو پہلے ہی بہت محتاط ہوں۔ ہوٹل کی تبدیلی اسی احتیاط کا نتیجہ ہے۔‘‘

دوسری طرف چند ثانیوں کے لیے خاموشی چھا گئی جیسے اول خان زبان کھولنے یا نہ کھولنے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔ آخر اس نے جھجکتے ہوئے کہا ’’اگر وکرم شبہات کی زد میں آگیا ہے تو اس پر شکاری کتے مامور ہو سکتے ہیں جو دور رہ کر اس کا پیچھا کرتے رہیں اور پھر اس کے ذریعے اصل ہدف تک پہنچنے کی کوشش کریں......تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟‘‘

’’اچھی طرح۔‘‘ میں نے اپنے معدے میں پڑتی ہوئی گرہوں کو بھول کر کہا ’’بظاہر علی شیر ان کا ہدف ہوگا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وکرم کو چارا بنا کر بڑی مچھلی کا شکار کھیلنے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔‘‘

’’بالکل......مجھے بالکل یہی خوف ہے۔‘‘ ریسیور پر اول خان کی اضطراری آواز ابھری۔

’’تم بے فکر رہو۔ اب میرے ذہن میں آنے والے وقت کا نقشہ ذرا صاف ہو گیا ہے۔ میں اسی کے مطابق اپنا لائحہ عمل بناؤں گا۔ یہ اچھا ہوا کہ میں وکرم کے پہنچنے سے پہلے ہوٹل چھوڑ چکا ہوں۔ اس کے پاس میرا کوئی سراغ موجود نہیں ہونا چاہیے۔ وہ آئے گا تو میں خود ہی اس سے رابطہ کروں گا۔‘‘

’’یہ معاملات تم مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں ہر بات صاف صاف بتا دی ہے۔‘‘ ایک گہرے سانس کے بعد اس کی آواز ابھری ’’چاہو تو تم اب بھی لوٹ سکتے ہو۔‘‘

’’صورت حال واضح ہونے سے پہلے میں ایسا بزدلانہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔‘‘ اس وقت تک میرے وجود پر طاری ہونے والی غیر ارادی اعصابی لہر معدوم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ’’کل پرسوں کے اخبارات وغیرہ میں عالمی خبروں پر نظر رکھو گے تو بعض باتیں خود بخود تمہاری سمجھ میں آجائیں گی۔ میرے لیے انہیں دہرانا ممکن نہیں ہے......اب ذرا سلطان شاہ سے بات کرا دو۔‘‘

’’ایک خبر پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔‘‘ اول خان کی تحیر زدہ آواز آئی۔ ’’رات گیارہ بجے کی خبروں میں لندن کے ایک خاص جنوبی علاقے میں کسی سفارتی جوڑے کے قتل کی ابتدائی خبر آئی تھی......اوہ خدا! اسلم! شکاریوں کے غول کے سامنے بھیڑیا بن کر جھپٹنے کی کوشش مت کرو۔ بھیڑ بن کر کسی کونے میں دبک کر مناسب وقت کا انتظار کرو۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیوں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلانے کی کوشش کر رہے ہو۔‘‘

’’جذباتی نہ بنو!‘‘ میں نے سرد آواز میں کہا ’’دنیا بھر سے ہر روز سیکڑوں دہشت گردیوں کی خبریں آتی ہیں۔ ہم کس کس کو روکیں گے......؟ ہر الزام کسی ایک نام پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ تم اخبار دیکھتے رہو۔ شاید مایوسی کی فضاؤں میں اچھی خبریں بھی پڑھنے میں آجائیں۔‘‘

’’تم خودسر ہو۔‘‘ اول خان کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی پھر سلطان شاہ لائن پر آگیا۔

’’تم سفری دستاویزات لینے گئے تو اس کا کیا رویہ تھا؟‘‘ میں نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

’’خشک، سرد اور سپاٹ۔ بالکل پہلے جیسا۔ میں مہر بند لفافہ لے کر آ گیا۔‘‘

’’تعاقب؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’کوشش کی گئی تھی۔ میں ٹیکسی میں گیا تھا۔ واپسی پر ایمپریس مارکیٹ میں جا گھسا۔ وہاں کی بھول بھلیوں سے نکل کر میں ایک رینگتی ہوئی بس میں چڑھ گیا۔ پاپوش نگر میں بس سے اترا تو میدان صاف تھا۔ میں گھر لوٹ آیا۔ لفافہ منزل تک پہنچانے کا کام اول خان نے کیا تھا۔‘‘

’’میں نے اول خان سے کہا ہے۔ تم سے بھی کہہ رہا ہوں کہ میرے دیے ہوئے نمبر پر روزی برڈ سے بات کر لینا۔ وہ بری طرح تنہائی کا شکار ہے۔ یہ ضروری ہے۔‘‘

’’پھر تم کہاں ہو؟‘‘ میری ہدایت نے غالباً اسے چونکا دیا تھا۔

’’ایک بار بتا چکا ہوں کہ ہم الگ الگ رہ رہے ہیں۔‘‘ میں نے سختی سے جواب دیا ’’بار بار ایسے احمقانہ سوال مت کیا کرو جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔‘‘

’’تمہیں روزی کی تنہائی کی فکر ہے۔‘‘ میرے پھٹکارنے پر وہ دبنے کے بجائے برہم ہو گیا ’’کچھ اس کی بھی پروا ہے جو اول خان کی باتیں سن کر منہ میں دوپٹا ٹھونسے بلک رہی ہے۔ تم کیا کرتے پھر رہے ہو......؟ کیا چاہتے ہو......؟ یہ عورت ان ہی دھڑکوں میں ایک روز سسک سسک کر مر جائے گی۔‘‘

’’یہ مقدرات ہیں جو اٹل ہوتے ہیں۔‘‘ میں نے دل پر جبر کر کے سپاٹ لہجے میں کہا ’’مصائب کسی کا پیچھا کرنے لگیں تو وہ تحت الثریٰ میں بھی ان سے نہیں بچ سکتا۔ میری ساری محبتیں اور ہمدردیاں رونے والی کے لیے ہیں۔ میں ہزاروں میل دور بیٹھ کر اس کی سسکیاں نہیں سن سکتا۔ میرا پیار اسے پہنچا دینا۔‘‘

ریسیور رکھتے ہوئے میرے کان میں ایک دبی دبی سسکی کی آواز آئی۔ شاید سلطان شاہ نے میری بات شروع ہوتے ہی ریسیور غزالہ کو دے دیا تھا اور وہ سانس روکے میری باتیں سنتی رہی تھی۔ میرے آخری فقرے پر شاید اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور اس کی ایک سسکی میرے کانوں تک پہنچ گئی۔

کریڈل سے پہلے میرا ہاتھ نہ رک سکا۔ مشینی انداز میں میں فون بند کر چکا تھا۔ غزالہ کی آواز نے میری روح تک کو تڑپا کر رکھ دیا اور میں اس کو دلاسا دینے کے لیے بے چین ہو گیا مگر فون بے جان تھا، ڈائل مقفل تھا اور فون کی رکھوالن چابی لے کر سونے کے لیے جا چکی تھی۔

میں خاموشی سے سر جھکا کر زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک سناٹا سا گونج رہا تھا۔ اول خان سے ملنے والی خبروں اور پھر غزالہ کی موہوم سی آواز نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ماؤف کر دی تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر میں نڈھال سا ہو کر بستر پر گر گیا۔

پتا نہیں میں کب تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نرم سا بستر اس وقت مجھے کانٹوں بھری سیج کی طرح محسوس ہو رہا تھا پھر کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ یہ سچ ہے کہ نیند بڑی ظالم شے ہے۔ آتی ہے تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔

پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بھرے ہوئے ریوالور کی مہیب آہنی نال میری کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی ہو۔ دھماکا ہوتے ہی دہشت سے میری آنکھ کھل گئی۔

اندھیرے کمرے میں میرے سوا کوئی سایہ تک نہیں تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ خشک اور صحیح سلامت تھی۔ بس کوئی میرے کمرے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میرے ذہن کے بے نام گوشوں میں پنجے گاڑے ہوئے اندیشوں نے عالم خواب میں اسی آواز کو فائر کے دھماکے میں بدل دیا تھا۔

میں بستر پر پڑا اینڈتا رہا پھر باہر سے سلیم کی دبی دبی آواز آئی۔ ’’یار اب اٹھ بھی جاؤ......دس بجے کے

بعد یہاں ناشتا نہیں ملتا۔ کب تک پڑے سوتے رہو گے؟"

سلیم کی بے وقوفی پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ گہری نیند سوئے ایک شخص کو جگانے کی کوشش میں مصروف تھا اور لمبے لمبے ڈائیلاگ بول رہا تھا جیسے سونے والا وہ سب سن اور سمجھ رہا ہو۔

چند ثانیوں بعد میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ راہداری میں موجود تھا۔ اس کے چہرے سے بدحواسی مترشح تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی رسٹ واچ میرے سامنے کردی "ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ میرے ساتھ ایلیزا بھی تمہارے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہے۔ کب ناشتا کرو گے؟"

ناشتا صرف ایک بہانہ تھا۔ اس کے ذہن پر اس کا اپنا مسئلہ سوار تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ مجھے کراچی سے رابطہ کرنے پر مجبور کرتا مگر میں نے اسے آنکھ مار کر کہا "تم تہہ خانے میں پہنچ کر ناشتا منگواؤ، میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر وہاں آتا ہوں۔"

رات کی بسیار نوشی کی وجہ سے اس کے پپوٹے متورم تھے، چگی داڑھی سے جھانکتے ہوئے رخساروں پر ہلکی سی سرخی اُمڈ آئی تھی۔ اس کے سوا وہ مے نوشی کے اثرات سے آزاد نظر رہا تھا۔

"جلدی اتر آنا۔ کراچی ہم سے چار گھنٹے آگے ہیں۔ وہاں بات کرنے میں دیر کی تو آج کا دن ضائع ہو جائے گا کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔" وہ اس قدر چھچھورا تھا کہ واپس جاتے جاتے بھی دل کی بات کو زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے اسی حلیے میں لے جا کر فون کے پاس کھڑا کر دیتا۔

اسے روانہ کرنے کے بعد میں اپنا تولیا اور صابن لے کر نچلی لینڈنگ پر بنے ہوئے غسل خانے میں جا گھسا جو کمرے کی طرح خاصا تنگ تھا مگر وہاں شاور اور پردے میں گھرے ہوئے باتھ ٹب سمیت ہر سہولت میسر تھی۔ برابر کے دونوں باتھ روم زیر استعمال تھے، غسل خانہ سلیم کی پیش گوئی کے مطابق خالی تھا۔

ریلنگ پر سمٹا ہوا پردہ پھیلا کر میں نے گرم شاور کھولا تو پانی کی آواز کے ساتھ ہی برابر کے کسی باتھ روم میں موجود کسی خاتون نے دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ شائستہ لوگ ایسی مصروفیات سے عموماً بے آواز گزر جاتے ہیں۔ لیکن وہاں مبارزت طلبی کے سے تیور تھے۔ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ میں غسل کر رہا تھا اور جواب آں غزل کے طور پر کوئی بھی کارروائی کر سکتا تھا۔ جس کے لیے چھت سے نیچی مشترکہ دیواریں دعوت انگیز تھیں مگر وہ مقام ایسی سرگرمیوں کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس خاتون کی بد ذوقی پر کڑھتا ہوا، میں نیم گرم پانی کی تیز دھاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور مجھے پتا بھی نہ چل سکا کہ سروں کی ملکہ نے اپنے مرغوب ٹھکانے کو کب خیر باد کہا۔

لباس تبدیل کر کے میں جلدی جلدی نیچے پہنچا تو دیر ہو جانے کے باوجود وسیع تہہ خانے کی بیشتر میزیں رنگ رنگ کے لوگوں سے آباد تھیں۔ سیر و تفریح کے دنوں میں بھی آدمی کو صبح سویرے اٹھنا پڑے تو گھر اور دفتر کا تصور کر کے طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے جو سارے موڈ کو غارت کر دیتا ہے۔ دیر سے آنے والے صحیح معنوں میں سیاح تھے اور اس رمز سے واقف تھے۔

"کراچی کب فون کرو گے؟" میرے بیٹھتے ہی سلیم نے پھر اپنا سوال داغ دیا۔

مجھے غصہ آ گیا "آؤ پہلے فون کر لیتے ہیں، ناشتا بعد میں ہوتا رہے گا۔"

مجھے اٹھتا دیکھ کر سلیم کے ساتھ ایلیزا بھی بری طرح بوکھلا گئی۔ اردو اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح ہم دونوں کو باری باری دیکھے جا رہی تھی۔

"تم برا مان گئے۔" سلیم خفت آمیز ہنسی کے ساتھ مجھے دوبارہ بٹھاتے ہوئے بولا "میرا مطلب تھا کہ میرا کام یاد رکھنا۔ فون تو دس پندرہ منٹ بعد بھی کیا جا سکتا

ہے مگراتنی دیر بعد ناشتا نہیں ملے گا۔“

وہ انتہائی ڈھیٹ اور خودغرض شخص تھا۔ میرے بھڑکنے کے باوجود اس نے دس پندرہ منٹ کا ذکر کر کے مجھے دی جانے والی مہلت کا تعین کر دیا تھا۔ میں نے از خود اسے کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے دو ابلے ہوئے انڈوں، ڈبل روٹی کے سنکے ہوئے پارچوں، مکھن اور چائے پر مشتمل سرکاری یعنی ہوٹل کے کرائے میں شامل ناشتے سے شغل کرتے ہوئے دیکھا کہ رات والی لڑکی اپنے کپڑوں پر سفید ایپرن باندھے یوں میزوں کے درمیان دوڑتی پھر رہی تھی جیسے اس کی پتلی پتلی ٹانگوں میں بجلی سی بھری ہوئی ہو۔

پیالیوں میں گرم گرم چائے اور کافی انڈیلتی ہوئی وہ ہماری میز پر آئی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چائے اور کافی سے بھرے ہوئے دو جگ تھے۔ پر جوش ہیلو کے ساتھ اس نے مجھے آگاہ کیا کہ میری کال کا بل باسٹھ پاؤنڈ بنا تھا جو مجھے ناشتے کے بعد ادا کرنا تھا۔

وہ گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اس لیے لڑکی کے جانے کے بعد ایلیزا نے حیرت سے پوچھا ”اتنی لمبی اور مہنگی فون کال تم نے کس خوش نصیب لڑکی کو کی تھی؟“

”لڑکی نہیں، وہ خوددار مونچھوں والا ایک مرد تھا۔“ میں نے سلیم پر ملامت آمیز نظریں ڈالتے ہوئے جواب دیا ”اور کام تمہارے بوائے فرینڈ کا تھا۔ یہ بھی......“

”چھوڑو!“ سلیم نے میری بات درمیان سے ہی اچک لی۔ ”اسے کیوں ساری بات بتا رہے ہو۔ کیا تم نے رات کو ہی کراچی بات کرلی تھی؟“ یہ فقرے اس نے اردو میں ادا کیے تھے۔

”شراب پی کر تم تو کسی مگرمچھ کی طرح پھیل گئے تھے مگر مجھے اپنے وعدے کا پاس تھا۔ تمہارے کام کے لیے مجھے اپنی رات کالی کرنی پڑی کیونکہ میرا دوست صبح سات بجے گھر سے دفتر کے لیے نکل جاتا ہے۔“

”کمال ہے کہ پاکستان میں بعض بڑے افسر اب بھی اتنے فرض شناس ہیں۔“ اس نے تعجب سے کہا ”رقم سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بات لمبی ہوئی ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ نتیجہ کیا رہا؟“

”وہ فرض شناس ہی نہیں، ایمان دار بھی ہے۔ وہ مان ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی ملازم اپنے مالک کی مرضی کے بغیر کاروباری دھاندلی یا بے ایمانی کرسکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ اپنی بیرون ملک مصروفیات کی وجہ سے تم اپنے منیجر کو اختیارات دینے پر مجبور ہوئے اور اس نے بالا ہی بالا گل کھلانے شروع کر دیے......“

”واہ......!“ سلیم بے اختیار بول پڑا ”تم بہت دور کی کوڑی لائے۔ یہ جملے میں اپنے بیان میں بھی ڈال دوں گا...... تم نے ضرور اسے قائل کرلیا ہوگا۔“

”وہ میری فراہم کی ہوئی معلومات کی بنیاد پر اپنی سی کوشش کرے گا۔ اوپر سے کوئی دباؤ نہ ہوا تو سیل کھلوانے میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ بات ہاتھوں سے نکل گئی تو اللہ کی مرضی۔ ایسی صورت میں بھی چالان اس طرح بنے گا کہ کورٹ سے تمہارے حق میں فیصلہ مل جائے۔“

سلیم کا چہرہ لٹک گیا۔ ”یہ تو کوئی پکی بات نہ ہوئی۔ وہ بہانہ کر دے گا کہ بات اوپر جا چکی تھی۔“

”میں اسے جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ دو تین دن میں نتیجہ سامنے آجائے گا۔“

”آج کچھ نہیں ہوسکے گا؟“ سلیم کی مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور میں خود بھی اسے کوئی واضح یقین دہانی کرانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے ٹریپ کرنے کا وہی فول پروف طریقہ تھا۔

”آج کا اس نے ذکر نہیں کیا۔“ میں نے چائے کی پیالی سے آخری گھونٹ لے کر کہا۔

”کام بن گیا تو رقم کتنی خرچ ہوگی؟“ اس نے ڈھیلی ڈھالی آواز میں پوچھا۔

”فون کے باسٹھ پاؤنڈ کے سوا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ اس میں سے پچاس پاؤنڈ میں پیشگی ادا کر چکا ہوں۔ بارہ پاؤنڈ کا قرضہ باقی ہے۔“

”یہ پوری رقم میں دوں گا۔ ویسے مجھے تمہاری باتوں سے ناامیدی جھلکتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ گہرے تعلقات ہوں تو آدمی دو منٹ میں اپنی بات منوالیتا ہے۔ تم نے نہ جانے کتنی دیر تک اس سے مغز زنی کی ہوگی۔“

”میں نے اپنے ترکش کا ہر تیر چلا لیا۔ اب بات تمہارے نصیب کی ہے۔ میری پوری رات کالی ہوئی، اس وقت تم نے میری نیند خراب کی۔ اب تمہاری سزا یہ ہے کہ باہر سے میرے لیے دو تین اخبارات لاؤ، کمرے سے جھوٹے برتن اٹھواؤ اور کمرا صاف کرو تا کہ میں اپنی نیند پوری کرسکوں۔“

”اخبار میں لے آؤں گا۔“ اس نے فرماں برداری سے کہا۔ ”اوپر جاؤ گے تو ہاؤس میڈ کمرا صاف کر چکی ہوگی۔ میں نے اسے پہلے ہی ہدایت کر دی تھی۔ جب تمہیں سونا ہے تو تم دو تین اخباروں کا کیا کرو گے۔ یہاں کے اخبار بہت موٹے ہوتے ہیں۔“

”میں خواب میں بھی اخبار بینی کرنے کا عادی ہوں۔ لانا ہو تو تین لانا ورنہ میں خود چلا جاتا ہوں۔“

”لے آؤں گا۔“ اس نے جلدی سے کہا ”تم تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہو۔“

وال کلاک کی سوئیاں دس پر پہنچتے ہی ڈائننگ ہال میں ایک بزر بجنے لگا اور لوگ کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر اٹھنے لگے۔ ناشتے کے وقت کے خاتمے کا وہ اعلان سب کے لیے قابل فہم ثابت ہوا تھا۔

سلیم نے کچن کی کھڑکی پر جا کر رات والی لڑکی کو فون کال کی بقیہ رقم ادا کی۔ اوپر پہنچے تو ہوٹل کی مالکہ مسز رینالڈ بنفس نفیس استقبالیہ میز پر موجود تھی۔ سلیم نے خوشامدانہ انداز میں کھیسیں نکال کر بہت گرمجوشی سے اس سے دعا سلام کی پھر میرا تعارف کرایا۔

رسمی مزاج پرسی کے بعد مسز رینالڈ نے فون رجسٹر دیکھ کر سلیم کو بتایا کہ دس منٹ پہلے اس کے لیے پاکستان سے فون آیا تھا۔ پیغام دیا گیا تھا کہ وہ اپنے گھر بات کرلے۔

”یہ کیا ہوسکتا ہے......؟ میرے دل کی دھڑکنیں اچانک تیز ہوگئی ہیں۔“ سلیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں کہا۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ میں نے شانے اچکا کے بے پروائی سے کہا ”ہوسکتا ہے کہ تمہارے یہاں جڑواں بچوں کی ولادت ہوئی ہو۔ یہ تو تم ہی جان سکتے ہو کہ اپنی بیوی کو کس حال میں چھوڑ کر آئے تھے۔“

میری بات پوری ہونے سے پہلے اس کا منہ بن گیا ”آج تم ہر بات کا ٹیڑھا جواب دے رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات کی بے خوابی نے تمہیں چڑچڑا کر دیا ہے۔“

”میرے لیے اخبار لانے کے بعد کراچی فون کر کے یہی سوال کرو گے تو تمہیں درست جواب مل سکے گا۔“

”اخبار......اخبار!“ وہ بڑبڑاتا ہوا ایلیزا کی طرف پلٹا ”ذرا دوڑ کر کسی بک اسٹال سے دو تین اخبار لے آؤ۔ میں گھر فون کیے لیتا ہوں۔ بعض لوگوں کو اخبار کے بغیر قبض ہو جاتا ہے، اسلم کا ناشتا ہضم نہیں ہوگا۔“

”او کے۔“ وہ ہنس کر ایک ادا سے بولی ”آج تم دونوں کافی دیر سے لڑ رہے ہو۔ یہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا پرس جھلاتی ہوئی دروازے کی طرف چل دی۔

ہوٹل کی مالکہ خود میز پر موجود تھی۔ اس لیے فون کا ڈائل کھلا ہوا تھا۔

سلیم نے مسز رینالڈ کی اجازت سے انسٹرومنٹ سنبھالا تو میں دانستہ ٹہلتا ہوا ان دیوار گیر تصاویر کی طرف چلا گیا جو زینوں کے ساتھ والی دیوار پر آویزاں تھیں۔

ابھی میں دوسری ہی تصویر دیکھ رہا تھا کہ اسلم تقریباً

دوڑتا ہوا آیا اور سامنے آکر والہانہ انداز میں میرے پیٹ سے لپٹ گیا۔ اس کا قد مجھ سے کافی چھوٹا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے سینے سے لگالیا۔

”مبارک ہو، یار تمہارا دوست بہت گہرا نکلا۔“ وہ چڑھے ہوئے سانسوں میں وفورِ مسرت سے کہہ رہا تھا۔ ”اس نے تمہیں کوئی امید دلائے بغیر ایسا کرتب دکھایا ہے کہ میرے دفتر کی سیل کھل چکی ہے۔ میرے چچا نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ تم نے ایسا کام کیا ہے کہ میں زندگی بھر تمہارا غلام رہوں گا۔“

اس کے سانسوں کا زیر و بم اور دل کی تیز دھڑکنیں میں اپنے وجود پر محسوس کر رہا تھا۔ پھر آخری فقرے پر جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھرانے لگی تو میں نے اسے خود سے الگ کردیا۔

وہ ایک بے وفا اور بدنصیب انسان تھا جو خوش بختی کے تعاقب میں موت کے چنگل کی طرف بڑھنے والا تھا۔ اسے جس...... سرزمین نے عزت و دولت کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہوا تھا، وہ اسی سے بے وفائی کا مرتکب ہوکر مدن موہن جیسے میٹھے دشمن کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے میری ہمدردیاں جیت کر اپنی کھوئی ہوئی راہ سیدھی کرلی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں اسے اسی بھیانک جال کی طرف واپس دھکیل رہا تھا جس کی دہشت سے فرار ہوکر وہ لندن پہنچا تھا۔

وہ اپنے ملک کا دشمن تھا تو میں اس کے لہو کا پیاسا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں زیادہ دیر تک اسے اپنی آغوش میں لے کر اسے وہ محبت اور شفقت فراہم کرتا جس کا وہ سرے سے حق دار ہی نہیں تھا۔

”میں ابھی جارہا ہوں۔“ چند لمحوں کی خاموشی میں وہ اپنی قلبی رقت پر قابو پاکر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ بڑی خوش خبری سن کر اب لندن اور اس کی رنگینیوں سے میرا دل اچاٹ ہوگیا ہے۔“

”ابھی جارہے ہو تو کیا جہاز چارٹر کر کے جانے کا ارادہ ہے؟“ میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

”اس ٹکٹ پر سیٹ نہ ملی تو میں یہاں سے دوسرا ٹکٹ خریدلوں گا۔ میں آج یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ یہ اس طرف آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ٹکٹ استعمال ہوجائے گا۔“

اپنے ہولناک مستقبل سے بے خبر وہ شخص مہینوں بعد کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ میں نے اسے ٹٹولنے کی نیت سے پوچھا ”یہاں سے جاتے ہی تم ان کاغذات اور نقشوں کو تلف کردو گے؟“

”اللہ کے کرم اور تمہاری مہربانی سے مجھے یہ موقع ملا ہے تو میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ پہلی فرصت میں اس پلندے کو پلاسٹک کے تھیلوں میں ڈال کر کسی محفوظ جگہ دفن کردوں گا۔ میرے سوا کسی کو اس راز کا علم نہیں ہوگا۔ بس ایک بار وہ پلندہ میرے ہاتھ آنا چاہیے۔“

”اسے دفن کرکے تم کیا کروگے؟“ میں نے شدید حیرت کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”اگر مدن موہن لوٹ آیا اور اس نے ان کا مطالبہ کیا تو میں اس کے سامنے سرخ رو ہوجاؤں گا۔“ اس نے جذبات کی روانی اور خوشی کی فراوانی میں اپنا دل میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

وہ انکشاف سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ میں نے حقارت سے پوچھا ”اس کے سیاہ کرتوتوں سے واقف ہوجانے کے بعد بھی تم اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہوگے؟“

”تم نہیں جانتے۔“ وہ میرا بازو دباتے ہوئے گھگھیایا ”مدن موہن جیسے لوگ پکے بلیک میلر ہوتے ہیں۔ اب میں غور کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میں اسے بہت کچھ سونپ چکا ہوں۔ میری دعا ہے کہ وہ کہیں مر کھپ گیا ہو۔ وہ لوٹ آیا تو مجھے اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ اگر میں نے کاغذات اور نقشے دینے سے انکار کیا تو وہ میرے کاموں کا راز فاش کر کے مجھے رسوا اور برباد کردے گا۔“

”اپنی ذات کے لیے تمہاری یہ سوچ شاید درست ہو۔ تم نے یہ سوچا ہے کہ یہ کاغذات مدن موہن تک پہنچ گئے تو اس سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”نقصان ضرور پہنچے گا مگر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ ہمارے لیڈر اور حکمران عشروں سے اس ملک کو لوٹتے چلے آئے ہیں اور ملک کا کچھ نہیں بگڑا تو تھوڑے سے کاغذ اِدھر اُدھر ہونے سے کیا بگڑ جائے گا۔ میری مجبوری بھی تو دیکھو۔ میں اپنی بقا کی لڑائی لڑوں یا ملک کے لیے برباد ہوجاؤں؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”تم اپنی ذات کے خول میں سمٹے ہوئے ہو اس لیے تمہاری یہ سوچ درست ہے۔ ملک چلے یا نہ چلے تمہارا کاروبار چلنا چاہیے۔“

”خدا تمہیں خوش رکھے۔“ وہ میری زہریلی تائید کی روح کو سمجھے بغیر دعائیہ انداز میں بولا ”ہر سمجھ دار آدمی کی سوچ یہی ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ مدن موہن اب واپس نہ آئے۔ اگر وہ لوٹ ہی آیا تو مجھے زندہ رہنے اور عزت بچانے کے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا۔“

اس کی نئی قلابازی پر میرا خون کھول رہا تھا۔ جب وہ مصیبت میں گرفتار تھا تو مدن موہن پر لعنت بھیج کر پہلی فرصت میں ان کاغذات کو تلف کرنے کا ارادہ ظاہر کررہا تھا لیکن گردن سے پھندا نکلتے ہی اس نے اگر اور مگر کا سہارا لے کر ایک نئی منصوبہ بندی شروع کردی تھی۔

سخت اشتعال کے باوجود میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے سامنے تلخ نوائی اور برہمی کے اظہار کی صورت میں وہ میری طرف سے چوکنا ہوجاتا۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ میں ملک کے خیر خواہوں میں سے ہوں اس لیے آگے چل کر اس کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کردوں گا اور اسی ایک نکتے سے میرے اور اس کے درمیان کشیدگی کا آغاز ہوجاتا۔

اس وقت برداشت اور تحمل کے نتیجے میں اس کے اعترافات اور عزائم خود بخود میرے سامنے چلے آرہے تھے۔ یہ اس کے خلاف مکمل فردِ جرم تھی جس کی تصدیق کے لیے مزید کسی شہادت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

کمرے میں پہنچ کر سلیم نے مجھے ٹوک ہی دیا ”کیا بات ہے؟ بولتے بولتے تم اچانک خاموش ہوگئے۔ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“

”تمہاری باتیں چشم کشا اور حقیقت سے بہت قریب ہیں۔“ میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر کہا ”میں سوچ رہا ہوں کہ میں آج تک اپنی غلط سوچ کی وجہ سے خسارے ہی خسارے میں رہا ہوں۔ میرا راستہ تمہاری طرح صاف اور واضح ہوتا تو آج میں کہیں اور ہوتا۔“

”تمہارے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے۔“ اس نے پورے خلوص سے کہا ”تم نے میرے بارے میں جس وقت اپنے دوست کو فون کیا، میں اپنے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میں نے کھل کر تمہیں بتادیا تھا کہ اس چکر سے نکلنے کے لیے میں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔ ساکھ اور زندگی برقرار رہے تو آدمی دس بار بھی لاکھوں کما کر گنوا سکتا ہے۔ تم سے میری پرانی دوستی نہیں ہے۔ تم بہت آسانی کے ساتھ مجھے یقین دلا سکتے تھے کہ اس کام کے لیے تمہارے دوست دس پانچ لاکھ مانگ رہا ہے لیکن تم اتنے سادہ لوح ہو کہ تم نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ پوری بات جوں کی توں مجھے بتادی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر مجھے اس کا کوئی قلق نہیں ہے۔ جب میں تمہارے سمجھائے ہوئے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلوں گا تو ایسا کوئی موقع ضائع نہیں کروں گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب بھی تذبذب میں مبتلا ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”چند فقرے کسی آدمی کی فطرت نہیں بدل سکتے۔ یہ تبدیلی ذرا دیر سے رونما ہوتی ہے۔ اس وقت تم نے مجھے گہری نیند سے چونکایا ہے۔ میرے اندر کشمکش شروع ہوچکی ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ میرا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ میرا فیصلہ جو بھی ہو، اس پر تمہارے نظریات کی گہری چھاپ ہوگی۔“

وہ خوش ہوگیا۔ اس نے اپنی جیب سے اپنی فرم کا

وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ''یہ رکھ لو۔ کراچی لوٹو تو مجھ سے ضرور ملنا۔ تم نے موقع گنوا دیا ہے مگر میری طرف سے تم ایک بڑے انعام کے حق دار ہو چکے ہو۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتا لیکن تمہاری خدمت میں ایک حقیر نذرانہ ضرور پیش کروں گا۔''

فرم وغیرہ کا وہ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے سرسری نظر ڈال کر کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ میری واپسی سے بہت پہلے مکمل تباہی سے دوچار ہونا اس فرم اور اس کے مالک کا اٹل مقدر بن چکا تھا۔ ایلیزا اخبار لے کر آئی تو خاصی سراسیمہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک ہی اخبار تھا جو اس نے میرے سامنے ڈال دیا اور بولی ''کل ایشیائیوں کے علاقے میں دہرے قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔ اسٹال خالی ہو چکے ہیں۔ مجھے بس یہی ایک اخبار ملا ہے۔''

''قتل و خون روز ہوتے رہتے ہیں''۔ میں نے بے پروائی سے کہا ''اخباروں میں خوش گوار خبریں اور اچھی تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر دل خوش کرنا چاہیے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے اخبار کے پہلے صفحے پر نگاہ ڈالی تو چار کالم کی ذیلی سرخی کے ساتھ ساتھ آل میں ایک مشتبہ جوڑے کے پراسرار قتل کی خبر نمایاں تھی۔ میں نے اس خبر کو اہمیت دیے بغیر صفحے کا نچلا حصہ دیکھا تو وہ بھی اسی قتل کے بارے میں چھوٹی چھوٹی خبروں اور قیاس آرائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ویرا کے قول کے مطابق اس واردات نے اخبارات میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

''میں نے پاکستان میں بھی اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔''سلیم نے فخریہ لہجے میں بتایا ''اشتہاروں سے بچنے والی جگہ میں وہی خبریں اچھالی جاتی ہیں جو خوف و ہراس، دہشت اور سنسنی پھیلا سکیں۔ اخبار آ ہی گیا ہے تو اب تم دونوں اسے چاٹو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے آنکھ مار کر اردو میں بولا ''میری طرف سے یہ لڑکی پہلا تحفہ ہے۔ میں سیٹ کنفرم کرانے جا رہا ہوں۔ آج نہیں تو کل تک میں یہ شہر چھوڑ دوں گا۔''

پھر وہ ایلیزا سے مخاطب ہو گیا ''میں.... تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ اسلم خان میرا دوست اور محسن ہے۔ تمہیں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا ہے۔ کراچی میں کچھ ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ مجھے جلد از جلد لندن سے واپس ہو گا۔''

''اوہ!'' ایلیزا کے دہانے سے ایک بے ساختہ آواز برآمد ہوئی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اب آگے کے سفر میں میرے ساتھ نہیں ہو گے؟''

''اسلم خان کو تم مجھ سے بہتر رفیق سفر پاؤ گی'' سلیم نے ایلیزا کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی اور پھر تیزی سے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو۔ سونا چاہو تو میں ذرا شہر کا چکر لگا لوں گی۔'' ایلیزا نے موقع کی مناسبت سے کہا۔ وہ چہرے سے ہی ذہین اور معاملہ فہم معلوم ہوتی تھی۔

''تم گھوم پھر آؤ۔ میں تمہاری تفریح میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ میرا مفہوم سمجھ کر وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی میں چھلانگ مار کر بستر سے اترا' دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور پھر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ دہرے قتل کی تفصیلی خبریں پڑھنے سے پہلے میرا ارادہ متعلقہ خبروں کی سرخیاں دیکھنے کا تھا۔ ورق پلٹ کر میں نے شہری صفحہ کھول لیا۔

وہ صفحہ سامنے آتے ہی حاشیے میں چھپی ہوئی ایک خبر پر میری نظریں گڑ کر رہ گئیں۔

''ٹیکسی ڈرائیور جو قاتل کو جانتا ہے۔'' یہ اس خبر کی سرخی تھی۔ میں نے خبر پڑھنی شروع ہی کی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں اخبار چھوڑ کر بند دروازے کو گھورنے لگا۔ سلیم اکبر خان اور ایلیزا کے بعد وہاں کون آ سکتا تھا۔

تردد کی وجہ سے مجھے جواب دینے میں کچھ تاخیر ہوئی تو بے تابی سے دروازہ پیٹ ڈالا گیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بستر سے اترا اور بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی ہوٹل کی ادھیڑ عمر مالکہ کا بھاری وجود میری نظروں میں آگیا۔

اس وقت مسز رینالڈ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ بری طرح بدحواس نظر آرہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے غیر ارادی بلکہ مشینی انداز میں قدم بڑھا کر اپنا ایک پیر یوں چوکھٹ سے اندر رکھ دیا کہ میں اسے دھکیلے بغیر دروازہ بند نہیں کرسکتا تھا۔

''مسز رینالڈ! کیا بات ہے؟ تم بہت خوفزدہ ہو۔ کیا ہوٹل میں کوئی قتل ہوگیا ہے؟'' اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے اس پر اضطراری سوالات داغ دیے۔

''یہ قتل سے بڑی واردات ثابت ہوسکتی ہے۔'' اس نے سنبھالا لے کر تھوک نگلا اور پھر اپنی حیران و پریشان نظریں میرے چہرے پر گاڑ کر بولی۔ ''مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ تم سلیم اکبر خان نہیں بلکہ اس کے دوست ہو اور میرے ریکارڈ کے مطابق یہ کمرا سلیم کے نام پر ہی بک ہے..... میری التجا ہے کہ تھوڑی دیر..... کے لیے تم خاموشی سے کہیں کھسک جاؤ۔ اس وقت تمہاری یہاں موجودگی میرے ہوٹل کے کاروبار اور نیک نامی کے لیے ایک دائمی عذاب بن جائے گی۔ وہ تھوڑی دیر میں یہاں بھی آجائیں گے۔''

اس کی مبہم لیکن خوف آور باتیں سن کر میری کھوپڑی چکرا کر رہ گئی۔ ''تم کن لوگوں کا ذکر کررہی ہو؟ کھل کر بتا دو کہ ہوا کیا ہے؟'' میں نے اضطراری انداز میں اس کے دونوں شانے پکڑ کر تیز سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی ادھوری اور غیر واضح باتوں نے یکایک ہی میرے بلڈ پریشر میں اضافہ کردیا تھا۔

میری گرفت پر وہ گھبرا گئی اور تقریباً ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''ساؤتھ آل میں انڈین ڈپلومیٹس کے دُہرے قتل کے سلسلے میں شہر کے سارے ہوٹلوں کا ریکارڈ چھانا جارہا ہے۔ دو سراغرساں یہاں بھی آئے ہوئے ہیں۔ تمہارا قصہ ان کے علم میں آگیا تو میرا ہوٹل چلانے کا لائسنس ایک لمبی مدت کے لیے منسوخ ہوجائے گا۔ ہوٹل میں ٹھہرنے والے ہر گاہک کے صحیح کوائف کا رجسٹر میں اندراج..... کرنا میری ذمے داری ہے۔ پتا نہیں میں نے کس جھونک میں اس پر دھیان نہیں دیا اور یہ کمرا سلیم اکبر خان کے نام پر بک کردیا۔''

''مائی اولڈ بے بی!'' میں نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''اگر صرف اتنی سی بات ہے تو تم فکر مت کرو۔ اچھا ہوا کہ تم نے زینے طے کر کے تھوڑی سی ورزش کرلی۔ وہ یہاں آئے تو میں ان سے سلیم اکبر خان کی حیثیت سے اپنا تعارف کراؤں گا۔''

''نہیں ...... نہیں۔'' وہ گھبرا کے بولی۔ ''ایسی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا۔ تم دعویٰ تو کچھ بھی کرسکتے ہو، اسے ثابت کیسے کروگے؟ انہوں نے تمہارا پاسپورٹ طلب کرلیا تو پھر کیا ہوگا؟ تم دروغ گوئی کے جرم میں اور میں مجرمانہ سازش کے الزام میں دھرلی جاؤں گی...... بس تم یہاں سے بھاگ جاؤ ...... یہ لندن ہے یہاں قانون کبھی کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہیں کرتا لیکن جب کسی بھی وجہ سے قانون حرکت میں آتا ہے تو سمجھ لو کہ اپنی راہ میں آنے والی ہر رُکاوٹ کو بے رحمی سے روندتا ہوا ہدف تک پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ پہلی خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ تمہاری کوئی حماقت مجھے ساکھ اور خوش حالی سے محروم کردے گی۔''

اس کی باتیں صاف اور سیدھی تھیں۔ اس کی زبان سے دو سراغرسانوں کی آمد کا ذکر سنتے ہی میرے معدے میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ میں نے راستہ چھوڑ دیا۔ شاید وہ خود بھی راہداری میں بے آرامی محسوس کررہی تھی، گنجائش ملتے ہی میرے کمرے میں آگئی۔

میرے ذہن کا کمپیوٹر خطرہ سونگھتے ہی چل پڑا تھا۔ میں نے مسز رینالڈ سے پوچھا۔ ''اگر وہ رسمی خانہ پُری کے بجائے تفتیش کے لیے یہاں آئے ہیں تو انہوں نے آتے ہی تمہارے کی بورڈ سے یہ نوٹ کرلیا ہوگا کہ اس وقت کن کن کمروں میں مہمان موجود ہیں۔ پھر تم میری غیر موجودگی کا کیا جواز دوگی؟''

''خدا کے لیے تم بھاگ جاؤ۔ وہ ایک معمولی مسئلہ ہوگا۔ میں ان دونوں افسروں سے معذرت کرلوں گی کہ میں اس کمرے کی چابی کی بورڈ پر لٹکانے کے بجائے دراز میں رکھ کر بھول گئی تھی۔ یہ ایک معمول کا بہانہ ہوگا۔ وہ اسے مسترد نہیں کرسکیں گے۔''

اس کے دلائل نے مجھے اس کمرے سے عارضی فرار پر مائل کردیا۔ وہ مسز رینالڈ سے زیادہ میری سلامتی کا مسئلہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ بے چاری معاملے کی سنگین نوعیت اور نزاکت سے بالکل بے خبر تھی۔ میں نے اپنا تجسس دور کرنے کے لیے اس سے ایک اور سوال کرڈالا۔

''مجھے تو خیر تم بھگا ہی رہی ہو مگر اس بات کا کیا جواز پیش کروگی کہ سلیم اکبر خان بیک وقت تمہارے ہوٹل کے دو کمروں میں رہ رہا ہے؟''

''ہم کرایہ دینے والوں کو کمرے دیتے ہیں۔ اس نکتے کا جواز سلیم اکبر خان کو دینا پڑے گا۔'' بات کرتے کرتے اچانک اس کا لہجہ رازدارانہ ہوگیا۔ ''یہاں یہ ہوتا رہتا ہے۔ ایلیزا اس کی گرل فرینڈ ہے۔ وہ اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اس سے لڑائی ہوجاتی ہے تو وہ اس کمرے میں آجاتا ہے۔ آج کل کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں یہاں سب سے بڑی خرابی ہے کہ ایک دوسرے کے والہانہ شیدائی نظر آنے والے اچانک ہی کتوں اور بلیوں کی طرح آپس میں لڑنے لگتے ہیں، ایک دوسرے سے روٹھ جاتے ہیں اور غصہ اُترنے پر ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کے بہانے تلاش کرنے لگتے ہیں۔''

میرے لیے اس معمر اور تجربے کار خاتون کا وہ تبصرہ بہت دلچسپ اور معنی خیز تھا۔ میں اپنی پریشانی کو بھول کر ان فقروں سے محظوظ ہو ہی رہا تھا کہ قدرے توقف کے بعد مسز رینالڈ کی زبان دوبارہ چل پڑی۔ ''اب تم کیا سوچ رہے ہو؟ یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتے؟ وہ اوپر آگئے اور ان سے تمہارا آمنا سامنا ہوگیا تو ہم دونوں مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ ساؤتھ آل کے علاقے میں گیتا اور جیمز پنڈت کی لاشیں دریافت کی جاچکی تھیں۔ ان دونوں کے قاتلوں کی تلاش میں لندن پولیس حرکت میں آچکی تھی۔ جرم کے ارتکاب کے بعد قانون کے رکھوالے مجرم کی بو سونگھتے سونگھتے اس ہوٹل تک آپہنچے تھے۔ یہ میرے مقدر کی یاوری تھی کہ ہوٹل کی مالکہ مجھے کمرا فراہم کرتے ہوئے ایک کھلی بے ضابطگی کا ارتکاب کرچکی تھی اور اسی وجہ سے مجھے سراغرسانوں کی نظروں سے بچانے کی بھرپور کوشش کررہی تھی۔ اگر مسز رینالڈ کی وہ مجبوری حائل نہ ہوتی تو بے خبری میں وہ سراغرساں اچانک ہی مجھے آلیتے اور پھر اپنے تابڑتوڑ مگر نپے تلے سوالوں سے کچھ نہ کچھ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوسکتے تھے۔ اس وقت میرا ان سے دور رہنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ سراغرساں نچلی منزل پر اپنا کام ختم کر کے کسی بھی لمحے اوپر آسکتے تھے۔ میں نے فوراً ہی مسز رینالڈ کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مجھے آمادہ پاتے ہی مسز رینالڈ کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے بھی کوٹ اور برساتی سمیت باہر نکل کر دروازہ مقفل کردیا۔ مسز رینالڈ نے فوراً ہی چابی میرے ہاتھ سے لے لی۔

چابی اسے دینے کے بعد میں زینوں کی طرف بڑھا تو اس نے مجھے ٹوک دیا۔ ''اِدھر نہیں، میرے ساتھ آؤ۔''

میں مڑ گیا۔ اس نے راہداری کے دوسرے اور متروک سرے پر ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس طرف راستے میں اُن سے مڈھ بھیڑ ہوسکتی ہے۔ تم یہ دروازہ کھول کر پچھلے زینے سے نیچے اُتر جاؤ۔ نیچے پہنچ کر تم بغلی راستے سے باہر نکل جاؤ گے۔ بازار وغیرہ کی طرف نکلنے کا موڈ نہ ہو تو مین گیٹ سے دوبارہ

ہوٹل میں آکر کامن روم میں بیٹھ جانا۔ سراغرساں ادھر آئے تو تم کہہ سکتے ہو کہ سلیم اکبر کی واپسی کا انتظار کر رہے ہو۔"

مسز رینالڈ کی بات پوری ہوتے ہی میں بند چوبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلتے ہوئے اس کے آہنی قبضوں سے خاصی آواز پیدا ہوئی۔ شاید اسے ایک مدت کے بعد کھولنے کی نوبت آئی تھی۔ دروازے سے باہر مختصر سی بالکونی سے گول زینہ اُوپر اور نیچے جا رہا تھا۔

پلاسٹک کی نیم شفاف چادروں میں گھرا ہوا عمودی سرنگ نما وہ زینہ ناگوار سی سیلن زدہ بو میں بسا ہوا تھا۔ میں تیزی سے نیچے پہنچ کر باہر نکلا تو عمارت کے عقبی حصے میں خودرو گھاس سے ڈھکا ہوا احاطہ نظر آیا جس میں ٹوٹے پھوٹے فرنیچر، ڈبوں اور دوسرے کاٹھ کباڑ کے جا بجا ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

میں وہاں رُکے بغیر بغلی راستے سے گزر کر ہوٹل کے سامنے سے ہوتا ہوا فٹ پاتھ پر نکل آیا۔ آخری لمحات پر میں نے ہوٹل میں واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ غیر ضروری طور پر کسی سراغرساں یا پولیس والے سے سامنا کرنا میرے حق میں مضر ثابت ہو سکتا تھا۔

مطلع ابر آلود تھا۔ سورج بادلوں کی اوٹ میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ موسم خنک ضرور تھا مگر غنیمت تھا کہ کاٹ دار سرد ہوائیں نہیں چل رہی تھیں۔ میں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف ہولیا۔ میں اپنے خیالات کی رو میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا کہ میری نظر شرلک ہومز کے بڑے سائن بورڈ پر پڑی اور میں نے اسی پب کا رُخ کر لیا۔

مسز رینالڈ کی اچانک آمد کی وجہ سے میں اخبار میں نظر آنے والی خبر کا تفصیلی مطالعہ نہیں کر سکا تھا۔ اس خبر کی خوفزدہ کر دینے والی سرخی مسلسل میرے ذہن میں چبھ رہی تھی اور میری نظریں کسی بک اسٹال کی تلاش میں سرگرداں تھیں تاکہ میں نیا اخبار خرید کر اُس خبر کا متن پڑھ سکوں۔

خوش قسمتی سے پب سے ذرا پہلے ہی مجھے ایک بک اسٹال نظر آ گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہاں بھی صرف سن ہی نظر آ رہا تھا جو ایلیزا میرے لیے خرید کر لائی تھی۔ میں اخبار خرید کر پب میں گھس گیا۔

اس وقت پب میں گنتی کے چند گاہک موجود تھے۔ بیشتر میزیں خالی تھیں۔ میں نے کاؤنٹر پر پیسے دے کر ٹھنڈی بیئر کا بڑا مگ لیا اور ایک الگ تھلگ گوشے میں جا بیٹھا۔ پب میں گاہکوں کی بھیڑ بھاڑ نہ ہونے کی وجہ سے کاؤنٹر کے پیچھے موجود دونوں افراد کراکری چمکانے اور بوتلوں کو قرینے سے لگانے میں مصروف تھے لیکن میرے دل میں چور تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انکھیوں سے میری طرف بھی دیکھ رہے ہوں۔

میں نے بے پروائی سے اخبار میز پر ڈال دیا۔ سگریٹ سلگا کر ٹھنڈی بیئر کے دو گھونٹ لیے اور پھر وقت گزاری کے انداز میں دوبارہ اخبار اُٹھالیا۔ چند ثانیے تک بے دلی سے دیگر صفحات دیکھنے کے بعد میں نے آخر کار اپنا مطلوبہ شہری صفحہ کھول لیا اور پھر تیزی سے پوری خبر پڑھتا چلا گیا۔

خبر کا متن پڑھ کر میری جان میں جان آئی کہ وہ سرخی محض ایک قیاس پر مبنی تھی۔ اس میں کسی ٹھوس شہادت کا انکشاف نہیں کیا گیا تھا۔ اس قیاس پر میں سب سے پہلے غور کر چکا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ گیتا کے کچن سے ملنے والے اومیز ریستوران کے تازہ استعمال کیے ہوئے خالی ڈبوں کے سہارے پولیس اس ریستوران میں پہنچی تو وہاں کے ایک ویٹر نے یہ انکشاف کیا تھا کہ گیتا کے آرڈر کے مطابق اس نے ڈبے باہر منتظر ٹیکسی تک پہنچائے تھے۔ ٹیکسی میں مقتولہ کا کوئی خوبرو ایشیائی دوست بھی موجود تھا۔ وہ ایک عام سی بات تھی۔ ویٹر نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس نے اس وقت تک کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی تھی اس لیے اس نے ٹیکسی کا نمبر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

ویٹر کا اندازہ تھا کہ گیتا اس پُراسرار اور نامعلوم ایشیائی کے ساتھ کہیں دور سے آ رہی تھی اور اگر اس ٹیکسی ڈرائیور کا سراغ مل جاتا تو وہ گمنام قاتل کے بارے میں فیصلہ کن معلومات فراہم کرسکتا تھا۔

سن غالباً سنسنی خیزی کا عادی اخبار تھا۔ اس نے ایک سیدھی سادی خبر میں سے چونکا دینے والی سرخی نکالی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور جو قاتل کو جانتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اس اخبار کو وہیں پب کے فرش پر پھینک کر جوتوں سے مسل دوں۔ رائی کا پہاڑ بنانے اور اپنے قارئین کو غیر ضروری ہیجان و تجسس میں مبتلا کرنے والے اخباروں سے مجھے ہمیشہ چڑ رہی تھی کیونکہ وہ خبر نہیں رہنے دیتے ٹھونک پیٹ کر ہر خبر کو کہانی یا افسانے کا چٹخارے دار رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے اپنے دل پر جبر کر کے خود کو سن کی قرار واقعی تذلیل سے روکے رکھا۔ میرا وہ بے ساختہ ردِعمل مجھے وہاں ہر شخص کی نگاہوں کا محور بنا سکتا تھا جب کہ اس وقت میری تمام تر عافیت صرف اور صرف گمنامی میں مضمر تھی۔

اسی صفحے کے نچلے حصے میں سن کے کسی نامہ نگار نے دستیاب شہادتوں کی بنا پر اس دُہرے قتل کو عشق و رقابت کی ایک فرسودہ داستان قرار دیا تھا۔

اس کی رائے تھی کہ گیتا نے عمر کے فرق کے باوجود کسی نہ کسی طرح جیمز پنڈت کو اپنے چنگل میں پھانسا ہوا تھا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے سہارے جیمز پنڈت کو اپنے ہائی کمیشن سے بھاری معاوضے پر خفیہ کام دلاتی رہتی تھی۔ آسانی سے حاصل ہونے والی اس آمدنی کا چسکا لگ جانے کے بعد جیمز پنڈت مجبور تھا کہ گیتا کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو بے چون و چرا پورا کرتا رہے۔

اس روز گیتا اپنے ساتھ کسی اور شناسا کو لے کر اپنے گھر پہنچی اور خورونوش کا جشن منانے میں مصروف ہوگئی۔ اسی دوران میں جیمز پنڈت اتفاقاً وہاں پہنچ گیا۔ انگریز باپ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ روادار تھا مگر اس کی رگوں میں لیلا پنڈت نامی مشرقی برہمن زادی کا خون بھی دوڑ رہا تھا۔ وہ گیتا کے خلوت میں کسی اور کی مداخلت برداشت نہیں کرسکا۔ تصادم ہوا اور جیمز پنڈت نے دانستہ یا نادانستہ اپنے بے آواز ریوالور سے گیتا کو ہلاک کر ڈالا جس کا ثبوت اس کے داہنے ہاتھ پر موجود بارود کے ذرات سے ملتا تھا۔ گیتا کے مرتے ہی اس کے نامعلوم شناسا نے کسی طرح جیمز پنڈت کو زیر کیا اور ہلاک کر کے وہاں سے نکل گیا۔

سن کی وہ گمراہ کن اور گھٹیا کہانی تفتیشی پولیس افسران کو بالکل ہی غلط راہ پر ڈال سکتی تھی۔ تفتیش کا بیشتر زور گیتا کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں پر ہوجاتا لیکن اس کا دوسرا رُخ خطرناک تھا۔

سن کے چھچھورے نامہ نگار نے وہی کچھ لکھا تھا جو ویرا کہہ چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ ویرا کو سن کا وہ شمارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے مگر مجھے اس دُعا کی قبولیت کی زیادہ اُمید نہیں تھی۔ شہر کے بک اسٹال پر بڑے ڈھیر کی صورت میں بچا رہنے والا سن واحد اخبار تھا جو میرے ہاتھ آسکا تھا اور شاید پورے شہر میں اس کا یہی حال تھا پھر وہ ویرا کی نظروں سے کیسے بچ سکتا تھا۔

میں بیئر کے گھونٹ لے کر بے دلی سے اخبار پر نظریں دوڑاتا رہا۔

بدری ناتھ اور رمیش اگروال کی آمد کے انتظار میں بے کاری سے اکتا کر میں از خود ہی گیتا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ میرا ارادہ اس سے صرف چھیڑ چھاڑ تک محدود رہنے کا تھا لیکن سلسلہ شروع ہوا تو حالات جلد ہی میرے قابو... سے باہر ہوگئے اور تیر کمان سے نکل گیا۔

وہ دونوں نہ مارے جاتے تو میرا ان کی قید سے نکلنا ناممکنات میں سے تھا۔ وہ مجھے جلد ہی انڈین فارن سروس یا سیکرٹ سروس کے حوالے کر دیتے اور میری آزادی کی ہر راہ مسدود ہوکر رہ جاتی مگر میرے ستارے میرا ساتھ دے رہے تھے۔ میں ایک چوہے دان میں پھنستے پھنستے پھسل کر باہر نکل آیا۔ پہلے میں غیر مسلح تھا۔ اب میرے پاس گیتا کا چھوٹے بور کا بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ جیمز پنڈت کا بے آواز ریوالور جو میرے لیے بہت زیادہ کار آمد ثابت ہوسکتا تھا میں نے مصلحتاً جائے واردات پر چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہی جیمز پنڈت کے جرم کا

واحد ثبوت تھا۔ ریوالور اس کی ملکیت تھا۔ اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم تھیں۔ ایک گیتا کی لاش میں پیوست تھی، دوسری نے اس کا چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر بارود کے ذرات دریافت ہو چکے تھے۔ دو جمع دو کی طرح وہ ایک آسان صورتِ حال تھی۔ گیتا کا قاتل مار دیا گیا تھا۔ مسئلہ صرف یہ رہ جاتا کہ جمو پنڈت کا قاتل کون تھا۔

دوسرا اعصاب شکن مرحلہ ذرا دیر پہلے رائل ہوٹل میں پیش آیا تھا۔ ایک بڑی واردات کے ارتکاب کے بعد شہر کی پولیس شاید عموی پڑتال کے لیے ہر بورو یا انتظامی علاقے میں نکل پڑی تھی مگر وہاں مسز رینالڈ کی ایک خود کردہ غلطی میری نجات کا پروانہ بن گئی۔ اگر اس نے مجھے عقبی زینے سے نہ فرار کرایا ہوتا تو شاید میں اس وقت پولیس والوں کے تلخ اور کڑے سولات کا سامنا کر رہا ہوتا۔

میں نے اخبار لپیٹ کر میز پر ڈال دیا۔ اخبار بینی کے ظاہری شغل سے فارغ ہو کر میں اپنی کرسی میں ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں سے اُٹھنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

کراچی سے دبئی تک کے سفر میں میں نے سلیم اکبر خان کو مدن موہن سے ہمدردی رکھنے والے ایک خود غرض پاکستانی کی حیثیت سے دریافت کیا تھا لیکن لندن میں اس کی ذات میرے لیے خاصی اہم ثابت ہوئی تھی۔ وہ ملک کا غدار تھا جو عیش وعشرت کے حصول کے لیے ناموسِ وطن کا سودا کر رہا تھا۔ کراچی میں اول خان جال بچھا کر اُس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اور مدن موہن کی ایکا یک روپوشی پر خطرہ بھانپ کر ملک سے فرار ہو چکا تھا۔ غنیمت تھا کہ میں نے اسے بہلا پھسلا کر دوبارہ پاکستان جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ اس تصویر کا ایک رُخ تھا۔ دوسرا رُخ غیر متوقع طور پر میرے لیے ایک انعام ثابت ہوا تھا۔

وہ رائل ہوٹل کا مستقل گاہک تھا۔ اس پر اعتماد کی وجہ سے ہی مسز رینالڈ نے میرا کمرا اس کے نام پر بک کیا تھا اور پھر اپنی اس غلطی کی پردہ پوشی کے لیے مجھے پولیس کا سامنا کرنے سے بچایا تھا۔ وہ کوئی ان ہونا اتفاق نہیں تھا۔ گندھے ہوئے اور پیوست واقعات میں رفتہ رفتہ ہی سلیم اکبر خان کا کردار اُبھر کر سامنے آیا تھا۔ وہ سفر کی ابتدا میں مجھ سے نہ ٹکرایا ہوتا تو شاید میں اس وقت بھی ماسٹر رابرٹ ہوٹل میں ویرا سے کسی متبادل قیام گاہ کے سوال پر تبادلہ خیال کر رہا ہوتا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" ایک ملاحت آمیز اور نوخیر مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ گوری چمڑی، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ایک جوان لڑکا تھا جس کے جسم پر صرف ٹی شرٹ اور سال خوردہ سی جینز نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اُمید اور پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

"کیوں؟" میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا یہاں دوسری میزیں خالی نہیں ہیں؟"

"میزیں ضرور خالی ہیں مگر میری جیب بھی خالی ہے۔" اس نے کسی شرمندگی کے بغیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ "میں نے سوچا کہ تم اکیلے ہو۔ تمہیں کمپنی کی ضرورت ہوگی۔" بات کرتے ہوئے وہ ڈھٹائی سے میرے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

مجھے اس کی حرکت پر خاصا تاؤ آیا مگر میں نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پا لیا۔ بیئر کا ایک مگ خرید کر میں چار کرسیوں والی اس میز پر اپنا زیادہ حق نہیں جتا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس نازک صورتِ حال میں مجھے کسی بھی تو تکار سے گریز ہی کرنا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھور کر پوچھا۔ "کیا میں کسی اور میز پر چلا جاؤں؟"

"میں میکل فیلڈ کا رہنے والا ہوں لیکن لندن کے بارے میں یہاں رہنے والوں سے زیادہ جانتا ہوں۔" اس کی زبان چل پڑی۔ "آج کی ٹیوب میں سفر کرتے ہوئے کسی کو خیال بھی نہیں آتا ہوگا کہ زمین کی گہرائیوں

میں بنی ہوئی یہ پیچ در پیچ سرنگیں دراصل کوئلے کی متروکہ کانیں ہیں۔ کوئلے کا ذخیرہ ختم ہونے کے برسوں بعد کسی کو خیال آیا کہ ان سرنگوں کی مدد سے شہری ٹرانسپورٹ کا ایک تیز رفتار نظام قائم کیا جا سکتا ہے اور بس اسی دن سے ٹیوب کے قیام اور ترقی کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو......!"

"بس!" میں نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "اپنی بے سروپا باتوں سے میرا موڈ غارت مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم میری جان چھوڑنے کا کیا معاوضہ لوگے؟"

"ناشتے کے لیے سستے سے سستا ہیم برگر بھی دو پاؤنڈ ننانوے پی کا آتا ہے...... تم صرف پانچ پاؤنڈ اضافی خرچ کرنے کا ارادہ کر لو تو میں پورے دن تمہیں لندن کی سیر کرا سکتا ہوں۔ چاہو گے تو میں تمہاری ذاتی خدمت بھی کروں گا...... میری باتوں پر غور کرو تو تم صرف پانچ پاؤنڈ میں اس دن کو یادگار بنا سکتے ہو۔"

"تم ان چند لمحوں میں میرے دن کو تباہ کر چکے ہو۔ اب فوراً سے پیشتر یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں بارٹینڈر سے کہتا ہوں کہ وہ کسی بوبی کو بلائے جو تمہیں یہاں سے لے جا سکے۔"

اس نے میز پر پڑے ہوئے اخبار پر جھپٹا مارا اور نیچی آواز میں مجھے بیلک سوائن کہہ کر پھرتی سے کرسی سے اٹھ گیا۔ اس وقت اُس کی نیلی آنکھیں قہر بار نظر آ رہی تھیں۔

اس لڑکے کی ذلیل حرکت نے مجھے اس قدر مشتعل کر دیا کہ میں غراتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ "کتیا کے بچے! تیری یہ مجال......"

میرے خراب تیور دیکھتے ہی اس نے اخبار سمیت دروازے کی طرف دوڑ لگا دی اور میں شکست خوردہ انداز میں اپنی کرسی پر گر گیا۔ اس نابکار لڑکے کی بدزبانی پر مشتعل ہو کر میں نہ چاہتے ہوئے بھی پب میں ...... ایک تماشا بن چکا تھا۔

میری اُونچی آواز پر وہاں موجود لوگ تحیر زدہ انداز میں گردنیں اُونچی کر کے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پب کا مختصر سا عملہ بھی چوکنا ہو چکا تھا۔ ایک معمر بارٹینڈر اپنے آراستہ اور اُونچے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے میری طرف آنے لگا۔

"سر! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میرا خیال ہے کہ ابھی تم بیئر کا پہلا گھونٹ ہی لے رہے ہو۔" اس نے میری طرف جھک کر دھیمی اور ہمدردانہ آواز میں کہا۔

"وہ بھاگنے والا آوارہ لڑکا پانچ پاؤنڈ نہ ملنے پر مجھے گندی گالی دے کر گیا ہے۔" میں نے آزردہ اور غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ "کیا یہ حرکت کسی کو مشتعل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟"

"میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ لڑکے کی چھوڑی ہوئی کرسی کے سرے پر ٹک کر ناصحانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "یہ چیرنگ کراس کا علاقہ ہے۔ صبح سے رات گئے تک یہاں آوارہ لڑکے لڑکیوں کے گینگ گھومتے رہتے ہیں۔ سمجھ دار لوگ ان سے اُلجھنے سے گریز کرتے ہیں اور نرمی سے انہیں ٹال دیتے ہیں۔ اس کی گالی پر مشتعل ہو کر بھی تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اپنا بلڈ پریشر کچھ بڑھا لیا ہوگا۔"

"تو کیا قانون ان لچے لفنگوں کے سامنے اتنا ہی بے بس ہے؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے بلاتردد کہا۔ "ہمارا قانون حق وانصاف پر مبنی اور بہت سخت ہے مگر وہ ملزم کو بھی صفائی کا پورا موقع دیتا ہے۔ قانون کا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے تمہارا ویزا ختم ہو جائے گا۔ تم چاہو تو اسی وقت رپورٹ درج کرا سکتے ہو۔ پولیس تمہارا پورا پورا ساتھ دے گی۔"

"اگر وہ دوبارہ آیا تو میں اس بارے میں ضرور غور کروں گا۔" میں نے کہا۔

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اسے بھول جاؤ۔ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ اسے تمہاری کوئی بات بری لگی ہوگی تو وہ اپنے پورے غول کے ساتھ تمہارے باہر نکلنے کا انتظار کرے گا۔ وہ خاموشی سے تمہارا پیچھا کریں گے اور کسی بھی ویران گلی یا سنسان زیرِ زمین راستے میں تمہیں مار پیٹ کر

لوٹ لیں گے۔ تمہاری ساری تفریح غارت ہو جائے گی۔ یہ اس شہر کی بدقسمتی ہے کہ یہاں بے راہ رو نوجوانوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے سدباب کی تدبیریں ہر وقت ناکافی محسوس ہوتی ہیں۔ گلاس ختم کرو اور دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔“

تشفی آمیز انداز میں میرا شانہ تھپتھپا کر دوبارہ اپنے کاؤنٹر کی طرف چل دیا اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ اس نے واقعی مجھے مخلصانہ مشورہ دینے کی کوشش کی تھی یا مجھے لندن کے نوخیز غنڈوں سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا ارادہ وہاں بیٹھ کر بیئر کے کم از کم دو بڑے مگ خالی کرنے کا تھا مگر اس واقعے سے طبیعت اتنی مکدر ہوئی کہ میں نے تیزی سے وہی مگ ختم کر کے پب چھوڑ دیا۔

پب سے نکلتے ہوئے میں نے سرسری انداز میں دائیں بائیں دیکھا لیکن وہاں فٹ پاتھ پر رواں ہجوم میں مجھے ایسی کوئی ٹولی نظر نہیں آئی جو ایک ہی جگہ رُک کر کسی کی آمد کا انتظار کر رہی ہو۔ میں بے پروائی سے ایک طرف چل پڑا۔ اس وقت میرا ارادہ آوارہ گردی کر کے وقت گزارنے کا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد میں رائل ہوٹل پہنچوں گا تو پولیس والے اپنی رسمی کارروائی پوری کر کے جا چکے ہوں گے۔

چیرنگ کراس کے عقب میں اُتر کر دریائے ٹیمز کے کنارے وکٹوریہ امبینک منٹ نامی پُر فضا سڑک وقت گزاری کے لیے بہترین جگہ تھی جس کے ایک سرے پر ویسٹ منسٹر کا مشہور علاقہ واقع تھا مگر اس وقت میرا رُخ کسی اور ہی طرف ہو گیا تھا۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد فٹ پاتھ کے کنارے لگی ہوئی تختیوں سے اندازہ ہوا کہ میں ہے مارکیٹ اور ریجنٹ اسٹریٹ کی طرف جا رہا تھا۔

ہے مارکیٹ کے سرے پر مجھے پبلک بوتھ نظر آئے تو میں اسی طرف ہو لیا۔ سیاحوں کے لیے سستے یادگاری تحائف فروخت کرنے والی ایک دُکان سے میں نے فون کارڈ خریدا اور پھر ایک کارڈ فون بکس میں جا گھسا۔ مجھے اچانک ہی ویرا کی خیر خبر لینے کا دھیان آ گیا تھا۔

ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا نظام رائل ہوٹل سے کہیں بہتر تھا۔ آپریٹر کو میں نے اپنا نام سیموئیل بتا کر مسز روزی برڈ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے پل بھر میں لائن ویرا کو منتقل کر دی۔ میری آواز سنتے ہی ویرا نے میری بات کاٹ دی اور اُردو میں بولی۔ ”مجھے معلوم تھا کہ یہ تمہاری ہی فون کال ہو گی۔ آج کل تم اتنی تیزی سے اپنے نام بدل رہے ہو کہ تمہیں اس کی فہرست بھی یاد نہیں رہی ہو گی۔“

”تمہیں تمہارے ابا جان کے قاتلوں تک پہنچانے کے لیے نہ جانے اور کیا کرنا پڑے گا...... غنیمت ہے کہ ابھی تک تو ساری بپتا نام پر ہی گزر رہی ہے۔“

”زیادہ بک بک مت کرو۔ مجھے پتا چل چکا ہے کہ تمہارا منظورِ نظر آج لندن پہنچ رہا ہے۔“

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ”یہاں آ کر وہ اپنا سر پیٹنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”اپنا سر پیٹتے ہوئے اسے خیال بھی نہیں آئے گا کہ کوئی اس کا ہمدرد بن کر اسی کا سر کچلنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔“ ویرا نے اپنی عادت کے مطابق بے رحمی سے کہا۔

”پوری بات سن کر تم بھی قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاؤ گی۔“ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

”ایسا ہے تو پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔ یہاں آ کر میں ہنسنے کو ترس گئی ہوں۔“

”میں نے سلطان شاہ کے ذریعے اسے ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا نمبر دے دیا تھا۔ وہ نمبر ملائے گا تو اسے یہ معلوم نہیں ہو گا کہ میں وہاں کس نام سے ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”اوہ خدا! یہ مکاری تم نے جان بوجھ کر کی ہے یا بے دھیانی میں ایسا ہوا ہے؟“

”مجھے اس پر اعتماد ہے مگر اس کے آدمیوں پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے۔ کل اول خان شبہ ظاہر کر رہا تھا کہ نک نے اسے چارے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسا ہوا تو بدری کی بے خبری میرے لیے بہت سود مند ثابت ہو گی۔ ہم دور رہ کر اصل حالات کا اندازہ

کر سکیں گے۔“

”سلطان شاہ سے تمہاری وہ گفتگو میرے سامنے ہوئی تھی۔ میں نے غور تک نہیں کیا تھا کہ تم نے نام گول کر دیا ہے۔ یہ سب تو اس وقت کی باتیں ہیں جب وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے جس بھس میں چنگاری پھینکی ہے، اس کا کیا بنے گا؟“

”آگ بھڑکنے سے پہلے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ بس دونوں ڈرائیوروں کی غفلت کی دُعا کرتی رہو۔“

”ہو سکے تو آج کا سن ضرور دیکھ لینا۔“ ویرا کی آواز طنزیہ ہو گئی۔ ”اس کے شہری صفحے پر وہی کہانی چھپی ہے جو میرے دل میں ہے۔ دور سے بات بالکل صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ پتا نہیں تم مجھے کیوں بے وقوف بنانے پر تلے رہتے ہو۔ اب میں تمہاری بے راہ روی برداشت نہیں کروں گی۔“

”خوب! تو اب تم بھی بیوی کے سے لب و لہجے سے بات کرنے لگیں...... آج شاید پورے شہر میں یہی ایک منحوس اخبار بچا تھا۔ وہ بودی اور گھٹیا کہانی میں پڑھ چکا ہوں۔ بس رپورٹ کا انتظار کر لو۔“

”میں نے سن ہی نہیں، دوسرے اخبارات بھی دیکھے ہیں۔ ان میں دبے دبے الفاظ میں ان شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ سب تمہارے دشمن تو نہیں ہیں۔“

”میں کافی دیر سے شہر کی سڑکیں ناپ رہا ہوں۔ یہ کال بھی پبلک بوتھ سے کر رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اس طرف آ جاؤ۔ فون پر اُردو میں بھی ایسی باتیں مناسب نہیں ہیں۔“

”میں فوراً ہی اس قید خانے سے نکل بھاگنے کے لیے تیار ہوں۔ شہر کے بارونق مرکزی حصے سے دور یہاں کمرے کے آرام کے سوا کیا رکھا ہے۔ کہو تو حساب بے باق کر کے اپنا سوٹ کیس بھی ساتھ لیتی آؤں۔“ وہ شاید میری طرف سے ایسی کسی دعوت کی ہی منتظر تھی۔ وہ رُکے بغیر کہتی رہی۔ ”سنا ہے آج صبح سویرے پولیس والے ہوٹل کے مکینوں کے ریکارڈ کی دیکھ بھال کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔“

”تو کیا وہ لوگ کمروں تک نہیں آئے تھے؟“ میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ اگلی بار یہ نوبت بھی آ جائے۔ اس بار وہ فرنٹ آفس تک ہی محدود رہے۔ کیا تمہاری طرف بھی ایسی کارروائی ہوئی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”آج یہ وبا شاید پورے لندن میں پھیلی ہوئی ہے۔ تمہیں ماسٹر رابرٹ کا کمرا چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ رقم پیشگی دے کر چلی آؤ، کچھ پتا نہیں کہ کب ہمیں سر چھپانے کے لیے کسی ٹھکانے کی ضرورت پڑ جائے۔ جب تک سلیم اکبر کراچی کے لیے روانہ نہیں ہو جاتا میں تمہیں رائل میں نہیں لا سکتا۔ میں بارہ بجے پکاڈلی چوک پر بوٹس کے اسٹور کے قریب تمہارا انتظار کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر ویرا نے فون بند کر دیا۔

فون سے فارغ ہو کر میں ہے مارکیٹ والی سڑک سے دوبارہ پرانے راستے پر نکل آیا جو ریجنٹ اسٹریٹ سے ہوتا ہوا پکاڈلی سرکس تک پہنچتا تھا۔

اس وقت تک آسمان پر بادلوں کے پرے گھرے ہو چکے تھے۔ چند ثانیوں بعد بہت ہلکی سی پھوار پڑنے لگی۔ چمکتے ہوئے سورج کی سرزمین کے باسیوں کے لیے ساون کا وہ سہانا موسم ہمیشہ خوابناک، رومان پرور اور حسین ثابت ہوتا ہے لیکن چمکتی ہوئی دھوپ کو ترسے ہوئے انگریزوں کے لیے وہ برکھا رُت ایک عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہونے والی اس برسات میں ہر مقامی فکرمند، اُداس اور بیزار نظر آتا ہے لیکن اس وقت فٹ پاتھوں پر ہر رنگ و نسل کے جو سیاح چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے ان سب کے چہروں سے بے حساب خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ہر جوڑا وارفتگی کے انداز میں ایک دوسرے کو یوں مضبوطی سے تھامے چلا جا رہا تھا جیسے اس بھیڑ میں ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کا

خدشہ ہو۔

بعض گوشوں اور درختوں کے سائے میں خاصے اشتعال انگیز مناظر دیکھنے میں آرہے تھے لیکن وہ بے فکروں کا شہر لندن تھا جسے عرف عام میں سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنی دنیا میں مگن اور مست تھا۔ کسی کو دوسروں کی فکر نہیں تھی۔ مغرب میں اس رویے کا نام رواداری اور پرامن بقائے باہمی تھا۔ مشرق کے ہر خطے میں ایسی حرکتوں کو بلا استثنٰی بے شرمی، بے حیائی اور بدکرداری کا نام دیا جاتا تھا۔

ریجنٹ اسٹریٹ ایک طرف ٹرافالگر اسکوائر اور چیرنگ کراس سے آنے والے راستے سے ملتی ہے اور پھر پکاڈلی سرکس کے شہرۂ آفاق چوراہے کی دوسری جانب خم کھاتی ہوئی سیدھی آکسفورڈ سرکس سے جا ملتی ہے۔ اس پر ہر وقت لوگوں کا ایک رنگا رنگ اژدھام رواں نظر آتا ہے۔

میں اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا پکاڈلی سرکس پر پہنچا تو میری رسٹ واچ ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ چیرنگ کراس سے پکاڈلی سرکس تک دوڑ لگانے کے بعد معدے میں اُتری ہوئی یخ بستہ بیئر موسم کی خنکی سے مل کر اپنا رنگ دکھانے لگی تھی جس کے نتیجے میں، میں گرم گرم چائے یا کافی پینے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔

میں بوٹس کے اسٹور کو عارضی طور پر بھول کر میکڈانلڈ ... شاپ میں گھس گیا۔ کھلی اور ٹھنڈی فضا سے ریستوران کی فرحت انگیز حرارت میں پہنچتے ہی مجھے سرور سا آگیا۔

معمول کے مطابق وہاں بھی خودکار کیش مشینوں کے سامنے چھوٹی بڑی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک قطار میں لگ کر خوبصورت کاغذی گلاس میں کافی خریدی اور پھر دیوارگیر طویل میز کے سامنے پڑے ہوئے ایک اُونچے اسٹول پر جا بیٹھا۔ کھانے کا وقت نہ ہونے کے باوجود وہ فاسٹ فوڈ ریستوران تقریباً بھرا ہوا تھا۔

میں کافی کا گلاس دھیرے دھیرے خالی کرتا رہا۔ اسی دوران میں میں نے سگریٹ بھی سلگالی۔ یہ ذکر پہلے بھی کہیں آچکا ہے کہ اس زمانے میں سگریٹ بلکہ تمباکو نوشی کے بارے میں مغرب میں کوئی مخالفانہ مہم شروع نہیں ہوئی تھی اور لوگ ہر طرف کثرت سے دُھواں اُڑاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نے بے تکلفی سے میری پسلی میں ٹہوکا دیا۔ میں چونکنے انداز میں پلٹا۔ سلیم اکبر خان کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کاغذی کپ موجود تھا۔

"اکیلے اکیلے یہاں عیش ہو رہے ہیں ...... کیا ایلیزا کو ہوٹل ہی میں چھوڑ آئے ہو؟" اس نے میری طرف جھک کر بائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"ایلیزا کے لیے تمہاری دوستی ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔" میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "تمہارے جاتے ہی وہ تفریح کے لیے کہیں نکل گئی تھی۔ اب کہیں عیش کر رہی ہوگی۔ میں تو یہاں کافی پی رہا ہوں۔"

میں اسٹول پر براجمان تھا۔ آس پاس کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ میں نے اس کا ساتھ دینے کے لیے اخلاقاً اپنی جگہ چھوڑ دی اور ہم دونوں ٹہلتے ہوئے ایک گوشے کی طرف بڑھ گئے۔

"کیا بات ہے ......؟ تمہارے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں آج ہی کی کی پرواز پر کراچی واپسی کی سیٹ مل گئی ہے۔" قدرے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"تم ٹھیک سمجھے۔ آج کی تو نہیں، کل صبح آٹھ بجے کی پرواز پر سیٹ ملی ہے۔ رش کے دنوں میں اتنی جلدی سیٹ کا مل جانا معجزے سے کم نہیں ہے۔ تم سے ملاقات کے بعد میرے سارے بگڑے ہوئے کام تیزی سے سیدھے ہوتے جا رہے ہیں۔" گوشے میں پہنچ کر اس نے مسرت آمیز لہجے میں مجھے آگاہ کیا۔ "کراچی میں دفتر کی سیل کھل گئی، یہاں سے اتنی آسانی سے واپسی کی سیٹ مل

گئی۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ کراچی پہنچتے ہی میرے مطلوبہ کاغذات میرے ہاتھ آجائیں گے۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہ چلے گا۔"

وہ اپنی قسمت اور تدبیروں پر نازاں تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اپنی مکاری سے اپنے برے وقت کو ٹال دیا تھا۔ وہ بدنصیب اور خودغرض شخص بھول رہا تھا کہ قدرت کا مکافاتِ عمل کا ایک اپنا نظام ہے جس کے تحت بروں اور بدکاروں کی مہلت کی رسی دراز ضرور ہوتی ہے۔ لیکن آخری غیبی جھٹکا ان کی گردنیں توڑ کر انہیں پیوند خاک کر دیتا ہے۔

کیا مقام عبرت تھا کہ شکار خوشی خوشی اپنے شکاری کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جب اسے کراچی میں صرف اندیشے ہی دہلا رہے تھے تو وہاں سے نکل بھاگا تھا لیکن اب اس کی قبر تیار ہو چکی تھی تو وہ جلد از جلد وہاں پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔

میں نے پورے خلوصِ دل سے اسے مبارک باد دی کیونکہ اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو اسے اس کے موزوں ترین انجام تک پہنچا سکتا تھا۔ اس نے پولینڈ سے آئی ہوئی ایلیزا کے ...... ساتھ لندن جیسے شہر نگاراں میں اپنی زندگی کی چند آخری حسین ترین راتیں گزار لی تھیں اور اب کراچی میں اس کا فیصلہ ہونا تھا۔

"ایئر لائن کا دفتر بھی یہیں قریب ہی ہے۔ سیٹ بک کراتے ہی میں اِدھر چلا آیا۔ سچ پوچھو تو آج مجھے پکاڈلی میں ایک نئی کشش نظر آرہی ہے۔"

"یہ پکاڈلی کی کشش نہیں، تمہارے اندر کی خوشی ہے جو تمہیں ہر چیز پر چھائی ہوئی نظر آرہی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ابھی تمہارے ساتھ کوئی اندوہناک واقعہ پیش آجائے تو یہی پکاڈلی تمہیں اُجڑی ہوئی اور بے رُوپ نظر آنے لگے گی۔"

"اوہو ...... اس مبارک موقع پر ایسی بدفالی تو منہ سے نہ نکالو۔" اس نے بے ڈھنگے پن سے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ جب میں نے ایلیزا کو تمہارے حوالے کیا تھا تو تم نے اسے باہر کیوں جانے دیا؟"

میں نے اپنی رسٹ واچ پر سرسری نظر ڈال کر کہا۔ "آؤ باہر چلتے ہیں۔"

اس نے چائے کا خالی کپ ڈسٹ بن ڈال دیا۔ اندر کے خوشگوار ماحول سے خنک اور کھلی فضا میں پہنچ کر میں نے کہا۔ "ایلیزا کوئی انگوٹھی یا رسٹ واچ نہیں ہے جس کی ملکیت کو تبدیل کرنا تمہارے اختیار میں ہو۔ وہ نرم و نازک جذبوں سے مالا مال ایک زندہ لڑکی ہے۔ جب تک تم یہاں ہو، اس سے دوستی کے مزے لوٹتے رہو۔ وہ اکیلی رہ جائے گی تو میں دیکھوں گا کہ وہ میرے لیے کتنی کشش انگیز ہے۔"

باہر آتے ہی میں نے دانستہ اسے گرین پارک کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ ویرا کے اس علاقے میں پہنچنے سے پہلے وہ کہیں دور نکل جائے تاکہ ویرا اس کی نظروں میں نہ آسکے۔ ویرا کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر کوئی شرارت بیدار ہو سکتی تھی۔

کچھ دور نکل آنے کے بعد اس نے چونک کر پوچھا۔ "یہ تم مجھے اُلٹے راستے پر کہاں لے جا رہے ہو؟"

"میں لے جا رہا ہوں؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے کہا۔ "تم نے خود ہی اِدھر کا رُخ کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم گرین پارک کے سبزہ زار میں آج کے لیے کوئی نیا شکار تلاش کرو گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہاں کسی سے مل بیٹھنا آسان ثابت ہوگا۔ آؤ وہیں چلتے ہیں۔"

میں چلتے چلتے ٹھٹک کر رُک گیا۔ "میں نے بہت دور تک تمہارا ساتھ دے لیا۔ اب تم اکیلے ہی اس مہم پر جاؤ۔ مجھے تھوڑی دیر بعد پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن کے بازار میں اپنے رشتے دار سے ملنا ہے۔"

اس نے چند ثانیوں تک میری طرف دیکھا پھر فضا میں ہاتھ لہرا کے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اب شام کو ہی ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

اس کا رُخ بدستور گرین پارک کی طرف تھا۔ میرے لیے یہ حیران کن بات تھی کہ وہ انتہائی درجے تک میرا گرویدہ ہو چکا تھا اور ہر بار میرے سمجھائے ہوئے راستے پر چلنے میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔

میں ایک دیوار کے سائے میں رُک کر اسے خراماں خراماں گرین پارک کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا تو میں تیز قدموں سے واپس پکاڈلی کی طرف ہولیا۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بجنے میں چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

پکاڈلی سرکس پر بوٹس اسٹور کے باہر ویرا پہلے سے موجود تھی۔ لندن میں ٹیوب اسٹیشنوں سے لے کر شہر کے مرکزی بازاروں تک میں جا بجا ایسے مضطرب لوگ نظر آتے ہیں جو مقررہ وقت اور مقام پر اپنے کسی دوست یا ملاقاتی کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی کسی کی استہزائیہ نگاہوں کا نشانہ نہیں بنتے۔

ویرا اپنی جگہ کھڑی عقابی نظروں سے قرب وجوار کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ لیا اور اپنی جگہ چھوڑ کر تیر کی طرح سیدھی میری طرف چلی آئی۔

کہاوت ہے کہ جب تم روم میں ہو تو وہی سب کرو جو رومن کرتے ہیں۔ اس وقت وہ کراچی کے بجائے لندن کے ایک روایتی اور رومانوی علاقے میں موجود تھی۔ اس نے وہی کیا جو مقامی لڑکیاں والہانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کرتی ہیں۔ مجھے ویرا سے اس بدتمیزی کی توقع نہیں تھی اس لیے میں بے خبری میں اس کا شکار ہو گیا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ میرے داہنے بازو سے یوں لپٹ گئی جیسے مجھ سے مدتوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ میں نے جھلا کر اپنا بازو اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی تا کہ اپنے رُخساروں سے ویرا کی جسارت کے داغ مٹا سکوں مگر وہ جونک کی طرح میرے بازو سے لپٹی رہی۔

''احمق نہ بنو۔'' وہ مجھے ایک طرف تقریباً کھینچتے ہوئے منمنائی۔ ''خاموشی سے کسی سکون کی جگہ کی طرف نکل چلو۔ مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ میں تمہارے ساتھ بوٹس کی بھیڑ بھاڑ میں ماری ماری پھروں گی۔ اپنی تسلی کے لیے یہ بھی سن لو کہ میں داغ نہ لگانے والی لپ اسٹک استعمال کرتی ہوں۔''

''تمہارے لگائے ہوئے دوسرے داغ اتنے کافی ہیں کہ لپ اسٹک کا ہلکا سا ایک آدھ داغ ان میں اپنی شناخت تک کھو بیٹھے گا۔'' میں نے طنز سے کہا۔

وہ قلقاری مار کر ہنس پڑی۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے چند راہ گیروں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ میں شرمسار ہو گیا مگر اس سے پہلے ہی دیکھنے والے معذرت خواہانہ انداز میں سر جھکا کر آگے ہو لیے کیونکہ اس سرزمین پر دوسروں کی انفرادی آزادیوں میں مخل ہونے کا کوئی دستور نہیں تھا۔

''صرف ایک رات الگ رہ کر تم نے شاعری شروع کر دی۔''

ہنسی تھمنے کے بعد ویرا کہہ رہی تھی۔ ''شاعری کرنے والوں کو یہ شہر راس نہیں آتا۔ یہاں ہر ایک پاؤنڈ کی زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔ بزنس یا نو بزنس۔ اس کے سوا تیسری بات نہیں ہوتی۔''

معاً مجھے پچھلی شام چیرنگ کراس پر ملنے والی شیری رینڈل یاد آگئی۔ وہ بھی اس وقت بزنس کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی تھی لیکن اس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ ویرا کے بیان کیے ہوئے معیار سے بالکل مختلف تھا۔ میری سرد مہری اور کج خلقی کی وجہ سے اس نے اپنے معاوضے کے طے شدہ پانچ پاؤنڈ بھی میرے برباد کیے ہوئے وقت کے طور پر میرے پاس چھوڑ دیے تھے۔

''آؤ ٹیوب میں چلتے ہیں۔'' میں نے اس کی بھٹکی ہوئی ذہنی رو کو راہ پر لانے کے لیے اچانک تجویز پیش کی۔ ''اس وقت ٹیوب خالی ہو گی۔''

''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' اس نے میرا بازو چھوڑ کر تیزی سے پوچھا۔

اپنی ترکیب کی کامیابی پر میں دل ہی دل میں

مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کہیں بھی نہیں۔ بس ٹریول کارڈ لے کر کسی بھی ٹرین میں چڑھ جائیں گے۔ خالی ڈبوں میں ہمیں باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

''تجویز محفوظ اور کم خرچ ہے۔'' اس نے میری تائید کی اور ہم ایک قریبی زمین دوز راستے میں گھس گئے جو اندر ہی اندر ہمیں کسی بھی ملحقہ سڑک کے کنارے یا زیرِ زمین ٹیوب اسٹیشن تک پہنچا سکتا تھا۔

پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن کے ٹکٹ گھر سے پہلے واقع زمین دوز بازار کی بھری پری دکانیں پُرشوق سیاحوں وغیرہ کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

لندن میں بھیک مانگنا قانوناً جرم ہے مگر وہاں بھیک منگوں کی ایک پرانی روایت چلی آرہی ہے۔ عام گزرگاہوں کے کنارے کوئی بھی اپنا ہیٹ اُلٹ کر نیچے رکھ دیتا ہے اور پھر دیوار سے ٹک کر گٹار پر اپنی پسندیدہ دھن بھونڈے انداز میں بجانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ گٹار کے تاروں سے نکلنے والے وہ بے سرے سُر ''دے مائی، بابا اللہ کے نام پہ'' کے مترادف ہوتے ہیں۔ بہت سے رحم دل...... راہ گیر اس ہیٹ میں سکے اور بعض اوقات نوٹ تک ڈالتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈیوٹی پر مامور سپاہی بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیتے ہیں اور اس کاروبار میں مداخلت نہیں کرتے۔

بائبل کے ابتدائی ورق کے سہارے اپنے خریداروں تک رسائی کی کوشش کرنے والی سینڈی کی طرح، شہر کے یہ بھکاری بھی قانون سے بچ کر کام کرتے تھے۔ وہ موسیقی نواز تھے۔ ایک کنارے سے بیٹھ کر لوگوں کو اپنے فن سے محظوظ کرتے تھے۔ بن مانگے کوئی اپنی خوشی سے ''انعام'' دے دیتا تھا تو وہ اسے کیسے روک سکتے تھے۔ یہ دیگر بات تھی کہ اپنے مسلسل پروگرام کے دوران میں آس پاس کسی پولیس کو موجود نہ پا کر یہ فنکار بلند آواز میں چیریٹی کی آوازیں لگا کر لوگوں کو اپنے اصل مقصد سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

ہم دونوں نے ٹکٹ گھر کی ایک خالی کھڑکی پر یہ رقم دے کر ٹریول کارڈ خریدے۔ داخلے کے راستے پر باری باری اپنے کارڈ آہنی سلاٹ میں ڈالے۔ کارڈ خود بخود اندر غائب ہو کر دوسرے سرے سے برآمد ہوا۔ کسی نادیدہ آنکھ نے کارڈ کی تاریخ وغیرہ کی تصدیق کی اور رُکاوٹ ہٹ گئی۔ ایک فرد کے گزرتے ہی راستہ پھر مسدود ہو گیا۔ دوسرے آدمی کا کارآمد کارڈ مشین سے گزرے گا تو دوبارہ راستہ بنے گا۔

ٹکٹ اور ٹریول کارڈ کی پڑتال کرنے والی یہ سادہ مشینیں حیرت ناک ہیں۔ ان میں پرانی تاریخ والا کوئی ناکارہ ٹکٹ یا کارڈ ڈالا جائے تو مشین اسے سونگھ کر باہر پھینک دیتی ہے۔ رُکاوٹ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرتی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اسٹیشنوں سے خریدے ہوئے کارڈز پر مشینوں سے تاریخ ڈالی جاتی ہے۔ باہر سے خریدے جانے والے کارڈز پر ہاتھ سے یہ اندرج کیا جاتا ہے مگر مشین ہر اندارج کو بالکل ٹھیک ٹھیک پڑھ لیتی ہے۔ اگر کسی نقص کی وجہ سے کوئی مشین کسی کے جائز کارڈ پر بھی راستہ نہ دے تو لندن ٹرانسپورٹ کا کوئی اہل کار فوراً اس کی مدد کو آتا ہے۔ بیشتر مرکزی اسٹیشنوں پر داخلے اور اخراج کے راستوں پر یہی طریقہ کار ہے۔ مضافات میں چیکر کام کرتے ہیں کیونکہ وہاں مسافروں کا دباؤ بہت کم ہوتا ہے۔

ان تماشوں سے گزر کر ہم نیچے پکاڈلی لائن کے پلیٹ فارم پر پہنچے۔ وہاں تھوڑے بہت فارغ اور بے فکرے سیاح نظر آرہے تھے۔ کاروبار اور ملازمتوں پر جانے والے لاکھوں شہریوں کے ریلے گھنٹوں پہلے ان راستوں کو روند کر گزر چکے تھے۔

پکاڈلی لائن کے ذریعے میں پہلے بھی ہیتھرو کا چکر لگا چکا تھا۔ اس بار میں نے ہیتھرو کے بجائے مخالف سمت میں کاک فوسٹرز کی طرف جانے والی ٹیوب کا انتخاب کیا۔

ہیتھرو سے آنے والی ٹیوب سامان سے لدے پھندے مسافروں سے تقریباً خالی ہو گئی کیونکہ یہاں سے باہر نکلے بغیر بیکرلو لائن کے ذریعے شہر کے اہم ترین حصوں میں پہنچا جا سکتا تھا۔

ہم دونوں کو ڈبے کے آخری سرے پر ایک ایسا

گوشہ عافیت مل گیا جہاں آخر تک کسی کی مداخلت کا امکان نہیں تھا۔ ہم بے فکری سے کھل کر باتیں کرسکتے تھے۔

''تم سے ایک غلطی ہوئی ہے۔'' ویرا نے بیٹھتے ہی مسکرا کر کہا۔

''تم نے صرف دو زون والے ٹریول کارڈ لیے ہیں جب کہ اس ٹیوب کا آخری اسٹیشن پانچویں زون میں ہے۔ وہاں ہم دونوں دھر لیے جائیں گے۔''

''سیاحوں کو ہر جگہ لاعلمی اور بے خبری کا سایہ میسر رہتا ہے۔ میں نے خود اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ ہم کو اسی وقت پکڑا جائے گا جب ہم کاک فوسٹرز پر اسٹیشن سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے۔''

''تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' ویرا نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''باہر نکلے بغیر واپسی کی ٹرین سے پھر اسی طرف لوٹ آئیں گے۔''

''یعنی ہم چوہوں کی طرح گھنٹوں ان ہی سرنگوں میں اِدھر اُدھر سفر کرتے رہیں گے؟''

''ضروری نہیں۔ دل گھبرایا تو سنٹرل لندن میں کہیں بھی اُتر جائیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم ٹریول کارڈ کو پوری طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو۔''

''پوری طرح کہاں؟ پوری طرح تو اس وقت استعمال ہوگا جب ہم سرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں بھی گھومیں گے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''ٹریول کارڈ کا فائدہ یہی ہے کہ کرایہ مقررہ اور سفر لامحدود۔''

ڈبے کے اس حصے میں ان دنوں تمباکونوشی کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ پلیٹ فارموں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ بعد کا قصہ ہے کہ کنگز کراس کے عظیم الشان زیرِ زمین اسٹیشن میں بے پروائی سے پھینکی گئی کسی سلگتی ہوئی سگریٹ سے ایسی ہولناک آگ بھڑکی کہ ذرا سی دیر میں ساٹھ سے زیادہ انسان لقمہ اجل بن گئے۔ اس واقعے کے بعد سے ٹیوب اسٹیشنوں کی حدود اور ٹرینوں میں تمباکونوشی پر مکمل پابندی عائد کردی گئی۔

ویرا نے اپنے لیے سگریٹ سلگائی تو میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

''ہم لوگ ٹریول کارڈ کے فوائد پر اس طرح مذاکرہ کررہے ہیں جیسے لندن ٹرانسپورٹ والوں نے ان کی فروخت کا ٹھیکا ہمیں دے دیا ہو۔ کیا تم دوسرے اہم تر مسائل کو بالکل بھولے ہوئے ہو؟''

''مسائل سے فرار کی کوششوں کو بھولنے کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب ہمیں تن بہ تقدیر ہوکر حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔''

''تم ایک ایسے ذلیل ہوٹل میں جا پھنسے ہو جہاں فون سننے کے لئے کاونٹر پر آنا پڑتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ تمہارے کمرے میں ٹیلی ویژن بھی نہیں ہوگا۔''

''کامن روم میں ٹیلی ویژن ہے۔ میں نے اس پر خبریں دیکھی تھیں۔''

''میں چینل بدل بدل کر تبصرے سنتی رہی ہوں۔ یہ حوصلہ افزا بات ہے کہ ابھی تک دونوں ڈرائیوروں میں سے کوئی سامنے نہیں آیا۔ ان کے بارے میں مسلسل ترغیبی اعلانات کیے جارہے ہیں۔ ان میں سے کسی کو سامنے آنا ہوتا تو وہ اب تک منظرِ عام پر آچکا ہوتا۔''

''بعض لوگ بہت دیر سے فیصلہ کرتے ہیں۔ اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔ ''بس ایک آدھ روز خیریت سے گزر جائے تو ہم یہاں سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ اس کے بعد پولیس ہماری گرد بھی نہیں پاسکے گی۔''

یہاں اور برمنگھم میں چوبیس گھنٹے سن رائز کے نام سے اُردو ریڈیو سروس چلتی ہے جو ٹوٹنگ براڈوے ویمبلے، ساوتھ آل اور وائٹ چیپل وغیرہ کے علاقوں میں کثرت سے سنا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اس دُہرے قتل کو سیکرٹ ایجنسیوں کے کسی تصادم کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔''

ویرا کے اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ ''انہوں نے اس کا کوئی نہ کوئی جواز بھی پیش کیا ہوگا۔''

''گیتا اپنے ہائی کمیشن کے ٹریڈ سیکشن سے وابستہ

ہونے کے باوجود را کی ایجنٹ تھی۔ جیمز پنڈت اس کا مخبر اور ہرکارہ تھا۔ واردات جس پیشہ ورانہ مہارت اور صفائی سے کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی تصادم کی ابتدا تھی۔ اب ایسی ہی کچھ انتقامی وارداتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ سن رائز ریڈیو اُردو اور ہندی بولنے والوں سے اپیل کررہا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں اور اجنبیوں پر گہری نظر رکھیں ورنہ ایسی کسی اور واردات کے نتیجے میں وہ سب بدنام ہوجائیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر کی خبریں بھی نکال لائے ہیں؟'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''اب دیکھنا ہوگا کہ بدری ناتھ اور رمیش اگروال کی آمد پر کیا ہوتا ہے۔''

''ہمیں بدری سے رابطہ کرنے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اول خان کا خیال ہے کہ نک موڈلے کو اس پر شبہ ہوچکا ہے اور لندن میں اس کی کڑی نگرانی کی جائے گی۔''

ویرا چونک پڑی۔ ''اس کے پاس ماسٹر رابرٹ ہوٹل کا فون نمبر ہے لیکن وہ تمہارے موجودہ نام سے بے خبر ہے...... اوہ! تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ وہ بوکھلا کر تمہارا سراغ لگانے کے لیے ہوٹل کی طرف دوڑ لگا دے گا اور اس کی نگرانی کرنے والے ماسٹر رابرٹ ہوٹل تک پہنچ جائیں گے۔''

''اب تمہاری عقل صحیح کام کررہی ہے۔ میرے ذہن میں یہ اندیشہ پہلے سے کلبلا رہا تھا۔''

''اسی لیے تم وہاں سے بھاگے ہو؟'' اس نے تحیر زدہ آواز میں پوچھا۔

''گیتا کے قصے کے ساتھ بدر[illegible]ھ بھی میرے سر پر سوار تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''اور تم مجھے اب بتارہے ہو۔ اس چوہے دان میں میرا کیا بنے گا؟''

''کچھ بھی نہیں۔ وہ تمہیں نہیں پہچانتے۔ ہوٹل میں تم ویرا نہیں، مسز روزی برڈ ہو۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری آمد ایک پاکستانی کی حیثیت سے ہوئی ہے۔''

''تم بلاوجہ فکرمند ہورہی ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سیکرٹ ایجنٹ اپنی سرزمین پر آدم خور شیر سے زیادہ خوں خوار اور خطرناک ہوتا ہے لیکن اجنبی سرزمین پر وہ پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے والا لڑاکا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو ہوٹل کے ریکارڈ تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔''

''مجھے تصادم سے ڈر نہیں لگتا لیکن اب ماسٹر رابرٹ ہوٹل پر دہشت گردی کی کوئی کارروائی بھی ہوسکتی ہے۔ میں مقابلہ کیے بغیر مرجانے پر وہاں سے فرار کو ترجیح دوں گی۔''

''بھول جاؤ۔'' میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ نئی دہلی نہیں، لندن ہے۔ یہاں وہ بھول کر بھی ایسی کسی کارروائی کی حماقت نہیں کریں گے۔''

''جب تم یہاں ایک دو غلے مقامی کو مار سکتے ہو تو انہیں کون روک لے گا۔''

''میں نے جھیل میں پہلا پتھر پھینکا تھا۔ اب ہر طرف شکوک و شبہات کی لہریں ہی لہریں ہیں۔ جب سن رائز ریڈیو والے اندر کی خبریں لا سکتے ہیں تو لندن پولیس متوقع امکانات سے غافل نہیں رہے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی خاموشی سے میدان میں اُتر آئے ہوں۔ وہ انڈین ہائی کمیشن کے ایک ایک آدمی پر کڑی نگاہ رکھیں گے۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' وہ پُرخیال آواز میں بولی۔ ''ہر ملک سفارتی عملے کے بھیس میں اپنے کچھ نہ کچھ خفیہ ایجنٹ ضرور رکھتا ہے۔ یہ بات اب ایک کھلا راز ہے۔ مقامی حکام انڈین ایجنسیوں کو کسی بھی قسم کی انتقامی کارروائی کا موقع نہیں دیں گے۔''

''یہ اس وقت کی باتیں ہیں۔ وہ دونوں یہاں آجائیں۔ اس وقت کوئی صحیح نقشہ سامنے آئے گا۔'' میں نے رسل اسکوائر کے اسٹیشن پر رُکی ہوئی ٹرین سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

رسل اسکوائر پر پورے ڈبے میں ہمارے سوا صرف

دومسافر باقی رہ گئے۔ٹرین آگے چل پڑی۔

’’یہ بتاؤ کہ تمہارا دوست پاکستان کب لوٹ رہا ہے؟‘‘ ویرانے پوچھا۔

’’کس کی بات کررہی ہو؟‘‘ میں نے بے دھیانی میں سوال کیا۔

’’وہی جو کراچی سے یہاں تک تمہارا ہم سفر تھا۔‘‘ اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

’’وہ کل صبح سویرے نکل جائے گا۔آٹھ بجے اس کی فلائٹ ہے۔اس سے تمہیں کیا لینا ہے؟‘‘

’’وہ دفع ہو تو میں بھی ماسٹر رابرٹ ہوٹل سے رائل ہوٹل میں آجاؤں گی۔‘‘

’’کیوں، اس ذلیل ہوٹل میں آکر کیا کروگی؟‘‘ میں نے اس کی کہی ہوئی بات دُہرائی۔’’وہاں کمرے تنگ اور باتھ روم مشترکہ ہیں جہاں عورتیں کرسی پر بیٹھ کر پسندیدہ سُر گنگناتی ہیں۔‘‘

’’ایسے گھٹیا ہوٹل میں رہنا میرے بس سے باہر ہے۔‘‘ ویرانے تنک کر کہا۔

’’تم بھول گئیں کہ ہم افغانستان کے نیم وحشی قبائل کی قید میں شنگارا ویلی میں بھی رہ چکے ہیں جہاں سردار پائندہ گل کے جھونپڑے ہمارا مسکن تھے......‘‘ میں نے اسے یاد دلایا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

’’تازہ کیک میسر ہو تو کوئی احمق بھی بھوسی ٹکڑوں پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔‘‘

’’پھر تم ماسٹر رابرٹ میں ہی رہو۔میرے لیے وہ ہر وقت ایک متبادل ٹھکانا ثابت ہوگا۔‘‘

’’آج کی رات میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کل اس بارے میں غور کروں گی۔‘‘

’’میں تمہیں کہاں لٹکائے پھروں گا۔آج کا دن ویسے بھی بہت اہم ہے......‘‘

’’مجھے معلوم ہے کہ بدری شام کو آرہا ہے۔‘‘ اس نے ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹ دی۔’’میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم اس سے مل بیٹھنے کی کون سی راہ تلاش کرتے ہو۔‘‘

’’تمہاری موجودگی میں، میں کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔ تم ایشیائی مرد اور مغربی عورت پر مشتمل مشتبہ جوڑے وال بات بھول رہی ہو۔زیادہ دیر ہم دونوں کا ایک ساتھ رہ مناسب نہیں ہوگا۔‘‘

’’یہ خطرہ اسی وقت پیدا ہوگا جب کوئی ٹیکسی ڈرائیو بلکہ میرا ڈرپوک ٹیکسی ڈرائیور پولیس کے سامنے آئے گا۔ اس کے سوا پورے لندن میں کسی کو علم نہیں کہ میں پنڈت ک پیچھا کررہی تھی۔‘‘

’’تم محض مجھے زچ کرنے کے لیے یہ خطرہ مول لینے پر تلی ہوئی ہو تو ٹھیک ہے پھر یوں ہی سہی۔ پہلے سے کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ جو ہوگا، دیکھ لیا جائے گا۔‘‘

ٹرین کنگز کراس اسٹیشن پر رُک گئی۔وہ لندن کا ایک بڑا اور معروف جنکشن تھا مگر اس کی اصل رونق کا انداز برٹش ریل کے کھلے پلیٹ فارم پر ہی کیا جاسکتا تھا۔ گہری زمین دوز سرنگوں میں بنے ہوئے ٹیوب اسٹیشن کے سارے پلیٹ فارم کم وبیش یکساں ہی نظر آتے تھے۔

وہاں سے ہمارے ڈبے میں قدرے رونق ہوگئی۔ محض ایک بوڑھی عورت تمباکو نوشی کے عارضے کی وجہ سے ہماری طرف آئی ورنہ بقیہ مسافر اگلے حصے میں پھیل گئے تھے۔

ہم دونوں ان ہی موضوعات میں اُلجھے رہے۔ویرا کی ضد اور چڑچڑے پن کی وجوہ میرے لیے قابلِ فہم تھیں۔ وہ ہمیشہ سے محفل آرائی کی شوقین اور بھیڑ بھاڑ میں گھری رہنے کی عادی تھی۔ اپنوں سے مخاصمت لیے کے بعد وہ اپنے ٹولے سے ٹوٹی تو ہمارے ساتھ آٹکرائی۔ اس مختصر سی ٹکڑی میں اس کی ابتدائی اور بیشتر دلچسپی میری ذات تک محدود تھی مگر وہ رفتہ رفتہ دوسروں سے بھی یوں گھل مل گئی کہ اسے کبھی بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔

کراچی سے روانگی کے بعد جب تک اسے میرا ساتھ میسر رہا، وہ بہلی رہی لیکن میرے الگ ہوتے ہی اس کی طبیعت میں اُکتاہٹ کے ساتھ چڑچڑا پن عود کر آیا۔

اس اُکتاہٹ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ سخت وہمی اور شکی طبیعت کی مالک تھی۔ یہ بات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں جم کر رہ گئی تھی کہ گیتا کے فلیٹ میں کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوئے تھے جن سے وہ بے خبر تھی۔

رائل ہوٹل میں میرے ساتھ سلیم اکبر خان بھی مقیم تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے بارے میں سلیم اکبر خان کے بدلے ہوئے جذبات سے ویرا کو پوری طرح آگاہ کردیا تھا۔اس کے حاسدانہ خیالات کی رو فوراً ایلیزا کی طرف بہک گئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس پولش لڑکی کے ساتھ میرے مراسم کی کیا نوعیت تھی۔

ویرا اپنے کردار کے اعتبار سے ایک عجیب وغریب اور ناقابلِ فہم عورت تھی۔ وہ محض میری دوست تھی لیکن ہمیشہ سے میری ہر بات کو شک وشبے کی نظروں سے دیکھنے کی عادی تھی۔ مجھے بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے باوجود اسے یہ غلط فہمی تھی کہ میں بہت رنگین مزاج تھا اور کوئی بھی عورت ذرا سی کوشش سے مجھے ورغلا سکتی تھی۔ ویرا کی اسی غلط سوچ کی وجہ سے میں نے اس سے شیری رینڈل کا کوئی ذکر نہیں کیا ورنہ اسے کریدنے کے لیے ایک نیا موضوع مل جاتا۔ دوسری طرف میری بیوی غزالہ تھی۔

ایک طویل اور صبر آزما محبوبیت سے گزرنے کے بعد وہ میری بیوی بنی تھی۔ وہ میرے بارے میں ویرا کے دلی جذبات سے پوری طرح واقف تھی لیکن جب سفر کی بات ٹھہری تو اس نے کسی بھی اعتراض کے بغیر مجھے ویرا کے ساتھ کراچی سے روانہ ہونے کی اجازت دے دی۔ یہ اور بات تھی کہ مجھے رُخصت کرنے کے بعد وہ میرے فراق میں دلگیر اور آب دیدہ تھی۔

ٹرین زمین دوز سرنگوں سے نکل کر اب لندن کے مضافات میں سبزے اور کشادہ آبادیوں کے درمیان پڑی ہوئی ریلوے لائن سے گزر رہی تھی۔ گرد وپیش کی وہ نمایاں تبدیلی نظروں کو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی لیکن ویرا مسلسل میرے کان کھائے جارہی تھی۔

فنسبری پارک کے چھوٹے سے مضافاتی اسٹیشن پر ہمارے ڈبے کا آخری مسافر بھی اُتر گیا تو ... دوسرے دروازے سے کالوں کی ایک ٹولی اندر گھسی۔ وہ بھی ہم جیسے انسان تھے مگر یہ ایک افسوس ناک حقیقت تھی کہ اس وقت تک کالوں کے بارے میں میرے تجربات بہت تلخ تھے۔

ٹرین یا ٹیوب ہر اسٹیشن پر بہت قلیل سی مدت کے لیے رکتی ہے۔ چھوٹے اور غیر مصروف اسٹیشنوں پر یہ وقفہ اور بھی کم رہ جاتا ہے۔ اس وقت میں کسی اور ناخوشگوار تجربے کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں ویرا کو اشارہ کرکے سیٹ سے اُٹھا اور ایک ہی لمبی جست میں ڈبے سے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ میرے پیچھے ویرا کے باہر آتے ہی دروازے سسک کر بند ہوئے اور ٹرین آگے چل دی۔

’’کیا ہوا؟ ایک دم ہی یہاں کیوں اُتر گئے؟‘‘ ویرانے سامنے آکر بیزاری سے پوچھا۔

’’یہاں کی فضا میں کچھ سوندھی سی خوشبو رچی ہوئی محسوس ہوئی اور میں اُتر گیا۔‘‘

’’تم جھوٹے ہو۔میرا اندازہ ہے کہ تم کالوں سے ڈر کر ٹرین سے نکلے ہو۔‘‘

’’سمجھ گئی تھیں تو سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘ میں نے بدمزگی سے کہا۔

’’بعض اوقات تم واقعی عقل مند ہو جاتے ہو۔ یہ کالی مخلوق دنیا کے جس خطے میں بھی ہے، عذاب بنی ہوئی ہے۔ ان میں سارے شیطانی اوصاف کوٹ کوٹ کر بھرے ... ہوئے ہوتے ہیں۔‘‘

’’افریقی ملکوں میں تمہیں ایک سے ایک شریف کالا ملے گا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟‘‘ میں نے پلیٹ فارم کے دوسرے رُخ پر جاتے ہوئے تیزی سے کہا۔

’’میں ان کی نہیں، مغربی ملکوں میں پائے جانے والے کالوں کی بات کررہی ہوں۔ نیویارک میں سرِشام بھی لوگ کالوں کے قریب سے گزرتے ہوئے خوف محسوس

کرتے ہیں۔''

''مگر سارے مغربی کالے یکساں نہیں ہوتے۔ تم ان کی جوان نسل کو بے راہ کہہ سکتی ہو۔ روزگار اور تعلیم کے مواقع کی کمی انہیں منتقم مزاج اور تشدد پرست بنا دیتی ہے۔''

''امریکا میں سب کو یکساں مواقع حاصل ہیں۔ تم دیکھو کہ امریکا اور اقوام متحدہ میں کالوں کی کتنی بڑی تعداد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے۔'' ویرا نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''محنتی کالوں نے ہمیشہ اور ہر میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ نسلی طور پر یہ کاہل، کام چور اور تعلیم سے بیزار ہیں اسی لیے پسماندہ اور جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔''

ویرا شاید ٹھیک کہہ رہی تھی۔ دنیا کے ہر ملک میں تعلیم، روزگار اور ترقی کے میدان میں جا بجا طبقاتی تفریق نظر آتی تھی اور ہر خطے میں اس کے واضح اسباب کی نشان دہی ہوتی رہتی تھی لیکن سفید فام قوموں کے ساتھ رہنے بسنے والے کالے لوگ بلا استثنیٰ ہر جگہ پسماندہ نظر آتے تھے۔ اس بارے میں ان کی نسلی شناخت دوسرے اسباب پر بھاری نظر آتی تھی۔

''یہ تمہارے سماجی اور معاشرتی تجزیے ہیں۔ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔'' میں نے اس موضوع کو وہیں ختم کرتے ہوئے ویرا سے کہا۔ ''اس وقت بات صرف اتنی سی تھی کہ اس ڈبے میں کالوں کے ساتھ صرف ہم دونوں تھے۔ ان میں سے کئی نے ڈبے میں سوار ہوتے ہی حریص نظروں سے تمہاری طرف دیکھا تھا اور میں نے یہیں اُترنے کا فیصلہ کرلیا۔''

''تم نے اچھا کیا لیکن خطرہ ہم دونوں کو ہی لاحق ہوگیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ میں اپنا دفاع کرنا اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میری مرضی کے خلاف میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے تھے۔''

''ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ حجام نہیں تھے جو ہاتھ آئی ہوئی ایک سالم دوشیزہ کو بھول کر اس کے بال سیدھے یا ٹیڑھے کرنے بیٹھ جاتے۔ اب زیادہ باتیں نہ بناؤ مجھے یہ سوچنے دو کہ ہمیں واپسی میں کہاں اُترنا چاہیے۔''

''اگر تم کوئی منصوبہ نہیں بنا رہے ہو تو کہیں بھی اُترا جاسکتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''میں کراچی فون کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میرے ساتھ مسلسل باتیں کرتے ہوئے بھی تمہارا ذہن کام کررہا تھا؟''

''مجبوری تھی...... ہم یہاں تفریح کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ بدری یہاں آکر آگے روانہ ہوجائے اور ہم اس سے رابطہ بھی نہ کرسکیں۔''

''مجھے بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ شاید میں تمہیں کوئی مشورہ دے سکوں۔''

''فی الحال مجھے تمہارے کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ ہم واپسی پر کنگز کراس پر ہی اُتریں گے۔ میں کراچی سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دونوں لندن کس وقت پہنچ رہے ہیں؟''

''بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' ویرا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم خود اس سے رابطہ کرو گے۔''

''اپنی ننھی سی کھوپڑی پر زور دے کر تم آخرکار بات سمجھ ہی لیتی ہو۔ یہ ایک اچھی بات ہے۔'' میں نے اس کی پشت پر تھپکی دے کر کہا۔

اسی وقت مخالف سمت سے آنے والی برقی ٹرین تیز رفتاری سے نمودار ہوئی اور پلیٹ فارم کے ساتھ لگ گئی۔ دروازے کھلے اور پلیٹ فارم پر موجود دوسرے مسافروں کے ساتھ ہم بھی اس میں سوار ہوگئے۔ اس وقت بھی بیشتر نشستیں خالی تھیں۔

یہ لندن ٹرانسپورٹ والوں کی اعلیٰ منصوبہ بندی تھی کہ دفتری اوقات میں رش میں وہ ٹرینوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے مسافروں سے کرائے کی مد میں اتنی رقوم حاصل کرلیتے تھے کہ دن کے باقی اوقات میں شہریوں کی سہولت کے لیے تقریباً خالی ٹرینیں بھی دوڑانے کے متحمل ہوسکیں۔ اس کے برعکس ہماری لوکل اور سرکلر ریلوے کا یہ حال تھا کہ مسافروں سے جائز اور پورا کرایہ وصول نہ کرنے کی وجہ سے ہر وقت خسارے کا رونا رویا جاتا تھا اور اس خسارے میں کمی کرنے کے لیے اصل کوتاہی پر توجہ دینے کے بجائے اوقات اور ٹرینوں کی تعداد میں آئے دن ردوبدل کرکے نت نئے احمقانہ تجربات کیے جاتے تھے جن کی وجہ سے مسافر ان سہولتوں سے بیزار رہتے تھے۔

کنگز کراس ٹیوب اسٹیشن کی زمین دوز بھول بھلیوں سے باہر ایک نئی رنگا رنگ دنیا ہماری منتظر تھی مگر میری نظریں فون بوتھ کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ وسیع ہال میں مختلف راستوں اور سہولتوں کی نشاندہی کے لیے نمایاں بورڈ آویزاں تھے۔ ان کی مدد سے ہم جلد ہی ایک قطار سے لگے ہوئے پبلک فونز تک پہنچ گئے۔ ان میں سے بیشتر ریزگاری سے چلنے والے پرانے فون تھے اور چند جدید کارڈ فون تھے۔

میں نے بوتھ میں داخل ہوکر نمبر ملانا شروع کیا تو ویرا بھی میرے قریب موجود تھی۔

سلسلہ ملنے پر.... دوسری طرف سے سلطان شاہ نے ریسیور اُٹھایا اور پھر اس نے بین الاقوامی کال کی مخصوص بیپ سنتے ہی اندازہ لگالیا کہ وہ کال میری ہی ہوسکتی تھی۔

''ہمیں تمہارے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔'' سلام دُعا کے بعد سلطان شاہ نے کہا۔ ''وہ دونوں تمہارے وقت کے مطابق شام چھ بجے لندن پہنچ رہے ہیں۔ ان کے پہنچتے ہی تمہارا کام شروع ہوجائے گا۔ یہاں سے ان کی روانگی غیر یقینی حالات میں ہوئی ہے......''

''ہمارا کام یہاں پہنچتے ہی شروع ہوگیا تھا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اول خان سے تمہاری تفصیلی بات نہیں ہوسکی ہے۔''

سلطان شاہ کے ایک گہرے سانس کے بعد اس کی آواز اُبھری۔ ''تمہارے جاتے ہی اس کا رویہ بدل گیا ہے۔ کام کے معاملے میں وہ سختی سے رازداری برقرار رکھنے والا تند خو افسر نظر آتا ہے۔ اس موضوع پر زیادہ بات ہی نہیں کرتا۔ ویسے نرم اور دوستانہ انداز میں پیش آتا ہے۔''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے ہنس کر سوال کیا۔ ''میں ابھی اس کی گوشمالی کرتا ہوں۔''

''پتا نہیں وہ کہاں ہوگا۔ اس سے بات ہو تو میری شکایت کا ذکر نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ برا مان جائے۔ وہ جیسا بھی ہے، ایک اچھا اور قابلِ اعتماد دوست ضرور ہے۔''

''اور شاید غزالہ بھی تمہارے آس پاس نہیں ہے ورنہ وہ اب تک تمہارے ہاتھ سے ریسیور چھین چکی ہوتی۔'' میں نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

''کل رات اول خان کی فیملی واپس آگئی ہے۔ آج وہ اسی طرف گئی ہوئی ہے۔ ڈیوٹی سے واپسی پر اول خان اسے یہاں چھوڑ دے گا۔'' سلطان شاہ نے مجھے آگاہ کیا۔ ''تمہارے جانے کے بعد وہ سخت ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس کا دھیان بانٹنے کے لیے اول خان آج صبح خود ہی اسے یہاں سے لے گیا تھا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ تمہیں کتنا ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ اگر وہ اپنے جذبات کے اظہار پر قابو رکھنے کی صلاحیتوں کی مالکہ اور پڑھی لکھی نہ ہوتی تو لیلیٰ مجنوں کے قصے تازہ ہوچکے ہوتے۔''

''فضولیات میں وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ایک ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ کل تم نے روزی سے کیا بکواس کی تھی۔''

''روزی!'' سلطان شاہ کی تحیرزدہ آواز اُبھری پھر اسے فوراً ہی یاد آگیا کہ کراچی چھوڑتے ہوئے ویرا مسز روزی برڈ بن چکی تھی۔ اس نے بوکھلا کر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مم...... میں نے تو اس سے کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں کی تھی۔''

اُدھر سلطان شاہ میرے بے ساختہ سوال پر سٹپٹا گیا تھا، اِدھر ویرا نے مضطرب ہو کر میرے ہاتھ سے ریسیور چھیننے کی ناکام کوششیں شروع کر دیں۔ کامیابی نہ ہونے پر وہ ماؤتھ پیس کے قریب منہ لا کر تیزی سے بولی۔ ''اسلم کے اس فراڈ میں نہ آنا۔ میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ یہ زبردستی تم سے کچھ اُگلوانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں نے زبردستی ویرا کو دور دھکیل دیا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''اس کی لوریاں تمہیں اسی قدر ستا رہی ہیں تو میں پہلی پرواز سے اسے واپس بھیج سکتا ہوں۔''

''خدا کی قسم، ایسی کوئی بات نہیں ہے...... ابھی اس نے خود کہا ہے کہ اس نے تم سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ہے۔ ذرا ریسیور اسے دے دو تو میں اس سے پوچھوں کہ وہ میرے خلاف کیا زہر فشانی کر رہی ہے۔ ساری بکواس وہی کرتی رہی تھی۔ تم غزالہ سے پوچھ لینا کہ میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے روزی سے کہا جانے والا ایک ایک لفظ خود سنا تھا۔''

پچھلی رات ویرا نے خود ہی فرمائش کی تھی کہ کراچی والے اس سے بات کر لیں۔ میں نے بھی ہمدردانہ طور پر اول خان کو وہی مشورہ دیا تھا لیکن ویرا نے اس کال کے بارے میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ میں نے ابتدا ہی سے ویرا کے اس گریز کو محسوس کر لیا تھا لیکن دانستہ اسے نہیں چھیڑا تھا لیکن سلطان شاہ میری باتوں میں آ کر خود ہی واضح اشارے دے بیٹھا تھا اور اب ویرا اس گفتگو کو جلد از جلد ختم کرانے کے لیے بے چین ہوئی جا رہی تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ سلطان شاہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

''غزالہ سے بات ہو گی تو میں اس سے بھی پوچھ لوں گا۔ اگر ویرا سے بچھڑ جانے کے بعد تم اپنے دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش محسوس کر رہے ہو تو بے تکلف ہو کر مجھے بتا دو۔ اسے راضی کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''یہ تم کیا خرافات بول رہے ہو۔'' اس کی بھنائی ہوئی آواز اُبھری۔ ''آخر تم میری بات پر بھروسا کیوں نہیں کرتے۔ میں روزی جیسی واہیات عورت کو دور ہی سے سات سلام کرتا ہوں۔''

''میں تمہارا سلام اسے پہنچا دوں گا۔'' میں نے ویرا کو آنکھ مار کر پورے خلوص اور سنجیدگی سے کہا۔

''سلام نہیں سات سلام۔'' سلطان شاہ غصے میں تقریباً چیخ پڑا۔ ''سات سلام کا مطلب صرف اور صرف لعنت ہوتا ہے۔ اب مجھے زیادہ غصہ نہ دلاؤ ورنہ میں فون بند کر دوں گا۔''

''ایسا نہ کرنا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے ایک ضروری کام سے فون کیا ہے۔''

''جلدی سے بتا ڈالو۔ اب میرا پارہ تیزی سے چڑھ رہا ہے۔'' وہ واقعی غصے میں تھا۔

''تمہیں سلیم اکبر خان والے قصے کا علم تو ہو گا؟'' میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس فون پر ہی بے سروپا اشارے سنے ہیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ اب اول خان مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ تمہارے فون کے بعد اس نے سلیم اکبر خان کے کسی دفتر کی سیل کے بارے میں یہاں سے دو تین فون کیے تھے۔ تمہارے قصے میں یہ نام بالکل ہی نیا اور اجنبی ہے، یہ کون ہے؟''

''میں تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ پوچھو گے تو اول خان تمہیں پوری کہانی سنا دے گا۔ بس اسے یہ بتا دینا کہ سلیم کل صبح آٹھ بجے والی پرواز سے کراچی کے لیے روانہ ہو گا۔''

''شاید یہ بھی کوئی شکار ہے۔'' اس کی استفہامیہ آواز اُبھری۔ ''یہاں سے بدری بھیجا گیا۔ اس کے بدلے میں وہاں سے سلیم آ رہا ہے......ٹھیک ہے۔ میں اسے بتا دوں گا۔''

''شہر کی مزید کوئی سرگرمی یا خیر خبر؟'' میں نے اسکرین پر کارڈ کے گھٹتے ہوئے یونٹوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''امن وامان کی کیا حالت ہے؟''

سلطان شاہ تلخی سے ہنس پڑا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ

لندن کی ہوا کھا کر تم بالکل ہی معصوم اور سادہ لوح ہو گئے ہو۔ برسوں سے امن وامان میں کوئی بہتری ہوئی ہے جو تین دنوں میں کوئی تبدیلی آ جاتی۔ سب کچھ جوں کا توں ہے، تم واپس آؤ گے تب بھی سب یوں ہی ملے گا۔''

''کسی وقت جہانگیر کی خیر خبر لے لینا۔ اسے میرے سفر کی پوری کتھا سنانے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ کہہ دینا کہ آج کل شہر سے باہر ہوں۔ موقع ملا تو کسی وقت میں خود بھی اسے فون کر لوں گا۔''

میرا فون کارڈ خاصا مہنگا تھا۔ طویل بات ہونے کے بعد بھی کافی یونٹ بچے رہے۔ گفتگو کا موضوع بدل جانے کے بعد ویرا نے ریسیور چھین کر سلطان شاہ سے بات کرنے کی کوششیں ترک کر دی تھیں۔ میرے فون بند کرنے پر بھی اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا۔

''میں نے صبح نو بجے ناشتا کیا تھا۔ اب دو بج رہے ہیں، کیا ارادہ ہے؟'' فون بوتھ سے ہٹتے ہی ویرا نے اپنے پرس کو فضا میں جھلاتے ہوئے بے فکری سے پوچھا۔

''آؤ، آج کوئی دیسی کھانا کھاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں دوبارہ ٹیوب اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔

لندن میں صبح سے لے کر رات گئے تک لاکھوں لوگ بر سر زمین رہتے ہیں تو بلامبالغہ لاکھوں ہی افراد ٹیوب کی زمین دوز دنیا میں ہر وقت متحرک، منتظر یا مصروفِ سفر رہتے ہیں۔

کنگز کراس سے وکٹوریہ لائن کی ٹیوب لے کر ہم آکسفورڈ سرکس پہنچ گئے۔ وہاں ساز و سامان کے ہلکے اور بھاری تھیلوں سے لدے پھندے مرد و زن دوسرے لوگوں سے زیادہ نمایاں تھے۔

میں آکسفورڈ اسٹریٹ چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پر گھوما تو ویرا بولے بغیر نہ رہ سکی۔ ''تم دیسی کھانے کے لیے کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''کسی پاکستانی یا انڈین ہوٹل میں ہی مطلب کی چیزیں مل سکیں گی۔''

''سوچ لو۔ وہاں آنے والوں میں ان ہی قومیتوں کے لوگ ہوں گے۔ گیتا کا قصہ تازہ ترین ہے۔ ہمیں ایسی جگہوں سے گریز ہی کرنا چاہیے۔''

اس نے میری توجہ بہت اہم نکتے کی طرف مبذول کرائی تھی۔ میں نے فوراً ہی وہ ارادہ ملتوی کر دیا اور ویرا کو لے کر قریبی ومپی ریستوران میں گھس گیا۔ فاسٹ فوڈ کو یورپ اور امریکا میں ماہرین صحت جنک فوڈ یا ناکارہ غذا کا نام دیتے ہیں لیکن نئی نسل کے ساتھ معمر لوگوں میں بھی ان کھانوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت حیران کن نظر آتی ہے۔ بیشتر بڑے شہروں میں لاکھوں کا یہ دھندا ملٹی نیشنل چین کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو جہاں بھی بیٹھ جائے، جم جاتا ہے اور پھر اس پر ہن برسنے لگتا ہے۔

کھانے پینے اور اس کے بعد لندن کی کوچہ نوردی کے دوران میں ویرا سے دنیا جہان کے موضوعات پر بات کرتا رہا لیکن میرا ذہن اسی پیچ میں اُلجھا ہوا تھا جو بدری کی آمد سے پیدا ہو رہا تھا۔

میرا اس سے ملنا ناگزیر تھا۔ ہمارے اگلے پروگرام کا انحصار اسی ملاقات پر تھا لیکن کوئی بڑا خطرہ مول لیے بغیر وہ ملاقات ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں اپنے ذہن پر ہر زاویے سے زور دے رہا تھا پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خاکہ سر اُبھارنے لگا۔ اس پر عمل کر کے کامیابی کی کوئی نہ کوئی راہ نکالی جا سکتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ اس لائحہ عمل میں ویرا کی موجودگی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دوسری طرف ویرا کسی بھی طرح میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اس نے اپنی وہ رات ماسٹر رابرٹ ہوٹل کے بجائے سینٹرل لندن میں میرے ساتھ بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس قدر زود رنج طبیعت کی مالک تھی کہ میرے لیے اُس سے اس موضوع پر بات کرنا دشوار نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں آئے ہوئے منصوبے کو ٹٹولا۔ ویرا کی گنجائش نہیں نکل سکی۔

''تم اپنے ہوٹل کب لوٹو گی؟'' کچھ دیر کے

غور وخوض کے بعد میں نے معصومیت سے پوچھا۔
''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔'' وہ تنک کر بولی۔
''میں کہہ چکی ہوں کہ واپسی کے بارے میں کل غور کروں گی، آج میں واپس نہیں جا رہی۔''
''تو کیا مجھے اپنا میزبان بنانا چاہ رہی ہو؟'' میں نے بے چارگی سے پوچھا۔
''ایسا ہو سکے تو کیا بات ہے؟'' وہ خوش ہو کر بے ساختہ بول اٹھی۔
''کیسے ہو سکے گا؟'' میں نے مسمی آواز میں پوچھا۔
''سلیم اکبر خان بھی رائل ہوٹل میں مقیم ہے۔ وہ تم کو پہچانتا ہے۔ صبح اس کی روانگی ہے۔ وہ آج شام میرے ساتھ ضرور مل بیٹھنا چاہے گا۔''
''اس پر لعنت بھیجو۔ وہاں سے غائب ہو جاؤ۔ ہم دونوں کسی اور ہوٹل میں رات گزار لیں گے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ وہ جب بھی مجھے زچ کرنے کا فیصلہ کر لیتی تھی تو عام طور پر اسی انداز میں بے نیازی کے مظاہرے پر اُتر آتی تھی۔
''اس کے جانے سے پہلے میری اس کی ملاقات ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس سے کوئی کام کی بات اُگلوا سکوں۔'' میں نے زور دے کر اسے سمجھانا چاہا۔
''تم اس کے پیچھے پڑے رہے تو بدری کا کیا ہو گا؟'' اس نے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اگر وہ کل ہی یہاں سے نیو یارک روانہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ ہم یہیں جھک مارتے رہ جائیں گے۔''
''میں اس بارے میں بھی کچھ سوچوں گا۔'' میں نے پورے خلوص سے وعدہ کیا۔
وہ رُک کر چند ثانیوں تک میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر دوبارہ چلتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے چکما دے کر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہ رہے ہو۔ اس وقت تمہارے [illegible] میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں [illegible] تک تم کوئی ٹھوس سبب نہیں بتاؤ گے [illegible] تمہارے ساتھ لگی رہوں گی۔''

''سلیم اور بدری سے زیادہ ٹھوس ثبوت میں کہاں سے لاؤں؟'' میں نے بے بسی سے پوچھا۔
''سلیم اب تمہارا دردِ سر نہیں رہا۔ اول خان اس سے کھایا پیا تک اُگلوا لے گا۔ بدری کے بارے میں تم ابھی تک اگر مگر کا شکار ہو۔ میں تمہاری ان بودی باتوں کو کیسے مان سکتی ہوں۔''
''سلیم کی بتائی ہوئی کوئی بات ہمارے کام کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے اول خان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ سلیم مدن موہن کے لیے کام کر رہا تھا اور وہ راکا آدمی تھا۔ راکا نیٹ ورک بہت منظم اور مربوط ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لندن میں کسی ایجنٹ نے سلیم سے رابطہ کیا ہو۔ محض تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے میں ان قوی امکانات کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔''
میرے اس نکتے میں ذرا بھی وزن نہیں تھا۔ بس ویرا سے بات کرتے ہوئے وہ دلیل برجستہ میرے ذہن میں آ گئی تھی اور میں اسے چکر دینے کے لیے بے تکان بولتا چلا گیا۔
وہ فوراً کچھ نہ بولی، سوچ میں پڑ گئی۔ شاید وہ میرے آخری فقروں کو اپنے ذہن میں تول رہی تھی۔ آخر کار وہ قائل ہو کر بولی۔ ''ٹھیک ہے میں مانے لیتی ہوں کہ سلیم سے تمہاری ملاقات سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔''
''گڈ!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے ہوٹل چلی جاؤ گی۔''
''یہ میں نے کب کہا؟'' اس نے بے رُخی سے پوچھا پھر مکا فضا میں لہرا کر بولی۔ ''کان کھول کر آخری مرتبہ پھر سن لو کہ میں آج رات ان ہی اطراف میں کہیں بسر کروں گی۔ ابھی چل کر کسی ہوٹل میں ڈبل روم بک کراؤ۔ میں تمہیں دو تین گھنٹے کی مہلت دے دوں گی۔ سلیم سے مل کر تم [illegible] آ جاؤ گے۔''
''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''سلیم کے ساتھ باتوں میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔''
''ایسی صورت میں تم دیر سے بھی آ سکتے ہو لیکن یہ

دھیان رکھنا کہ سلیم کے بہانے تم کہیں غائب ہوئے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' ویرا نے پورے سکون سے کہا۔ ''تم نے رائل ہوٹل کا فون نمبر مجھے دیا ہوا ہے۔ میں وقفے وقفے سے فون کر کے تمہاری وہاں موجودگی کی تصدیق کرتی رہوں گی۔''
میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے بھنا کر کہا۔ ''تم میرے اوپر ایسی ناروا پابندیاں نہیں لگا سکتیں۔ میں تمہارا زرخرید غلام نہیں ہوں۔ میری مرضی کہ میں سلیم سے ملوں یا کہیں اور جاؤں۔''
اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ اس نے ملائمت سے کہا۔ ''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ شریف بچے کی طرح مجھے اپنے اصل ارادوں سے آگاہ کر دو۔ مجھے دھوکا دے کر تم کہاں جانا چاہ رہے ہو؟ کیا لندن میں بھی تمہیں گھربار والی کوئی نادرہ مل گئی ہے؟''
نادرہ کے نام پر میں بھڑک اُٹھا۔ خود پُرسکون رہ کر وہ اپنی زہریلی باتوں سے میری ہڈیاں تک سلگائے دے رہی تھی۔ ''تم نے نادرہ کا نام کیوں لیا؟ اس وقت اس کی کیا تک تھی؟''
''نام نہیں، میرے لیے وہ ایک علامت ہے۔ تم پر خود سے ریجھنے والی احمق عورتوں کی علامت۔ آج میری بات لکھ لو کہ تم اپنے کسی چالاک دشمن کے ہاتھوں نہیں، کسی بے وقوف محبوبہ کے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔''
''یہ تم جیسی چالاک اور مکار لومڑی کہہ رہی ہے۔'' میں نے زہرخند کے ساتھ کہا۔ ''ایک طرف تم سلطان شاہ سے عشق کی پینگیں بڑھا رہی ہو اور یہاں میرے ساتھ شب بسری پر مصر ہو۔ تمہیں اپنی ان حرکتوں پر شرم نہیں آتی؟ آخر تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟''
موقع ملتے ہی میں نے بدترین الفاظ میں اس کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔
''اس وقت تم گالیاں دے کر اور تھپڑ مار کر بھی مجھے غصہ نہیں دلا سکو گے۔'' ویرا نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ بدستور مسکرائے جا رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تم لڑ کر مجھ سے الگ بھی ہونا چاہو گے تو میں چند قدم پیچھے رہ کر قبر تک تمہارا تعاقب کروں گی۔ میں دیکھتی ہوں کہ آج تم مجھ سے بچ کر کہاں جاتے ہو۔ نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ مجھے اپنے اصل پروگرام سے آگاہ کر دو۔''
ویرا اس وقت اپنے اصل اور پرانے روپ میں واپس آ چکی تھی۔ اس نے خود ہی واضح کر دیا تھا کہ میری کوئی مصلحت آمیز اشتعال انگیزی بھی اُسے اُس کی راہ سے نہیں ہٹا سکے گی۔ میں نے باعزت انداز میں ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سلطان شاہ والی بات کا جواب گول کر دیا۔''
''اس کا جواب تم خود جانتے ہو۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میرے نزدیک وہ ماں کے پروں کے نیچے سے نکل کر گھونسلے سے گرا ہوا چڑیا کا ایک ننھا سا بچہ ہے۔ میں اسے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر واپس اس کی جگہ پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ خوف زدہ ہو کر چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے۔ اس جیسے خوف زدہ چوزے کو صرف پیار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے عشق کی گھاتیں کون لڑائے گا۔''
''اور اس ناچیز کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔
''ناچیز نہیں، تم تو چیز ہو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ تمہیں یوں ہی سالم روسٹ کر کے کسی بڑے ڈیپ فریزر میں محفوظ کر لوں اور پھر ساری عمر تمہارے پارچے تل تل کر لطف اندوز ہوتی رہوں۔ غزالہ خوش نصیب ہے کہ اسے تم جیسا ساتھی ملا ہے۔''
''تمہارے الفاظ سے ایذا رسانی کی بو آ رہی ہے۔ تم تو نادرہ سے بھی بدتر ہو۔''
''ہاتھ آئی ہوئی ہر چیز ہاتھ سے نکل جانے والی چیز سے بدتر معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب بھاگنے کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟''

''میرا کسی وقت بھی بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم بلاوجہ اپنی باتوں سے مجھے تاؤ دلا رہی تھیں۔''

''تو پھر چلو۔ کسی اچھے ہوٹل میں کمرا بک کرا لیتے ہیں۔'' اس بار وہ خوش ہوگئی۔

''کمرا بک کرانے کے بعد ساڑھے چار پانچ بجے تک میں سلیم کی طرف نکل جاؤں گا۔''

''تو کیا تم سلیم سے ملاقات کے بارے میں اسی قدر سنجیدہ ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تم سے مذاق نہیں کر رہا تھا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کرے گا۔''

''تم وہاں سے غائب نہیں ہوگے!'' اس نے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔

''فون کرکے چیک کرتی رہنا۔ سلیم ہی کہیں لے گیا تو مجبوری ہوگی۔''

وہ منہ سے کچھ نہ بولی لیکن اس کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کے سائے لرزاں تھے۔ میں نے غصے پر قابو پا کر آخر کار اسے قدرے اعصابی تناؤ میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس وقت ہم آکسفورڈ اسٹریٹ کے متوازی چلنے والی ایک بڑی سڑک پر تھے۔ وہاں سے ہم نے ہوٹل کی تلاش کی مہم کا آغاز کیا اور پھر ایک بڑے پارک کے قریب واقع ہوٹل میں جملہ سہولتوں سے آراستہ کمرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

ہمارے ساتھ کوئی ساز و سامان نہ دیکھ کر ہوٹل کے بکنگ کلرک کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی ان اطراف کی گلیوں اور بازاروں میں عارضی طور پر بننے والے جوڑوں کی میزبانی شاید اس کے روزمرہ فرائض میں شامل تھی۔ اس نے ایک رات کا پیشگی کرایہ لے کر چابی ہمیں تھما دی۔

مسز رینا لڈ نے رائل ہوٹل میں سرکاری سراغ رسانوں کی غیر متوقع آمد کی وجہ سے مجھے سویرے ہی ہوٹل سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس وقت سے میں مسلسل چل رہا تھا۔ آرام دہ اور صاف ستھرا بستر سامنے آتے ہی میں جوتوں سمیت وہیں دراز ہوگیا۔

ویرا میری مزاج آشنا تھی۔ شاید اس نے میری آنکھوں میں تکان کے آثار پڑھ لیے تھے اور کسی گھر مشرقی دوشیزہ کی طرح اپنی مخروطی انگلیاں ہولے ہولے میرے بالوں میں پھیرنے لگی۔

میرے وجود میں سرور کی لذت انگیز لہریں سی سرایت کرنے لگیں اور میں نے آنکھیں موند لیں۔

میرے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو سکا کہ وہ سرور کب گہری نیند میں تبدیل ہوگیا۔ دوبارہ میری آنکھ اسی وقت کھلی جب ویرا نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔

میں نے غنودہ آنکھوں سے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور اُچھل کر بستر سے نیچے آگیا۔ گھڑی کی سوئیاں شام کے آٹھ بجا رہی تھیں اور ویرا اپنے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ بکھیرے پوری تیاری کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔

''تمہیں معلوم تھا کہ مجھے سلیم کے پاس جانا ہے پھر تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''پتا نہیں رائل ہوٹل میں تم نے رات بھر کون سی مشقت کی تھی کہ اس وقت گدھے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔'' اس نے ترکی بہ ترکی تیزی سے جواب دیا۔ ''تم میری چوتھی کوشش میں بیدار ہوئے ہو۔''

''بدری کو بھی چھ بجے پہنچنا تھا۔ کام کا سارا وقت غارت ہوگیا۔''

''بدری کے جہاز کو چھ بجے انڈین ہائی کمیشن پر نہیں بلکہ ہیتھرو ائرپورٹ پر لینڈ کرنا تھا۔ امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہو کر اتنی دور آنے میں وقت لگتا ہے۔ اس سے کوئی رابطہ کرنے کا ارادہ ہے تو یہی وقت موزوں ہے مگر اس سے رابطہ کیسے ہوگا؟''

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیے بغیر غسل خانے میں گھس گیا۔

تازہ دم ہونے کے بعد میں باہر آیا تو دیوار گیر ہینگر سے لٹکا ہوا رنگین ٹیلی ویژن چل رہا تھا۔ اس پر دُہرے قتل کی واردات پر شہریوں کا ردِعمل جاننے کے لیے کیا جانے والا ایک سروے دکھایا جا رہا تھا۔

سلیم رائل ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی کیونکہ میں خود بھی اسی ہوٹل کا مکین تھا لیکن بدری ناتھ کا معاملہ مختلف تھا۔ میرے پاس اس کا دیا ہوا صرف ایک فون نمبر تھا جو انڈین ہائی کمیشن کے ٹریڈ سیکشن کا تھا جو مقررہ دفتری اوقات کے بعد بے مقصد ثابت ہو سکتا تھا۔ میرا پچھلا تجربہ اس بات کا جواز تھا کہ اس نمبر پر دفتری اوقات کے بعد بھی کوئی نہ کوئی موجود رہتا ہے مگر ایسے وقت پر بدری ناتھ کا وہاں موجود ہونا خارج از امکان تھا۔

یہ بات یقینی تھی کہ بدری اور رمیش کی رہائش کا بندوبست ہائی کمیشن کے کسی ملازم کے گھر پر یا ہوٹل میں کیا جاتا اور میرے پاس وہاں کا کوئی حوالہ موجود نہیں تھا۔

لندن میں اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ انڈین حکام فون پر آنے والی کالز کی مانیٹرنگ کر سکیں مگر یہ اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ گیتا کے قتل کی واردات کے بعد اسکاٹ لینڈ یارڈ یا کسی دوسرے مقامی ادارے کے اہل کار انڈین ہائی کمیشن میں آنے والی کالز ریکارڈ کر رہے ہوں۔

اس خطرے کی بنا پر میں اس کمرے سے براہ راست فون کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کام کے لیے ابتدا سے ہی کوئی پبلک بوتھ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد میں نے ویرا سے رائل ہوٹل جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے بدری ناتھ کی فکر لاحق ہوگئی۔ میں نے اس بارے میں کسی نتیجے پر نہ پہنچنے کا عذر پیش کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

کاؤنٹر سے ہوٹل کا کارڈ لے کر میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مجھے ایک فون بوتھ مل گیا۔ اتفاق سے وہ کارڈ فون ہی تھا۔ ریزگاری کی تلاش میں اپنی جیبیں ٹٹولنے کی زحمت سے بچ کر میں نے فون کارڈ کی مدد سے بدری ناتھ کا دیا ہوا نمبر ملایا تو پہلی ہی گھنٹی پر ریسیور اُٹھا لیا گیا۔

''انڈین ہائی کمیشن ٹریڈ سیکشن' میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' انگریزی میں سوال کیا گیا۔ وہ آواز سن کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں نے آواز پہچان لی۔ وہ وہی تھی جس سے مذکرات کے بعد گیتا میری دلجوئی کے لیے پہنچی تھی۔

جس طرح میں نے وہ نسوانی آواز پہچان لی تھی اسی طرح وہ عورت بھی گیتا کو طلب کرنے والے کی آواز پہچان سکتی تھی۔ وہ ایک سنگین مرحلہ تھا۔

''کیتھی!'' میں نے اپنی آواز بدل کر ذرا تیزی سے کہا۔ اس وقت میرا دل یک بہ یک کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ پہلے کی طرح اس بار بھی میری کوئی شناخت طلب نہ کر بیٹھے۔

''میں بدری ناتھ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''سوری سر! وہ آچکا ہے لیکن اس وقت یہاں نہیں ہے۔'' اس کا جواب سن کر میری جان میں جان آگئی۔ اس بار میں نے کوئی مطالبہ کرنے کے بجائے ایک سادہ سی خواہش کا اظہار کیا تھا اس لیے جواب دینے سے پہلے میری شناخت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

''اس سے رابطے کے لیے تمہیں دوسرا نمبر ملانا ہوگا۔'' نسوانی آواز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ میں قلم لے لوں۔'' میں نے اپنے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں میں کہا۔

لمحہ بھر کے بعد اس نے ایک نمبر بتا دیا جو میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر نوٹ کر لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اسے اسی نمبر پر ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ مسٹر سری نواسن کا گھر ہے۔''

میں نے شکریہ ادا کرکے فون بند کر دیا۔

لندن میں صورتِ حال بگڑنے کے بعد میرے

لیے بدری ناتھ سے رابطہ کرنا ایک بڑا اور وقت طلب مسئلہ نظر آ رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری وہ مشکل اتنی آسانی سے حل ہو جائے گی۔

بوتھ سے نکل کر میں چند ثانیوں تک کچھ سوچتا رہا۔ سری نواسن کے گھر کا نمبر مل جانے کے بعد میں بے خوف ہو کر بدری ناتھ سے بات کر سکتا تھا۔ اس کے لیے رائل ہوٹل کسی طرح مناسب نہیں تھا کیونکہ وہاں کا اکلوتا فون کھلی راہداری میں رکھا رہتا تھا اور پھر وہاں سلیم اکبر خان کے روپ میں ایک ایسا شخص موجود تھا جو اردو کا ایک ایک لفظ بخوبی جانتا تھا۔

میں واپس اسی ہوٹل کی طرف ہو لیا جہاں ویرا اکیلی تھی۔ کمرے کے دروازے پر میری دستک کا جواب قدرے تاخیر سے آیا۔ میری آواز سنتے ہی ویرا نے بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا۔ چند منٹ بعد ہی مجھے دوبارہ موجود پا کر اس کی آنکھوں میں خوش گوار حیرت تیرنے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر کھینچ لیا۔

''اس وقت جو کامیابی ہوئی ہے اس کی بنا پر میں نے آج کے جھگڑے سمیت تمہاری ہر خطا معاف کر دی ہے۔'' میں نے دروازہ بند کر کے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

''اپنی خبر سناؤ پھر میں بھی تمہیں ایک خوش خبری سناؤں گی۔'' ''لڑکے کی یا لڑکی کی؟'' میں اس سے بے ساختہ سوال کر بیٹھا۔

اس نے میرے سینے پر دو ہنٹر چلائے اور غرائی۔ ''ڈینی! تم سے خدا سمجھے......''

''ڈینی نہیں، اسلم۔'' میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اس کی بات کاٹتے ہوئے تصحیح کی۔ ''یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ہم نیند میں بھی ایک دوسرے کے اصل نام نہیں لیں گے۔''

''میری کلائیاں چھوڑ دو۔ ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔'' ویرا نے احتجاج کیا۔

''یہ دست درازی کی سزا ہے آئندہ مذاق میں بھی ہاتھ نہ اٹھانا۔'' میں نے پوری قوت سے اس کی کلائیاں اپنی سخت مٹھیوں میں بھینچ کر چھوڑ دیں۔

وہ بلبلا کر اپنے قدموں پر لہرائی پھر کلائیوں پر پھونکیں مارنے لگی۔ اس کی گوری جلد پر میری بھری بھری انگلیوں کے سرخ حلقے ابھر آئے تھے۔

''بدری ناتھ کسی کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔'' میں نے اس کے سوال کا انتظار کیے بغیر بتایا۔ ''اور مجھے اس گھر کا فون نمبر مل گیا ہے۔ میں یہیں سے اس سے بات کروں گا۔''

''یہ کیسے ممکن ہوا؟'' اس اچھی خبر پر وہ اپنی کلائیوں کی تکلیف بھول گئی۔

میں نے اسے اپنی کامیابی کی مختصر سی کہانی جزئیات سمیت سنا دی۔

''یہ بات اب ہر شک و شبہے سے بالا ہے کہ وہ لوگ ٹریڈ سیکشن کی آڑ میں خفیہ سرگرمیاں چلا رہے ہیں اور کیتھی والے فون نمبر پر ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود رہتا ہے۔'' وہ بولی۔

''یہ بتاؤ کہ تم کون سی خوش خبری سنانے والی تھیں؟'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میری اطلاع کا ذریعہ ٹیلی ویژن ہے۔ ایک پرائیوٹ چینل نے یہ خبر نشر کی ہے کہ شام کے سوا سات بجے لندن پولیس کے اسپیشل اسکواڈ نے ماسٹر رابرٹ ہوٹل سے دو ایسے مشتبہ ایشیائیوں کو پکڑا ہے جو ائیرپورٹ سے نکلنے والے دو مسافروں کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں گھسے تھے۔ دونوں مسلح تھے اور بظاہر بھارتی معلوم ہوتے ہیں۔''

''اوہ۔ یہ تو بہت اہم خبر ہے۔ اگر یہ پرائیویٹ چینل کی خبر ہے تو انہوں نے خبر کا ذریعہ کیا بتایا ہے؟''

''انہوں نے کسی فری لانس رپورٹر سے یہ خبر خریدی ہے۔ وہ رپورٹر ائیرپورٹ پر آج ہی نظر آنے والے اسپیشل اسکواڈ کی سرگرمیوں کے بارے میں مواد جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔''

''اور مسافر کون تھے؟'' میں نے متجسس لہجے میں

سوال کیا۔ ''رپورٹر اکیلا تھا۔ وہ ماسٹر رابرٹ ہوٹل پر ہونے والی کارروائی کی کوریج کرتا رہا۔ پولیس والے ملزموں کی تحویل سے ہتھیار برآمد ہونے پر وہیں رکے رہے۔ وہ دونوں مسافر ملزموں کی گرفتاری سے پہلے اپنی ٹیکسی میں اے فور پر شہر روانہ ہو گئے۔ ملزموں کو دوبارہ گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔''

''اے فور......؟ یہ تو شاید وہی شاہراہ ہے جس پر ماسٹر رابرٹ واقع ہے۔''

''ہاں اس بارے میں پولیس کی طرف سے ابھی تک کوئی پریس ریلیز جاری نہیں کیا گیا' اس خبر کے لیک ہونے کا سہرا رپورٹر اور پرائیوٹ چینل کے سر ہے۔''

''یہ بہت اہم واقعہ ہے۔ مجھے اس کا تعلق بدری ناتھ کی آمد سے معلوم ہو رہا ہے۔ بس ایک بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ وہ رمیش اگروال کو اپنے ساتھ وہاں کیوں لے گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اب تمہیں بدری کا نمبر مل ہی گیا ہے تو اسے فون کر ڈالو بات صاف ہو جائے گی۔''

ویرا کا مشورہ صائب تھا۔ میں نے فوراً ہی فون سنبھال لیا۔ میں نے آپریٹر کی مدد کے بغیر براہ راست لائن لے کر کیتھی سے ملا ہوا نمبر ملانا شروع کر دیا۔

''یس! سری نواسن اسپیکنگ!'' دوسری طرف سے دیسی لب و لہجے اور بھاری آواز میں کہا گیا۔

''میرا نام گرنام ہے۔ میں بدری سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے انگریزی میں کہا۔

''ہولڈ آن۔ میں دیکھتا ہوں'' ریسیور کہیں رکھ دیا گیا۔

چند ثانیوں بعد ریسیور میں بدری کی آواز ابھری تو میں نے اپنے بارے میں بتایا ''میں گرنام یا پرنام نہیں، علی شیر بول رہا ہوں۔''

''بھگوان کا شکر ہے کہ تمہارا سراغ ملا ورنہ میں تو مایوس ہو گیا تھا۔'' میری آواز سن کر بدری ناتھ نے تشکر کا ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

''تم کو یقین ہے کہ ہماری گفتگو کے لیے یہ فون محفوظ ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کھل کر اور بے فکر ہو کر بات کرو۔ اس وقت میں اکیلا ہوں۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ سری نواسن کو اپنا فرضی نام بتایا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم یہاں فون کرو گے۔''

''رمیش اس وقت کہاں ہے؟'' میں بات شروع کرنے سے پہلے اپنا پورا اطمینان کرنا چاہ رہا تھا۔

''سری نواسن نے تمہارا پیغام دیا تو ہم دونوں بیڈ روم میں تھے۔ اب سری نواسن اس کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ شام ہوتے ہی وہ پینے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔''

''مگر یہاں شام بہت دیر سے ہوتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ اب کیا پروگرام ہے۔''

''پروگرام سے پہلے تم نے مجھے مایوس کر دیا تھا۔ میں نے تمہارے ہوٹل فون کیا تو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم وہاں کس نام سے ٹھہرے ہوئے یہ تمہاری کیا حرکت تھی؟''

''بس چوک ہو گئی لیکن تمہیں ماسٹر رابرٹ ہوٹل آنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ رمیش بھی تمہارے ساتھ تھا؟'' میں نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے اس سے جواب طلب کر لیا۔

''میرا خیال تھا کہ ہوٹل میں تم سے ٹکراؤ ہو ہی جائے گا۔ تم نے مجھے دیکھ لیا تھا تو رابطہ کیوں نہیں کیا؟ ہوٹل میں تو میں اکیلا آیا تھا۔ رمیش باہر ٹیکسی میں ہی تھا۔''...... وہ وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

''میرے دیکھنے کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت پورے لندن کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم وہاں گئے تھے اور تم دونوں کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔''

''اس قصے کے بارے میں مجھے بتایا جا چکا ہے۔'' میری توقع کے برعکس اس نے اداس لہجے میں کہا ''وہ دونوں ہماری حفاظت کے لیے ہمارے پیچھے آ رہے

تھے۔ ہمارے نکلنے کے بعد لندن پولیس نے انہیں ہوٹل کے باہر ہی دھر لیا۔ اب ان کی رہائی کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔"

"حیرت ہے کہ تم جیسے... تجربے کار آدمی نے اس کہانی پر یقین کر لیا۔ وہ پکڑے گئے تو تمہیں مطمئن کرنے کے لیے حفاظت کی مفروضہ کہانی سنا دی گئی ورنہ درحقیقت وہ تمہاری خفیہ نگرانی پر مامور کیے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نک موڈلے کی نظروں میں اپنا اعتبار کھو چکے ہو۔"

"وہاں کچھ تلخیاں ضرور پیدا ہوئی تھیں مگر وہ اتنی دور رس نہیں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اس بارے میں تمہیں کوئی سنگین غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں سب میرے ساتھی ہیں۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہاں میرے خلاف فضا ہموار کی جا رہی ہوگی۔"

"یہ نہ بھولو کہ رمیش اگروال بھی تمہارا ساتھی بلکہ دوست ہے اور آج تمہیں نیچا دکھانے پر تلا ہوا ہے۔ یہ میری کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ یہ سب باتیں ایک پرائیویٹ ٹیلی وژن سے نشر ہو چکی ہیں۔"

"ٹیلی وژن!" اس انکشاف نے شاید اسے بھونچکا کر دیا۔

"اس بارے میں کسی نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تو تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ ٹیلی ویژن والے وہاں کب پہنچ گئے؟"

"یہ مسابقت کی دنیا ہے۔ ذرا سی دیر پہلے ایک رپورٹر کے ذریعے یہ خبر آئی ہے۔ میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں کہ اس وقت تم تلوار کی دھار پر ہو۔ آگے پیچھے سے چوکنے نہ رہے تو بے موت مارے جاؤ گے۔"

"تم مجھے اپنا نام اور کمرا نمبر بتاؤ۔ میں جلد از جلد تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

نہیں بدری۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنے پیچھے لگا کر کسی اجرتی قاتل کو میرے دروازے تک لے آؤ۔ آج کے واقعے کے بعد میں نے ماسٹر رابرٹ کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اب میں اپنے لیے کوئی محفوظ ٹھکانا ڈھونڈوں گا۔ میری اور تمہاری ملاقات اسی وقت ہو سکے گی جب حفاظت اور نگرانی کا فرق سمجھ لو گے۔"

"یہ مت سمجھو کہ میں نے تمہارے مخلصانہ مشورے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میں کسی بھی حیلے بہانے سے نکل کر ضرور دیکھوں گا کہ کون مجھ پر نگاہ رکھ رہا ہے۔ ہماری ملاقات ضروری ہے۔ مجھے تم سے کچھ اور مشورے کرنے ہیں، وہ باتیں دو بدو ہی ہو سکتی ہیں۔"

"اگر اس فون کو محفوظ سمجھتے ہو تو وہ باتیں اسی وقت دہرا ڈالو تاکہ ملاقات سے پہلے مجھے ان پر سوچنے کا موقع مل سکے۔ جب تک میں کہیں ٹک نہیں جاتا، ہماری ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

قدرے توقف کے بعد ریسیور پر اس کی دھیمی آواز اُبھری۔ "کل گیتا اور جیمز پنڈت کے دُہرے قتل کی واردات ہوئی ہے۔ اس نے پورے ہائی کمیشن کے عملے کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ کہیں اس میں تمہارا کوئی دخل تو نہیں تھا؟"

"ابھی میں اتنے بڑے بڑے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔" میں نے کوئی بھی ذمہ داری لینے سے صاف انکار کر دیا "تھوڑے دنوں بعد ان پر بھی ہاتھ رواں ہو جائے گا۔"

"خبریں مل رہی ہیں کہ کراچی میں ڈینی اچانک زیر زمین چلا گیا ہے۔" وہ اسی رازدارانہ لہجے میں بول رہا تھا۔ "ان لوگوں میں ہراس پھیلا ہوا ہے کہ کہیں وہ خونی درندہ لندن نہ پہنچ گیا ہو۔"

"میں ڈینی کے بارے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"اگر وہ لندن میں ہے تو اسے تلاش کرو۔ ہمارے کام کا آدمی ہے۔ کل گیتا ماری گئی ہے۔ آج پانچ افسروں نے چھٹی پر انڈیا جانے کی درخواستیں جمع کرا دی ہیں۔"

"وہ کہیں مل گیا تو ضرور اس سے بات کروں گا۔ لندن میں کب تک ٹھہرو گے؟"

"اگلے احکام تک!" اس کی آواز سے مایوسی مترشح تھی۔ "تم نے مجھے اُلجھا دیا ہے۔ تمہاری باتوں میں وزن ہے۔ اگر مجھے امریکا بھیجنے سے پہلے نگرانی کے لیے یہاں روکا گیا ہے تو میری زندگی سخت خطرے میں ہے۔ میرا ہی کوئی ساتھی میرا گلا کاٹ دے گا تو دنیا یہی سمجھے گی کہ یہ بھی جیمز پنڈت اور گیتا کے جنونی قاتل کی حرکت ہے۔ مجھے لندن آئے دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے مگر میری کھوپڑی ابھی سے ہل گئی ہے۔"

"اب تمہارا دماغ صحیح سمت میں کام کر رہا ہے۔ کراچی میں رمیش تمہارے رحم و کرم پر تھا۔ تمہارے سوا کسی اور سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یہاں اسے ہر ایک سے اپنے دل کا غبار نکالنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ ممکن ہے کہ کراچی کی خفیہ کہانیاں سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہوئی تنک موڈلے کے کانوں تک پہنچ جائیں۔ ایسی صورت میں تمہارا کیا بنے گا؟"

"میں آج ہی سری نواسن اور دوسرے دوستوں سے بات کروں گا۔" بدری ناتھ کی آواز میں اضطرابی کیفیت نمایاں ہونے لگی۔ "اگر مجھے غیر معینہ مدت کے لیے لندن میں روک لیا گیا ہے تو میں تمہیں گرین سگنل دے دوں گا۔ تم اپنی سہولت کے مطابق رمیش کا کام تمام کر دینا۔"

"تم شہر کے کس علاقے میں ٹھہرے ہوئے ہو؟" اسے جان کے خوف میں مبتلا کر دینے کے بعد میں نے پوچھا۔

"یہ ساؤتھ آل کا وہی علاقہ ہے جہاں کل دہرا قتل ہوا تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس کا راج ہے۔ لوگ بتا رہے ہیں کہ آج دن بھر بازار سنسان پڑے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنے گھر میں دبکا ریڈیو یا ٹی وی سے لگا بیٹھا ہے۔"

"اور تم ٹیلی وژن کی تازہ ترین خبروں تک سے بے خبر ہو؟" میں نے تعجب ظاہر کیا۔

"ہم سری نواسن کے مہمان ہیں۔ ہمیں ساری سہولتیں حاصل ہیں مگر کمرے میں فون اور ٹی وی نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی ہم نے لندن آ کر سانس تک نہیں لی ہے۔"

"تو اب تم اسی کے ساتھ رہو گے؟" میں نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"جب تک لندن میں ہوں، اسی کے ساتھ رہوں گا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس کے گھر ٹھہرا ہوں؟" اہم ترین نکتہ اسے بہت تاخیر سے سوجھا تھا۔

"تم ماسٹر رابرٹ ہوٹل سے چلے گئے اور وہاں گرفتاریوں کا ڈراما شروع ہو گیا تو میں نے ہوٹل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے وہاں سے نکلنے کے بعد تمہارا مجھ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ میں نے کیتھی والے فون پر رابطہ کیا تو اس نے مجھے سری نواسن کا نمبر دے دیا۔"

"اوہ..... تم بہت چالاک ہو۔" دھیمی ہنسی کے ساتھ آواز آئی۔ "اس نمبر پر بارہ بارہ گھنٹے کے لیے ہمیشہ مادھو اور بیلا کی ڈیوٹی رہتی ہے۔ مادھو ذرا خود غرض انسان ہے مگر بیلا میرے اعتماد کی لڑکی ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ تم نے اس سے میرا فون نمبر لیا تھا۔ تم نے اسے کیا نام بتایا تھا؟"

"اس نے کچھ پوچھے بغیر نمبر دے دیا تھا۔ نام کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔"

"ایک اہم ترین راز یہ ہے کہ کل گیتا کو بھی کسی نے فون کر کے ہی بلایا تھا۔ اس نے بیلا کو فون کر کے پہلے کیتھی کہا، نیا آدمی اس کوڈ سے عموماً دھوکا کھا جاتا ہے۔ بعد میں اس نے کیتھی کہا تو بیلا ہوشیار ہو چکی تھی۔ وہ خود کو انڈین ایجنٹ بتا رہا تھا۔ شبہے کی وجہ سے کسی کال گرل کے بجائے گیتا کو اس سے ملنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ بہت تجربہ کار عورت تھی۔ جیمز پنڈت اس کی مدد کے لیے بھیجا گیا تھا مگر افسوس کہ وہ دونوں مارے گئے۔ یہی کام تمہارے ہاتھ سے ہوا ہوتا تو مجھے ذرا بھی قلق نہ ہوتا۔"

"اگر تمہارا کوڈ کسی اجنبی کے علم میں آ گیا ہے تو یہ بات خطرناک ہے۔"

"ایک آدھ روز میں اسے بدل دیا جائے گا۔ اپنا فون نمبر ہی بتا دو تا کہ میں تمہیں نئے کوڈ سے بروقت آگاہ کر سکوں۔ مجھے تمہارے کسی نہ کسی رابطے کا علم تو ہونا چاہیے۔"

"ابھی کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے تو فون نمبر کیا دوں؟ یہ کال میں پبلک بوتھ سے کر رہا ہوں۔"

"پتا نہیں لندن میں کون سا آسیب اُتر آیا ہے کہ ہر شخص اپنی موت سے خوف زدہ ہے۔" خود کلامی کے انداز میں اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ "ہائی کمیشن والے ہراساں ہیں، تمہیں اپنی سلامتی خطرے میں محسوس ہو رہی ہے اور تمہاری باتیں سننے کے بعد مجھے تو تلوار اپنی شہ رگ کے قریب نظر آنے لگی ہے۔ آج صبح میں کراچی جیسے خطرناک شہر میں بھی اتنا خوف زدہ نہیں تھا۔"

"تم دونوں کس کس نام سے لندن میں داخل ہوئے ہو؟" میں نے اچانک پوچھ لیا۔

"ہمیں اصل ناموں سے انڈین پاسپورٹ ملے تھے جن پر پاکستانی ویزے کے ساتھ چار دن پہلے کراچی ایئر پورٹ کی امیگریشن کی مہریں بھی لگی ہوئی تھیں۔"

"اب میں کل کسی وقت تمہیں فون کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس وقت تک حفاظت اور نگرانی کا فرق تمہاری سمجھ میں آ چکا ہوگا۔"

"میں انتظار کروں گا۔" اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

"میں نے تمہاری ساری مکاریاں سن لی ہیں مگر وہ کیا کہہ رہا تھا؟ ڈیمی کا ذکر کیسے آ گیا؟" ریسیور کریڈل پر جاتے ہی ویرا کسی محتسب کی طرح میرے سر پر سوار ہو گئی۔

"گیتا اور جیمز پنڈت کے قتل سے انہیں شبہ ہو رہا ہے کہ ڈیمی کسی بدروح کی طرح [illegible] س آیا ہے۔"

"تم اتنے خون آشام بھی نہیں ہو کہ لوگ یوں تمہارا نام لیتے پھریں۔" وہ منہ بنا کے بولی۔

"یہ میرے نہیں بلکہ بدری اور اس کے دوستوں کے الفاظ تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ملا سرکار کے قصے میں تمہارے ہاتھوں مار کھانے کے بعد ان پر تمہارا ہوا بیٹھ گیا ہے اور اب مدن موہن کے اغوا کو بھی تمہارے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہوگا۔"

"بدری ناتھ کو اب بھی یقین ہے کہ مدن موہن مجھ سے ملنے کے بعد کہیں فرار ہو چکا ہے۔" میں نے ایک جاندار قہقہہ لگا کر کہا "یہ لوگ کتنے احمق ہیں کہ اپنے بدترین دشمن کی پناہ میں رہ کر دن رات اسی کے خوف میں مبتلا تھے اور اب بھی مجھ پر اعتماد کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

"لوگوں کی بات نہ کرو۔ یہ کیفیت صرف بدری ناتھ کی ہے۔ وہ تمہارے ٹرانس میں آیا ہوا ہے۔ تم نے اس کی کمزوری اور تنک موڈلے کے خلاف نفرت کا بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ اسے برے انجام سے بچائے رکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔ وہ مارا گیا تو تمہاری گاڑی بھی ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔"

"برا وقت کسی کو للکار کر نہیں آتا اور جب آ ہی جاتا ہے تو اسے کوئی طرم خان بھی نہیں ٹال سکتا۔ بدری ناتھ خود ہوش کے ناخن نہیں لے گا تو لندن ہی میں مار دیا جائے گا۔"

"یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ مجھے اس کی پوری کہانی سناؤ۔"

"سب وہی پرانی باتیں ہیں۔ نئی بات صرف یہ ہے کہ اس کی نگرانی کرنے والے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو بدری سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ اس کے محافظ تھے۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت بھی یوں پیش آئی ہوگی کہ تازہ واردات کے پس منظر میں یہ خبر کل کے اخبارات میں نمایاں جگہ پائے گی۔"

"ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ شروع سے پوری بات بتاؤ۔ ایئر پورٹ سے وہ سیدھا ماسٹر رابرٹ ہوٹل کیسے پہنچ گیا اور اب اس کے کیا ارادے ہیں۔"

"میں واپس آ کر ساری رات یہ قصہ سناتا رہوں گا۔ اس وقت مجھے جانے دو۔ میں سلیم اکبر سے مل کر جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔" اس وقت تک

میرے ذہن میں سلیم کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے ابتدا میں ویرا سے دور رہنے کے لیے ایک بہانے کے طور پر اس کا نام لیا تھا۔ اس حیلے کو نبھانے کے لیے میرا ہوٹل سے جانا ضروری تھا۔

پہلی بار میں ہوٹل سے نکل کر چند ہی منٹ میں لوٹ آیا تھا اس لیے ویرا نے ضد کرنے کے بجائے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ ہوٹل سے نکلتے ہی ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم اس کی طرف اٹھے لیکن پھر میں نے وہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

جب تک ساؤتھ آل کے دُہرے قتل کا معاملہ نہیں دب جاتا تھا' میرا لندن کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے دور رہنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ سے بسوں کے ذریعے چیرنگ کراس تک پہنچنا زیادہ دُشوار نہیں تھا۔ تیسری بس سے ٹرافالگر اسکوائر پر اُتر کر میں ٹہلتا ہوا ہوٹل تک پہنچ گیا۔ ایک بار ہوٹل کا راستہ ذہن نشین کر لینے کے بعد میرے لیے اسے بھولنا ممکن نہیں تھا۔

میں شیشے اور وزنی لکڑی کا دروازہ عبور کر کے اندر داخل ہوا تو مسز رینالڈ نے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ مجھے حیرت تھی کہ رات دو بجے تک کام کرنے والی لڑکی کے آجانے کے باوجود مسز رینالڈ اپنی میز کے پیچھے موجود تھی۔

''میں ابھی تک تمہارے ہی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں نے اپنی غلطی کے ازالے کے لیے تمہیں ہوٹل سے نکال دیا۔ اپنے آرام دہ کمرے کو چھوڑ کر تم سارا دن نہ جانے کہاں بھٹکتے پھرے ہو گے۔''

''تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس شفیق بڑھیا کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا'' آج میں نے دل بھر کر لندن کی سیر کی ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''اب میں چلتی ہوں۔ ہمارا پرانا گاہک اور تمہارا دوست صبح وطن جا رہا ہے۔ تم تازہ دم ہونے کے بعد رجسٹر میں اپنے صحیح کوائف درج کرا دینا تاکہ آیندہ تمہیں ایسی زحمت نہ ہو۔''

''میں یہاں ٹھہرا تو ضرور اندراجات کی تصحیح کرا دوں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تو کیا تم کسی اور ہوٹل میں منتقل ہو رہے ہو۔ تم ضرور مجھ سے ناراض ہو گئے ہو۔''

صاف ظاہر تھا کہ میرے الفاظ سے بڑھیا کو صدمہ ہوا ہے۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے اسے ایک کہانی سنا دی جو خاصی مربوط تھی۔ بڑھیا مطمئن ہو کر ایک عقبی دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

حقیقت یہ تھی کہ سلیم کو پاکستان لوٹنے پر آمادہ کرنے کے بعد رائل ہوٹل میں میرا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ ایلیزا میں مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر ہمیں دوسرے ہوٹل میں ایک بہتر کمرا مل چکا تھا۔ اس علاقے میں دوسروں کی نظروں میں آنے کا امکان بہت کم تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اگلے روز ویرا کو بھی ماسٹر رابرٹ کا حساب بے باق کر کے سوٹ کیس وہیں لانے کا مشورہ دوں گا۔

میرے کمرے کی صفائی محنت سے کی گئی تھی۔ میرے استعمال کی چیزوں کو سمیٹ کر قرینے سے سوٹ کیس پر رکھ دیا گیا تھا۔ مسز رینالڈ نے اپنی دانست میں صبح والی زیادتی کا ازالہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ میرے لیے اس کی وہ زیادتی ایک بڑی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے پولیس والوں کا سامنا کرنے سے بچا لیا تھا۔

مجھے کمرے میں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بستر پر پڑے پڑے اُردو میں آجاؤ کا نعرہ لگایا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ سلیم ناب گھما کر اندر آ گیا۔

''ارے...... تم تو ولی اللہ بھی ہو گئے۔'' اس نے تحیر زدہ اور خوشامدانہ لہجے میں کہا ''بستر پر لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ دروازے پر چھوٹا بھائی دستک دے رہا ہے۔''

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

''اس ہوٹل میں میرے اور تمہارے سوا اردو کون سمجھتا ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ آج گرین پارک میں تمہاری دال نہیں گلی۔''

''دال تو کئی مرتبہ گلتے گلتے رہ گئی۔ زرِمبادلہ کا خرچ زیادہ تھا اس لیے دل پر پتھر رکھ لیا۔ ویسے بھی استعمال کیے ہوئے ٹشو پیپر کی طرح سب کو یہیں رہ جانا ہے......''

''زیادہ بڑے بول نہ بولو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تنبیہ کی۔ ''جہاز میں ملنے والی روزی نے تم کو ٹشو پیپر بھی نہیں سمجھا تھا۔''

''وہ نیم پاگل تھی۔ تم جیسے ہیرے کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نکل گئی پھر وہ مجھے کیوں گھاس ڈالتی۔ یہ سب مزاج اور مقدر کی باتیں ہوتی ہیں۔ اب ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ یہیں محفل جمانے کا ارادہ ہے یا کسی پب میں چل کر ڈیرا ڈال لیں۔''

''یہ ہوٹل ہی سب سے مناسب ہے۔ پب سے تمہیں لاد کر کون یہاں تک لائے گا۔''

''آج اتنی لے لی تو صبح جہاز ہی نکل جائے گا۔'' اس نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ کہا ''ذرا تم میرا دھیان کرنا۔ سرور میں آ کر میں بس پیتا ہی چلا جاتا ہوں۔''

''اپنے جگر اور گردوں کے ساتھ ظلم کرتے ہو۔ اچھی بات نہیں ہے۔''

''آج تو پی کر کسی اور کے ساتھ ظلم کرنے کا ارادہ ہے پھر صبح یہاں سے کوچ کر ہی جانا ہے۔'' اس نے اپنی چگی داڑھی سہلاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا ''یہ بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے؟''

''کس بارے میں؟'' اس کے غیر متوقع سوال پر میں چونک پڑا۔

''ایلیزا کے بارے میں۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر گھٹیا لہجے میں کہا۔

''تم بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔ تمہارے بعد وہ لاوارث نہیں رہے گی۔ اسے کوئی نہ کوئی وارث مل ہی جائے گا۔ میں آج رات ہی یہاں سے جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔''

"ارے!" وہ میرے بے لاگ فیصلے پر بھونچکا رہ گیا۔ "آج رات کا کرایہ تو واپس نہیں ملے گا۔ پھر تم صبح مجھے خدا حافظ بھی نہیں کہو گے۔"

"آٹھ بجے جہاز پکڑنے کے لیے تمہیں صبح پانچ ساڑھے پانچ بجے تک ہوٹل چھوڑنا ہوگا۔ لندن کے شرفا اس وقت ہوٹل تو کیا بستر بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔"

"تو پھر اپنا کراچی کا پتا ابھی لکھوا دو۔ بعد میں' میں بھول جاؤں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ کراچی پہنچ کر میں خود تم سے رابطہ کرلوں گا۔ سیل کھلنے کی خوشی میں تم پر میری ایک دعوت تو ادھار ہو ہی چکی ہے۔"

دعوت کے ذکر نے اسے مطمئن کر دیا اور اس نے میرا پتا لینے پر اصرار نہیں کیا۔

میں پچھلی رات اسے بھگت چکا تھا اس لیے اپنا کمرا مقفل کر کے اس کے ساتھ اوپر چل دیا۔

ایلیزا نے خوش دلانہ مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا اور بستر پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ سلیم نے میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی سنبھال لی۔ میز پر پینے کے لوازم شاید دن رات موجود رہتے تھے اور اس وقت بھی جوں کے توں پڑے ہوئے تھے۔

سلیم نے اٹھ کر واش بیسن میں گلاس دھوئے تولیے میں لپٹی ہوئی سوڈے کی تین ٹھنڈی بوتلیں نکالیں اور پھر بوتل سے بلیک لیبل اسکاچ گلاسوں میں انڈیلنے لگا۔

"کیا بات ہے' تم مجھ سے بہت کم مخاطب ہوتے ہو۔" سلیم کو مصروف پا کر ایلیزا نے مجھ سے کہا۔

"تم اتنی حسین اور نازک ہو کہ تم کو مخاطب کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے' کہیں چیخ نہ جاؤ۔" میں نے اس کا دل...... رکھنے کے لیے یوں ہی کہہ دیا۔

خوشی سے ایلیزا کا چہرہ گلنار ہوگیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ تعریف مرد کا وہ موثر ہتھیار ہے جس کے ذریعے ذہین ترین عورتوں کی عقل کو ناکارہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے حاصل ہونے والی کامیابیوں کا انحصار ..۔ خود مرد کی مرضی اور طلب پر ہوتا ہے۔

"ایک بات میں ہر بار تم سے پوچھنا بھول جا ہوں۔" سلیم نے اچانک اُردو میں کہا۔

"اب میں تمہارے کمرے میں ہوں۔ ایک نہیں پوچھ لو۔" میں نے دعوت دی۔

"کل تم نے اپنے رشتے دار کے گھر سے مجھے فو کیا تو تم نے میرے ساتھ ایلیزا کی موجودگی کا ذکر سن اسے میری بیوی کیوں سمجھ لیا تھا؟ بعد میں مجھے یاد آیا میں تمہیں اپنی مطلقہ بیوی کے بیوہ ہوجانے اور اس دوبارہ شادی کرنے کے بارے میں بتا چکا تھا۔"

"اپنے دل پر اس کا اتنا اثر نہ لو۔ وہ ایک چلتی ہو بات تھی اور مذاق میں کہی گئی تھی جو دُرست بھی ہوسکتی تھی" میں نے سگریٹ سلگا کر بے پروائی سے کہا۔

"مذاق کی بات دُرست کیسے ہوسکتی ہے؟" ا نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

"کثرت سے بیرون ملک جانے والے سیا بڑے بڑے شہروں میں خورونوش اور رہائش کے بھا اخراجات سے بچنے کے لیے کئی بیویاں پال لیتے ہیں۔ ا میں ہر بیوی خود کو اکلوتی سمجھتی ہے جب کہ ان کی اکلو بیوی وطن میں ان کے بچے پالنے میں مصروف ہو ہے۔"

"تمہاری اکثر باتیں بہت گہری اور ذو معنی ہو ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے ذہن پر زور دینا پڑتا ہے۔" ا نے ایک گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"کراچی پہنچنے کے بعد تم ذہن پر زور دینے کی ا ضرورت سے آزاد ہوجاؤ گے۔" اس کے انجام کا تصو کر کے میں روانی میں بے ساختہ کہہ گیا۔

"دیکھو تم پھر کوئی گہری بات کہہ گئے ہو جو میرے پر سے گزر گئی ہے۔"

"حالانکہ یہ سیدھی سی بات ہے۔ کراچی میں م ہوں گا' نہ میری باتیں۔ پھر تم اپنے ذہن پر کیوں زور گے۔" مجھے اپنی بات کی وضاحت فوراً ہی سوجھ گئی اور

مطمئن ہوگیا۔

اس وقت تک گفتگو اُردو میں ہوتی رہی تھی جو ایلیزا کے لیے ناقابل فہم تھی مگر پھر بھی وہ بے چاری اخلاقاً مسکرا مسکرا کر ہم دونوں کی طرف دیکھتی رہی۔

سلیم نے اسکاچ کا ایک لمبا گھونٹ معدے میں اُتارنے کے بعد کہا۔ "ڈارلنگ! ہم دونوں تمہارے مستقبل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اسلم کا مشورہ تھا کہ میں تمہیں لندن میں کرائے کا فلیٹ دلوا دوں اور تم یہیں آباد ہوجاؤ۔ میں اکثر ادھر آتا رہتا ہوں ہمیشہ تم سے ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"تمہاری تجویز بہت ہمدردانہ ہے۔" ایلیزا نے مجھ سے کہا پھر سلیم سے مخاطب ہوگئی "مگر میں مجبور ہوں۔ پندرہ دن کی سیاحت کے بعد میں وارسا میں اپنے گھر واپس نہ پہنچی تو میرا شوہر بال پکڑ کر مجھے گھر سے نکال دے گا اور میں برباد ہوجاؤں گی۔"

ایلیزا کے اس انکشاف پر سلیم کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ اس نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا پھر ایلیزا سے پوچھا "تو کیا تم واقعی شادی شدہ ہو؟ میں آج تک تمہیں کنواری سمجھتا رہا وہ کیسا بے حس شوہر ہے کہ اس نے تم جیسی خوب صورت عورت کو تنہا سیاحت پر نکلنے کی اجازت دے دی!"

"مجبوری ہے۔" ایلیزا نے بے چارگی سے کہا۔ "اب اگلے برس وہ اکیلا سیاحت پر نکلے گا۔ میں وارسا میں رہوں گی۔ پچھلے کئی برسوں سے ہم اسی طرح گزارہ کر رہے ہیں۔"

"لیکن تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے کہ دونوں ایک ساتھ سیاحت پر نہیں نکل سکتے؟" میں نے حیرت سے پوچھا "اخراجات میں معمولی سا اضافہ برداشت کر کے تمہارا شوہر بھی تمہارے ساتھ آسکتا تھا۔ ایک کے مقابلے میں دو آدمیوں کی سیاحت ہمیشہ سستی پڑتی ہے۔"

''بات اخراجات کی نہیں' چار بچوں کی ہے۔'' اس نے سر جھکا کر شرمسار لہجے میں کہا۔ ''ہم میں سے کسی ایک کو ہر حال میں گھر پر رہنا پڑتا ہے۔ بڑے بیٹے کی عمر ابھی صرف چھ سال ہے۔''

سلیم گلاس سے اگلا گھونٹ لے رہا تھا۔ اسے اتنا زبردست اجھولگا کہ گلاس سے آدھی شراب چھلک کر پرانے قالین پر گر گئی۔ ایلیزا نے بوکھلا کر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

سلیم کی کھانسی میں ذرا کمی واقع ہوئی تو اس نے اپنی پھٹی پھٹی سرخ آنکھیں ایلیزا کے چہرے پر گاڑ کر اٹک اٹک کر کہا۔ ''یہ...... یہ بات تم...... آج...... آج بتا رہی ہو کہ...... تت...... تم شادی شدہ اور پچ...... چار بچوں کی ماں ہو۔ یہ بات تم نے آج تک مجھ سے چھپا رکھی تھی۔''

''یہ بات تم نے کبھی مجھ سے پوچھی، نہ مجھے بتانے کی ضرورت تھی۔'' ایلیزا نے برا مان کر کہا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کی ہر رمق غائب ہو چکی تھی۔

سلیم کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ اسے کیا جواب دے۔ اس نے اپنا گلاس اُٹھایا اور غٹا غٹ اسے خالی کرتا چلا گیا۔ آخر اس نے گلاس چوبی میز پر پٹخ کر کہا۔ ''پھر بھی یہ تمہارا اخلاقی فرض تھا۔''

''سلیم!'' نرم خو نظر آنے والی ایلیزا اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر غرائی ''میں ایک عزت دار گھریلو عورت ہوں' کوئی بازاری لڑکی نہیں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ مجھے اپنے گلے میں ایک تختی ڈال لینی چاہیے جس پر لکھا ہو کہ میں ایک شوہر کی بیوی اور چار بچوں کی ماں ہوں؟''

یکا یک تبدیل ہونے والی وہ صورت حال میرے لیے دلچسپ ہی نہیں، مضحکہ خیز بھی تھی۔ نازنین سمجھ کر سلیم پچھلے چند روز میں جس کی ناز برداریاں کرتا رہا، وہ آخر کار چار بچوں کی ماں ثابت ہوئی تھی۔

''نو' نو۔'' سلیم نے فضا میں اُنگلی ہلاتے ہوئے کہا ''میرا یہ مطلب نہیں ہے...... مگر پھر بھی...... یعنی پھر بھی کوئی اشارہ تو ملنا چاہیے تھا۔''

''شٹ اپ! تم میری توہین کر رہے ہو۔'' ایلیزا بپھر کر اپنے اصل روپ میں سامنے آگئی۔ ''میں نے تم پر ترس کھا کر تمہیں اپنے کمرے میں سر چھپانے کی جگہ دی اور اب تم میرے نسوانی وقار کی دھجیاں اُڑا رہے ہو۔ ایسی باتیں میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تم اسی وقت میرے کمرے سے نکل جاؤ۔''

اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سلیم سہم گیا۔ لندن سے جاتے جاتے وہ آخری رُسوائی بھی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ اس نے خود ہی سرور میں آکر ایلیزا کو لندن میں کرائے کا فلیٹ دلوانے کا ذکر چھیڑا تھا جس کے نتیجے میں ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا تھا۔

''ایلیزا!'' میں نے اسے گھور کر کہا۔ ''تحمل سے کام لو ورنہ سلیم کے ساتھ تم بھی ہوٹل میں تماشا بن جاؤ گی۔''

''اب تم بھی مجھے دھمکیاں دو گے!'' بولتے بولتے ایلیزا کی آواز رندھ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اس کے رُخساروں پر لڑھکنے لگے۔

''یہ دھمکی نہیں التجا ہے۔'' میں نے بوکھلا کر اسے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ ''سلیم کو کم از کم اتنا موقع تو دو کہ وہ یہاں سے اپنا سامان سمیٹ سکے۔ صبح اسے وطن واپس لوٹنا ہے۔''

''نہیں۔'' وہ روتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''میں ایسے مرد کا وجود ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی جو اپنی گرل فرینڈ کی تذلیل کرتا ہو۔ اسے نیچے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ میں اس کا سارا سامان سمیٹ کر خود تمہارے دروازے کے باہر رکھ دوں گی۔''

بات کرتے کرتے اس نے اپنے گلاس میں بچی ہوئی اسکاچ حقارت سے داش بیسن میں بہادی۔

میں دروازے سے باہر آگیا۔ سلیم نے خاموشی سے میری تقلید کی۔

''تم واقعی کوئی درویش ہو۔'' سیڑھیاں اُترتے ہوئے سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری تحریص اور ترغیب کے باوجود تم نے شروع سے اس کتیا میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شاید تمہارے وجدان نے تمہیں بتایا تھا کہ اس معصوم چہرے کے پیچھے کیسی چڑیل چھپی ہوئی ہے۔''

''صبح تم کو یہ ملک چھوڑ دینا ہے۔ رات کو کہیں کرائے پر مکان نہیں ملتے۔ پھر تم کو وہ ذکر چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس واقعے کی ساری ذمے داری تمہاری ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری بات کھٹ سے میری عقل میں آگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ راضی ہوگئی تو میرے جانے کے بعد تم اسے کسی سستے فلیٹ میں ڈال دو گے۔ باقی باتیں میں اگلے چکر میں نمٹالوں گا۔''

میرے کمرے میں پہنچ کر وہ شکست خوردہ انداز میں بستر پر گر کر کراہا۔ ''عزت کے ساتھ ساتھ بوتل بھی ہاتھ سے گئی۔ دیکھو اب وہ سامان کب لاتی ہے۔ جب تک پورا سامان نہیں آجاتا' تم میرے پاس رکے رہو گے...... بلکہ صبح ہم دونوں ہی یہاں سے ایک ساتھ نکلیں گے۔''

''سامان دلوا کر میں چلا جاؤں گا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''میں اپنے ایک رشتے دار سے واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ رات بھر یہاں رکا رہا تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔''

''چلو ابھی تو سامان کا انتظار کرنا ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''تمہاری ذرا سی لغزش سے اس وقت طبیعت مکدر ہوگئی۔''

''میں نے کسی سے سنا تھا کہ پولینڈ والے بہت ذلیل اور لیچڑ ہوتے ہیں۔ اب اسی سالی کتیا کو دیکھ لو کہ اپنے چار پلوں کو وارسا میں چھوڑ کر یہاں لونڈیا بنی پھر رہی ہے۔'' سلیم نے اس قدر جلے کٹے لہجے میں فقرے ادا کیے کہ مجھے اپنا بے ساختہ قہقہہ مصنوعی کھانسی کی آڑ میں چھپانا پڑ گیا۔

''اس نے تم سے رقم بھی اینٹھی ہوگی؟'' کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

''نہیں کمرا ا[illegible] نام پر تھا مگر پورا کرایہ میں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ [illegible] جیب خرچ کے لیے روزانہ دس پندرہ پاؤنڈ اپنی مرضی سے دے رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ایلیزا نے کبھی کچھ نہیں مانگا۔''

انکار کے بعد کیا جانے والا اعتراف میرے لیے زیادہ اہم تھا۔ ٹیوڈر ہوٹل والی شیری رینڈل کی روزانہ یافت دس پاؤنڈ اور قیام کی سہولت سے زیادہ نہیں تھی جب کہ ایلیزا اس سے کہیں زیادہ کما رہی تھی اور پھر بھی سلیم پر احسان تھا کہ اس نے اسے پناہ دی۔

اس وقت جو کچھ ہوا' اس میں کسی کے ارادے کا دخل نہیں تھا۔ واقعات اس نہج پر نہ چلے گئے ہوتے تو اگلی صبح ایلیزا یقیناً سلیم کو خوشی اور خوش دلی سے رُخصت کر دیتی۔ سلیم کسی احساس زیاں کے بغیر وطن لوٹ جاتا۔ ایلیزا اپنی آمدنی پر خوش رہتی اور اگلی شب پھر پناہ گزین کے لیے اپنے کمرے کے دروازے کھول کر اسے خوشیاں بانٹنے میں مصروف ہو جاتی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو چوکھٹ پر بلیک لیبل بوتل سمیت سلیم کا سوٹ کیس اور سامان رکھا ہوا تھا۔ ایلیزا مڑ کر سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی دروازے پر دستک دینے کے بعد اس نے کسی کے نمودار ہونے کا انتظار کیے بغیر اپنی راہ لی تھی۔

''آؤ اور سامان اُٹھالو۔'' میں نے سلیم کو متوجہ کیا۔ ''تمہاری بوتل بھی واپس آگئی ہے۔''

سلیم نے اکتاہٹ اور بے دلی سے سارا سامان اندر کھینچ لیا اور پوچھا ''کیا وہ تم سے کوئی بات کیے بغیر واپس چلی گئی؟''

''میں نے دروازہ کھولا تو وہ جا رہی تھی۔ کہو تو اسے یہاں بھی بلا لاؤں۔'' میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''رہنے دو۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا۔ ''وہ یہاں سے بھی نکلوا دے گی۔''

سلیم نے سرسری انداز میں اپنے مختصر اسباب کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ایلیزا اس کی ہر چیز چن چن کر اُٹھا لائی تھی تا کہ وہ کسی بہانے سے دوبارہ اس کو تنگ نہ کر سکے۔

''سامان آ گیا۔ اب میں تیاری پکڑتا ہوں۔'' میں نے اعلان کیا۔

''تم تو اپنا بھرا ہوا گلاس اوپر چھوڑ آئے تھے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بوتل آجانے کے بعد میں تمہیں یوں ہی جانے دوں۔ ابھی تھوڑی دیر ٹھہرو۔''

وہ بہت ملول اور کبیدہ خاطر ہو چکا تھا۔ اسے ذرا سا سہارا دینے کی نیت سے میں رک گیا۔ اس نے اپنا سامان سوٹ کیس میں ..... ٹھونسا' میں نے اپنا سوٹ کیس تیار کیا اور سلیم اکبر خان ایک مرتبہ پھر پیالے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ ایلیزا نے اس کی لائی ہوئی سوڈے کی ٹھنڈی بوتلیں تک واپس کر دی تھیں جو اس کے کام آ رہی تھیں۔

سلیم ایک گلاس پہلے ہی پورا کر چکا تھا اس لیے قدرے سرور میں تھا۔ نیا دور شروع ہوا تو موضوع پھر ایلیزا کی ذات تھی۔ سلیم کو قلق تھا کہ جہاندیدہ اور تجربے کار ہونے کے باوجود اس مکار اور صورت حرام عورت کو کوئی پولش دوشیزہ سمجھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔

تیسرے گلاس کے بعد میں نے بوتل کا منہ سختی سے بند کر کے اسے ایک کونے میں ڈال دیا۔ ''اب تم اکیلے رہ گئے ہو۔ مزید پی تو صبح پانچ بجے دنیا کی کوئی قوت تمہیں بیدار نہیں کر سکے گی۔''

''تم بہت اچھے اور بڑے بھائی کی طرح مہربان ہو۔'' اس نے بگڑی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب تم سے کراچی ہی میں ملاقات ہوگی۔''

''میں وہاں تمہاری عداوت ..... نہیں' دعوت کروں گا۔''

وہ اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں نے اسے جلدی سے کندھے لڑا کر الگ کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس موقع پر اس نے فرطِ جذبات سے رونا شروع کر دیا تو میرا مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا برباد ہو جائے گا۔

اسے آرام سے بستر پر بٹھا کر میں نے اپنا ہلکا پھلکا سوٹ کیس سنبھالا اور تیزی سے سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔ قدموں کی چاپ سن کر ڈیوٹی پر موجود لڑکی نے میری طرف دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی جس کا سبب میرا سوٹ کیس ہی ہوسکتا تھا۔

''اپنے اندراجات دُرست کرانے کے بجائے تم تو ہوٹل ہی چھوڑے جا رہے ہو۔'' میرے قریب پہنچنے پر اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''اب اتنی رات کو کہاں جاؤ گے۔''

''ایک رشتے دار کے گھر جانا پڑ رہا ہے۔ مجبوری ہے۔'' میں نے شانے اچکا کے کہا۔

''تمہیں علم ہوگا کہ کرائے کا لین دین مسز رینالڈ خود کرتی ہیں۔'' اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ ''اس وقت تم کو کوئی رقم واپس نہیں کی جاسکتی۔''

''پروا نہیں۔ ویسے بھی آج رات میرا کمرہ آباد رہے گا۔ اس میں وہی شخص سوئے گا جس کا نام تمہارے رجسٹر میں لکھا ہوا ہے اور یہ اچھی بات ہے۔''

اس نے اٹھ کر الوداعیہ انداز میں اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''گڈ لک اینڈ گڈ نائٹ!''

میں نے اس سے ہاتھ ملا کر رائل ہوٹل کو خیر باد کہہ دیا۔ باہر اس وقت پھوار پڑ رہی تھی۔ مجھے سامنے ہی ایک ٹیکسی نظر آئی۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں سفید فام ڈرائیور کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ چھریرے بدن والا ایک باریش نوجوان تھا۔

اس بوندا باندی میں سوٹ کیس اُٹھا کر زیادہ بھاگ دوڑ کرنی میرے لیے محال تھی۔ میں بادل ناخواستہ ٹیکسی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر ڈرائیور پھرتی سے اپنی نشست سے نیچے آ گیا۔ اس نے ایک خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر عقبی پائیدان پر رکھ دیا اور میری منزل کے بارے میں کچھ پوچھے بغیر گھوم کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

میرے سوار ہونے تک انجن جاگ اُٹھا۔ میں نے اپنی منزل کا پتا بتایا۔ ڈرائیور نے میٹر چلایا اور ٹیکسی تیزی سے حرکت میں آ گئی۔

میری دانست میں سفر زیادہ لمبا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ طویل ثابت ہوا۔ ٹیکسی کے سفر کی سمت ایک ہی رہی تھی۔ چھوٹی اور ذیلی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے کہیں بھی مجھے چکر دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آخر کار اس نے ہوٹل کے پورچ میں گاڑی روک دی۔

اس وقت تک بارش زور پکڑ چکی تھی مگر پورچ میں ہم محفوظ تھے۔ میں کرایہ ادا کر کے اُترا تو ہوٹل کے پورٹر نے میرا سوٹ کیس اپنی ہلکی ٹرالی میں رکھ لیا۔

میں کاؤنٹر کے سامنے سے گزرا تو کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نووارد نے استفسار طلب مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنا کمرا نمبر دہرایا اور وہ سر جھکا کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کے ڈھیر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے کہ اس بار بھی تم جلدی واپس آ گئے۔'' کمرے میں پہنچنے پر ویرا نے کہا۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی تو وہ صرف گیارہ بجا رہی تھی۔

''آج سمجھ میں آیا ہے کہ کوچے سے بے آبرو ہو کر نکلنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔'' میں نے جوتے اور موزے اتارتے ہوئے ویرا سے کہا۔ ''آج سلیم خان کی خاصی مٹی پلید ہوئی ہے۔''

''اور کل اس سے زیادہ ہوگی۔'' ویرا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''کراچی میں اول خان اس سے ذرا بھی رعایت نہیں کرے گا۔''

''ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے۔''

''اب تم اپنی کہانی شروع کر دو۔ میرے صبر کی انتہا ہو چکی ہے۔''

''کوچے سے بے آبرو ہو کر نکلنے والی؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''بدری ناتھ کی کہانی میں مجھے زیادہ دلچسپی ہے۔'' ویرا نے مجھے گھور کر کہا۔

''وہ واقعی مشکلات میں گھر گیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی بے ربط کہانی تسلسل سے بیان کرنی شروع کر دی۔ ویرا پوری توجہ سے میرا ہر لفظ سن رہی تھی۔

''تمہیں جلد از جلد اس سے مل لینا چاہیے۔'' میرے خاموش ہونے پر ویرا نے کہا۔ ''آمنے سامنے بات ہوتی ہے تو نتائج بہت حیران کن ثابت ہوتے ہیں۔''

''جب تک اس کی نگرانی ہو رہی ہے' یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اس کے ساتھ ہم بھی بے موت مارے جائیں گے۔ اس وقت اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔''

''اس سے دور رہ کر معاملات تیزی سے نہیں نمٹائے جاسکیں گے۔''

''سب سے پہلے رمیش اگروال کا پتا صاف کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ وہ یہاں دل کھول کر بدری ناتھ کے خلاف زہر پھیلانے کی کوشش کرے گا۔ اب بدری بھی اس بارے میں نیم رضامند ہے۔''

''یہ کام بھی اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ ابھی تک ہم بالکل غیر مسلح ہیں......''

''تمہارے سیکھے ہوئے مارشل آرٹس کس دن کام آئیں گے''۔ ہتھیاروں کا ذکر آتے ہی میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال داغ دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ بدری کے ساتھ اس کی نگرانی بھی ہو رہی ہوگی۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ درپیش ہوا تو نگراں ہی اس کا محافظ بن کر ہمارے مقابلے پر آ جائے گا ..... اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''ایک دفعہ بدری ناتھ کا گرین سگنل مل جائے تو اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لیا جائے گا۔ ایسے حالات میں کسی

سے مل بیٹھنے کے بجائے اسے ختم کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مار دو اور پوری قوت سے بھاگ جاؤ کے فارمولے پر عمل کر کے کامیابی ہو ہی جاتی ہے۔''

''سری نواسن اور بیلا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' ویرا نے پوچھا۔

''بدری ناتھ کی کہانی کے سارے کردار اس وقت شکوک و شبہات کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ بدری ناتھ ان سب کے بارے میں پرانے حوالوں سے سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ کل تک شاید وہ صحیح رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں آ جائے گا۔''

''ماسٹر رابرٹ ہوٹل کے باہر ہونے والی گرفتاریوں کے بارے میں پرائیویٹ چینل کی خبر کی بازگشت اب ہر اسٹیشن سنا رہا ہے۔ یہ خبریں بھی اسے صحیح فیصلوں تک پہنچنے میں مدد دیں گی۔''

''اس وقت توقعات اور اُمیدوں کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سارا دن گزار کر لندن پہنچا ہے پھر بھی یہ بڑی بات ہے کہ ہمارے سامنے آئے بغیر مقامی پولیس انڈین لابی کی طرف متوجہ ہو چکی ہے۔ دو مسلح افراد کی گرفتاری سے جیمز پنڈت اور گیتا کے قتل کی تفتیش کا رُخ بھی بدل جائے گا جس کا سارا فائدہ ہم دونوں کو پہنچے گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کل تم بدری ناتھ سے فون پر بات کرو گے؟''

''اس کے بغیر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب تم سلیم اکبر خان کی کہانی بھی سنا سکتے ہو۔ میں بیئر کا ایک کین لوں گی۔ چاہو تو ریفریجریٹر میں سے تمہارے لیے بھی ایک ڈبا نکال لاؤں۔''

''لے آؤ..... سونے تک کچھ نہ کچھ شغل ضرور ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر میں غسل خانے میں چلا گیا۔

میں شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے لوٹا تو ویرا میز پر وہی.... کئی ڈبے کھولے بیٹھی تھی اور کمرا اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

''اوہو۔ رات کا کھانا تو میں بالکل بھول ہی گیا تھا۔'' میز پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ سہ پہر کے بعد سے میں نے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گے اسی لیے میں باہر نکل کر برگر اور فرائڈ چکن وغیرہ لے آئی تھی۔ ان میں کسی بھی چیز میں سور کا گوشت نہیں ہے۔''

وہ ایک نازک معاملہ تھا۔ گوشت کے بارے میں ویرا نے بتا دیا تھا لیکن پنیر اور روغنیات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہی معاملہ چکن، بیف اور مٹن کے ساتھ تھا۔ کون جانے کہ ان جانوروں کو اسلامی طریقے سے ذبح کیا جاتا تھا یا ان کا جھٹکا ہوتا تھا۔

لندن میں مذہبی رجحان رکھنے والے کبھی بھی ان بازاری غذاؤں کے قریب نہیں پھٹکتے۔ ان کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر لندن کے بہت سے علاقوں بلکہ دوسرے شہروں میں بھی حلال گوشت کی متعدد دکانیں قائم ہو چکی تھیں جہاں سے خریدے ہوئے گوشت کو لوگ پورے اعتماد سے گھروں میں استعمال کرتے تھے پھر کسی نے افواہ اڑا دی کہ ساؤتھ آل میں ایک سکھ بھی گوشت کے نام پر مسلمانوں کو جھٹکے کا گوشت کھلا رہا ہے۔

لوگوں نے فوراً ہی اس دکان کا بائیکاٹ کر دیا۔ انتظامیہ سے اس دکان کا لائسنس منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ کمیٹی مقرر ہوئی تو پتا چلا کہ وہ دکان واقعی ایک سردار جی کی تھی مگر وہاں فروخت ہونے والا سارا گوشت مسلمان اسلامی طریقے پر ذبح کرتے تھے۔ یوں وہ قصہ ختم ہوا۔

کھانے کے دوران میں بیئر کے استعمال پر ویرا نے خلاف توقع کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اتنی منہ پھٹ تھی کہ... ایک مرتبہ براہ راست سوال کر بیٹھی تھی کہ شوق سے شراب نوشی کرنے والے مسلمان بھی سور کے گوشت سے کیوں... پرہیز کرتے ہیں جب کہ حرام دونوں ہی ہیں۔

وہ سارے خیالات میرے ذہن میں اُبھرتے اور معدوم ہوتے رہے مگر میں نے اس بارے میں ویرا سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اسے ایک سرا مل جاتا تو وہ بات کا بتنگڑ بنا سکتی تھی۔

اس کی فرمائش پر میں نے سلیم کی بے آبروئی کا ذکر چھیڑ دیا جسے سن کر وہ دیر تک ہنستی رہی۔

کھانا ختم کر کے بھی ہم دونوں کچھ دیر تک بیٹھے بیئر کے دوسرے کین سے شغل کرتے رہے۔ آخر کار میں بستر پر لیٹا تو ویرا کمرے کی روشنیاں گل کر کے باتھ روم میں جا گھسی۔

چند منٹ بعد وہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس ہو کر باتھ روم سے برآمد ہوئی تو کمرا بھینی سی خوشبو کی مہکار سے بھر گیا۔ اس نے کمرے کی فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے کسی اچھے پرفیوم کا سہارا لیا تھا۔ عقب سے آنے والی روشنی میں میں نے بس لمحہ بھر کے لیے اس کے پیکر کو دیکھا اور کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔ ویرا دروازہ بند کر کے مسہری پر آ گئی۔

بظاہر میں ویرا کی طرف پشت کیے ساکت لیٹا ہوا تھا لیکن اس کی طرف سے کسی شرارت کی ابتدا کی صورت میں بھرپور مزاحمت کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

☆☆☆

صبح ہم دونوں دیر سے سو کر اٹھے۔ میں ویرا سے پہلے بیدار ہو کر ہوٹل کی طرف سے فراہم کیے جانے والے ڈیلی ٹیلی گراف میں اپنے کام کی خبریں پڑھ چکا تھا۔

کسی ٹیکسی ڈرائیور نے دُہرے قتل کے سلسلے میں پولیس سے رجوع نہیں کیا تھا۔ گیتا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کسی جسمانی زیادتی کا ذکر نہیں تھا۔ اس کی موت دل میں لگنے والی اکلوتی گولی سے واقع ہوئی تھی جب کہ جیمز پنڈت کی رپورٹ بھی ایسی ہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے دل کے بجائے بھیجے میں گولی آر پار..... نکل گئی تھی۔

ماسٹر رابرٹ ہوٹل کے قریب سے پکڑے جانے والوں کی بھارتی قومیت کو اخبار نے خوب اُچھالا تھا اور یہ سوال اُٹھایا تھا کہ وہ دونوں آخر گیتا کے ہم دشمن ہی کیوں تھے۔

ان دونوں کے بیانات کو صیغہ راز میں رکھا گیا تھا لیکن ان پر فرد جرم بہت واضح تھی۔ انہوں نے مسلح ہو کر لندن پہنچنے والے دو ایشیائیوں کا پیچھا کر کے انہیں... ہراساں کیا تھا اور اسپیشل اسکواڈ کی بروقت مداخلت کی وجہ سے کسی بڑی مجرمانہ کارروائی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہے تھے۔

اخبار میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں تھا کہ ان کا تعلق انڈین ہائی کمیشن سے تھا نہ ہی ان کے بارے میں ہائی کمیشن نے کوئی بیان جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔

وہ اخبار والوں کی بے خبری تھی مگر مجھے بدری کی وجہ سے اندر کی کئی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ دُہرے قتل کی واردات کے بعد اپنا دامن صاف رکھنے کے لیے انڈین سیکرٹ مشن کے مقامی سربراہ نے اپنے آدمیوں کے بجائے لندن میں آباد بھارتیوں میں سے دو آدمیوں کو چن کر بدری اور رمیش کی نگرانی پر لگایا تھا تاکہ ان کے گرفت میں آنے کی صورت میں ہائی کمیشن پر حرف گیری نہ کی جا سکے۔

تیار ہونے کے بعد ویرا بھی اخبار لے بیٹھی۔ میں نے سائیڈ ٹیبل پر موجود سروس کارڈ اُٹھا کر دیکھا تو کرائے میں شامل ناشتے کی فراہمی کا وقت دس بجے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسی کارڈ سے نمبر دیکھ کر انٹرکام پر روم سروس کو کمرے میں ناشتا بھیجنے کی ہدایت دے دی۔

مقررہ اوقات کے بعد بارہ بجے تک مہمانوں کو قیمت لے کر ان کے کمروں میں ناشتا فراہم کیا جاتا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ لندن کے اخباری نامہ نگاروں پر کاہلی چھائی ہوئی ہے ورنہ پکڑے جانے والوں کے بیانات سامنے آنے سے بہت سی باتیں صاف ہو سکتی ہیں۔'' ویرا نے اخبار ایک طرف پھینک کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

۔۔۔۔۔" اخبار والے اہم وارداتوں میں پولیس والوں سے کچھ نہ کچھ اگلوا ہی لیتے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے کہ ان کی نظروں میں یہ واردات اہم نہ رہی ہو۔" میں نے کہا

"گیتا اور جیمز کے قتل کے اگلے روز ان دونوں کی گرفتاری کو کون غیر اہم کہہ سکتا ہے؟"

"ظاہری رواداری کے باوجود انگلینڈ میں بلا کا نسلی تعصب پایا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "انگریز صدیوں کی مسابقت کی وجہ سے فرانسیسیوں سے چڑتے ہیں۔ برطانوی جزیرے پر شمال اور جنوب کے تعصبات کی کہانیاں عام ہیں پھر یہ دونوں تو ایشائیوں کے معاملات ہیں۔ یہ کیسے اہم ہوسکتے ہیں۔"

"ناشتا کرلو پھر بات ہوگی۔ خالی معدے میں ایسے ہی فاسد خیال آتے ہیں۔" ویرا نے ہنس کر کہا۔ "آج شاید ہمارا سارا دن اسی کمرے میں گزر جائے گا۔"

"بدن کو یوں زنگ لگانا میرے بس سے باہر ہے۔ ناشتے کے بعد میں باہر نکل جاؤں گا۔"

"کہاں جاؤ گے؟" ویرا نے پُر اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

"لندن بہت بڑا شہر ہے۔ کہیں بھی نکل جاؤں گا۔ اصل میں نے اس شہر کو آج تک ایک سیاح کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ فرصت ہے تو یہی کام کر ڈالوں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے مومی مجسموں کا عجائب گھر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"بیکر اسٹریٹ تک تم اکیلی بھی جاسکتی ہو۔ ہم دونوں کا یہاں تک ساتھ ہی ٹھیک ہے۔ باہر ہمارا ایک ساتھ رہنا کسی بھی وقت رنگ دکھا سکتا ہے۔"

"پھر میں پہلے ماسٹر رابرٹ سے اپنا سامان لاؤں گی اس کے بعد کچھ سوچا جائے گا۔"

اسی وقت ویٹر ناشتا لے آیا۔ اس میں بس وہی اشیا شامل تھیں جو میں نے اپنے آرڈر میں نوٹ کرائی تھیں۔ ہم دونوں خاموشی سے اپنی اپنی پسند کی چیزوں سے انصاف کرنے میں مصروف ہوگئے۔

ناشتے کے بعد ویرا کسل مندانہ انداز میں بستر پر دراز ہوگئی۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور تیار ہوکر ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ کمرا چھوڑتے ہوئے میں ساؤتھ آل کے علاقے کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

ہوٹل سے آکسفورڈ سرکس اور بونڈ اسٹریٹ کے ٹیوب اسٹیشنوں کا فاصلہ تقریباً برابر ہی تھا۔ میں بونڈ اسٹریٹ کی طرف ہولیا۔ خراماں خراماں اس طرف جاتے ہوئے میرا ذہن مسلسل تازہ ترین فیصلے پر کام کرتا رہا۔ میرے لیے اس علاقے میں صرف اور صرف ایک ہی خطرہ پنہاں تھا کہ انڈین ہائی کمیشن کا سری نواسن بھی ساؤتھ آل میں رہتا تھا اور رمیش اگروال بھی اسی کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ رمیش سے لندن میں کہیں بھی میرا آمنا سامنا ہونا میرے کھیل کو بگاڑ سکتا تھا۔ ساؤتھ آل کے علاقے میں یہ امکان سب سے زیادہ تھا۔

ٹیوب اسٹیشن پر پہنچنے تک میں اپنا ارادہ بدل چکا تھا۔ رمیش اور بدری پچھلی رات ہی لندن پہنچے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ گھر میں دیر تک سونے کے بعد وہ قرب و جوار کے بازار کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلیں گے۔ ایسے میں میرا وہاں موجود ہونا خطرناک تھا۔

ٹریول کارڈ لے کر میں بونڈ اسٹریٹ سے بیکر اسٹریٹ ٹیوب اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس روٹ پر ٹرین میں مسافروں کا خاصا ہجوم تھا۔

بیکر اسٹریٹ کی زمین دوز سیڑھیوں سے نکلنے والے ریلے میں شامل ہوکر میں باہر آیا تو مادام تساؤ کے مومی عجائب گھر اور پلانے ٹوریم کا گنبد دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں ویرا سے پہلے ہی لندن کے اس حیرت کدے کی سیر کرلوں۔

میں سگریٹ کے کش لگاتا ہوا قریب پہنچا تو ٹکٹ گھر کے سامنے تماشائیوں کی ایک لمبی قطار نظر آئی جو بہت دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی۔ قطار کے آخری سرے پر لگ کر میں نے حساب لگایا کہ ٹکٹ کے حصول،

موں جب لھر کی سیر اور سیارگاہ میں فلکیاتی نظاروں کے لیے کم از کم چار گھنٹے کی مدت ضرور درکار تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا وہ دن اسی ایک مقام کی نذر ہوجاتا اور وہاں سے نمٹنے کے بعد جب میں بدری ناتھ کو فون کرتا تو ہر بات اگلے دن کے لیے ٹالنی پڑ جاتی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ میرے پیچھے بھی پچاسیوں بچوں، بڑوں، مردوں اور عورتوں کی قطار لگ چکی تھی۔

ایک مشہور تفریح گاہ کی قطار سے اچانک نکل بھاگنا مجھے اچھا نہ لگا۔ اس بدذوقی سے بچتے ہوئے میں نے کوئی اہم بات یاد آنے کی اداکاری کی اور قطار سے نکل کر اس طرف ہولیا جہاں عجائب گھر کے ساتھ ہی فوٹوگرافر کی دکان تھی۔ اس دکان کے فوٹوگرافر عجائب گھر کے مختلف حصوں میں منتخب اور باحیثیت نظر آنے والے غیر ملکی جوڑوں کی مفت تصاویر بنا کر انہیں ایک نمبر دے دیتے ہیں۔ سیر سے فارغ ہوکر ایسے جوڑے کاؤنٹر پر جائیں تو وہاں ان کی دھلی دھلائی تصاویر موجود ہوتی ہیں۔ تصویر پسند آئے تو پاؤنڈ دے کر خرید لیں، ناپسند ہو تو کچھ نہیں دینا۔ دکان دار تصویر ضائع کردے گا۔

اس وقت میں اندر گیا تھا، نہ میں نے تصویر بنوائی تھی۔ میں ادھر سے گزر کر آگے نکلتا چلا گیا۔

اس مومی عجائب گھر سے تھوڑے فاصلے پر مشہور ریجنٹس پارک واقع ہے جس میں لندن کا چڑیا گھر واقع ہے اسی پارک کے ایک سرے پر جامع مسجد بنی ہوئی ہے جہاں پنج وقتہ نمازوں کے ساتھ سارا دن تبلیغ و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

میں پارک میں سے گزرنے والی سڑکوں سے دور ایک سرسبز قطعے پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہوٹل کے بند کمرے کے مقابلے میں اس پارک کی خنک فضا مجھے بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔

کافی دیر تک وہاں ستانے کے بعد بے کاری اور خالی پن کا احساس مجھے ستانے لگا۔ قدرت نے آسمان سے بوندیں ٹپکا کر میرے اس احساس کی تائید کی اور میں دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ وہ بوندیں پھوار کے مقابلے میں کافی تیز تھیں۔ میں نے فوراً ہی اپنی مہنگی برساتی پہنی، ٹوپی سر پر منڈھ کر اسے کالر سے جوڑا اور پھر ایک طرف چل دیا۔

قریب ترین سڑک پر پہلی بس نظر آتے ہی میں اس میں سوار ہوا اور ڈرائیور کو ٹریول کارڈ دکھا کر اندر بیٹھ گیا۔ وہ بس کچھ نامانوس راستوں سے گزرنے کے بعد جوں ہی ماربل آرچ کے نزدیک ٹھہری میں نے بس میں طے کیا اور آکسفورڈ اسٹریٹ عبور کرکے ہوٹل کی طرف ہولیا۔

ہوٹل کے بورڈ پر کمرے کی چابی موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ویرا باہر جاچکی تھی۔ میں نے کلرک سے چابی طلب کی تو اس نے میرا نام پوچھا، دراز میں جھانک کر نام کی تصدیق کی اور چابی میرے حوالے کردی۔ اپنے آرام دہ کمرے میں پہنچ کر میں نے برساتی اور غیر ضروری کپڑوں سے نجات حاصل کی اور فریج میں سے بیئر کا ایک ڈبا نکال کر ٹیلی وژن آن کردیا۔

ہر چینل مصروف تھا مگر کہیں سے بھی میری دلچسپی کا کوئی پروگرام نہیں آرہا تھا۔ میں نے بی بی سی لگا کر آواز بند کردی اور پھر فون کی طرف متوجہ گیا۔

چند ثانیوں بعد میں نے سری نواسن کے گھر کا نمبر ملایا۔ ایک کے بعد دوسری گھنٹی بجی اور پھر ریسیور اُٹھالیا گیا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ وہ رمیش اگروال کی آواز تھی جسے میں ہزاروں کے شور میں بھی شناخت کرسکتا تھا۔

میرے دل میں آئی کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر فون بند کردوں مگر اس طرح وہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہوکر کچھ بھی سوچ سکتا تھا۔ میں نے لمحہ بھر میں فیصلہ کرلیا کہ اس سے آواز بدل کر بات کروں گا۔

اس نے ریسیور اُٹھا کر اپنا نام بتانے کے بجائے محض ہیلو کہا تھا۔ میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں گرنام بول رہا ہوں۔ ذرا بدری ناتھ کو فون پر بلادو۔"

"تم کون ہو؟" میرے کانوں میں اس کی سرد

آواز تیر گئی۔

''میں نے کہا نا کہ میں گرنام ہوں۔ کیا تم کچھ اونچا سنتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ بدری سے تمہارا کیا تعلق یا سمبندھ ہے۔'' اس نے اپنا مدعا واضح کیا۔

''کیا اس سے بات کرنے سے پہلے یہ سب بتانا ضروری ہے؟'' میں نے خفگی سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ موجود نہیں ہے تم پیغام دے دو۔''

''پھر سری نواسن کو بلا دو۔'' میں نے اس کے آخری فقرے کو نظر انداز کر دیا۔

''سری نواسن اور اس کی بیوی کام پر ہیں۔ بچے اسکول سے نہیں لوٹے۔ بدری باہر بازار تک گیا ہوا ہے۔ اس وقت گھر میں صرف میں ہی ہوں۔ تم......''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کے پوچھا۔

''رمیش اگروال!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں بدری کا دوست ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کل شام بھی تم نے اس سے بات کی تھی۔ تم پورے اعتماد سے اپنا پیغام دے سکتے ہو۔ وہ آئے گا تو میں اسے بتا دوں گا۔''

پچھلے دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس نے بہت مکاری کے ساتھ مجھے اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جواب دینے بجائے ایک اور سوال کر ڈالا۔

''وہ کتنی دیر میں آئے گا؟''

''دس پندرہ منٹ میں۔ اسے گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔ تم ڈرو نہیں۔ اپنی بات مجھ سے کہہ ڈالو۔ بدری کی ہر بات میرے علم میں رہتی ہے۔'' وہ مجھے شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرتا رہا۔

''وہ آئے تو اسے بتا دینا کہ میں نے اس کے لیے فون کیا تھا۔''

اتنا کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ غیر متوقع طور پر اس سے بات کرتے ہوئے مجھے اس موسم میں بھی ہلکا سا پسینہ آ گیا تھا۔ وہ میری آواز ذرا بھی پہچان لیتا تو کھیل بگڑ جاتا۔

اپنا اعصابی تناؤ دور کرنے کے لیے میں نے بیئر کا ایک گھونٹ لے کر سگریٹ سلگا لی۔ اگلی کال میں نے آدھے گھنٹے بعد کی۔ اس بار ریسیور بدری ناتھ نے ہی اُٹھایا تھا۔

''یہ میری دوسری کال ہے۔ تم کہاں گئے ہوئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''تعاقب کا اندازہ لگانے کے لیے صبح سے چوتھی بار باہر نکلا تھا۔ رمیش نے مجھے تمہارے فون کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اسے تجسس ہے کہ تم روز کیوں فون کر رہے ہو۔''

''کیا بات ہے۔ اس وقت تم بہت کھل کر گفتگو کر رہے ہو۔''

''ہاں۔ میرے آنے کے بعد رمیش باہر گیا ہے۔ اس وقت میں گھر میں اکیلا ہوں۔''

''اوہ......لیکن تم باری باری باہر کیوں جا رہے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم دونوں پر الگ الگ آدمی لگائے تھے۔ ایک ساتھ جا کر اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم دونوں میں سے کس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ تمہارا اندازہ بالکل دُرست نکلا ہے۔ ہم دونوں کا چھپ کر پیچھا کیا جا رہا تھا مگر وہ لوگ اناڑی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری نظروں سے نہیں بچ سکے۔''

''یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا؟'' مجھے تشویش ہونے لگی۔ ''پورا یقین ہوتے ہی میں نے دفتر میں سری نواسن سے شکایت کی تھی۔ اس نے پھر وہی محافظ والی بات دہرائی جو اسے کسی بڑے نے بتائی تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ حفاظت کرنے والے چوروں کی طرح چھپ کر پیچھا نہیں کیا کرتے ہیں۔ سائے کی طرح ہر وقت قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نے سیکورٹی چیف اور دوسروں سے بات کرنے کے بعد بتایا کہ ہماری خفگی کی وجہ سے محافظوں کو واپس بلایا جا رہا ہے۔ اب ہمیں خود ہی اپنی

حفاظت کرنی ہوگی۔ کوئی ہماری ذمے داری نہیں لے گا۔''

''پھر کیا نتیجہ نکلا؟ اس وقت کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یقین دہانی کے ایک گھنٹے بعد بھی ہمارا پیچھا ہوتا رہا لیکن تیسرے اور چوتھے چکر میں میں کسی کو نہیں دیکھ سکا۔ پھر بھی میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے ہمیں تسلی دے کر آدمی بدل دیے ہوں اور نئے آدمی اپنے کام سے خوب واقف ہوں۔''

''جب تک تعاقب کی تلوار سر پر لٹکی رہے گی، تم کچھ نہیں کر سکو گے۔''

''میں یہ سب سمجھ رہا ہوں۔ میں نے سری نواسن کو بتا دیا ہے کہ اب کوئی پیچھا کرتا ہوا نظر آیا تو میں اسے مار بیٹھوں گا۔ اس نے مجھے کھلی چھوٹ دے دی ہے۔ ہمارے اور دوسروں کے درمیان رابطے کی ساری ذمے داریاں وہی انجام دے رہا ہے۔ ایک آدھ روز میں ہی صحیح پوزیشن سامنے آ سکے گی۔''

''تم تو کہہ رہے تھے کہ سری نواسن تمہارا دوست ہے پھر اب رابطہ افسر کیسے ہو گیا۔''

''ہم سب ایک دوسرے کے پرانے ساتھی اور دوست ہیں مگر اب سب کچھ بدلا ہوا ہے۔ کوئی کھل کر بات کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ ہر شخص مجھے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کئی بار مجھے سری نواسن کی گول مول اور بے سرو پا باتوں پر غصہ بھی آ چکا ہے۔''

''اور رمیش کا کیا حال ہے؟'' میں نے رسانیت سے پوچھا۔

''بظاہر ٹھیک ہے مگر میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ چپکے چپکے دوسروں کو میری طرف سے بدظن کر رہا ہے۔ اب اسے ڈھیل دینا خطرناک ثابت ہوگا۔ تم اپنا کام کر ڈالو، میری طرف سے گرین سگنل ہے۔''

''تم نے اپنے اس فیصلے کے نتائج پر غور ضرور کر لیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ امریکا کے بجائے مجھے انڈیا بھیج دیا جائے گا۔ ذہنی اذیت کے عالم میں سسکتے رہنے اور بے موت مارے جانے سے بہتر ہے کہ میں لوٹ جاؤں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ نک موڈلے اپنے حربوں سے تمہارے اعصاب توڑنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔''

''نک موڈلے کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ سارا ڈر آستین کے سانپ کا ہے۔ پتا نہیں یہ کب ڈس لے۔ وہ میرا نک سے بڑا دشمن ثابت ہو رہا ہے۔''

''اور تم لندن میں کب تک رکے رہو گے؟'' میں نے ایک گہرا سانس لے کر پوچھا۔ اس وقت مجھے بدری ناتھ پر ترس آ رہا تھا۔ وہ پردیس میں پھنسا ہوا ایسا بے یار و مددگار شخص تھا جس سے اس کے پرانے دوستوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور قریب ترین ساتھی بھی دغا دینے پر تل گیا تھا۔

''کچھ پتا نہیں۔ کراچی یا نیویارک سے اشارہ ملنے تک میں یہیں پڑا رہوں گا۔''

''تم کل کے مقابلے میں اس وقت زیادہ دل برداشتہ معلوم ہو رہے ہو۔''

''کل میں بیلا اور سری نواسن کے سوا کسی سے نہیں ملا تھا۔ آج کئی پرانے ساتھیوں سے بات کر چکا ہوں اور ان سب نے مجھے مایوس کیا ہے۔ میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔''

''حوصلہ ہارنے کے بجائے ان حالات کا مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ رمیش کے ہٹنے کے بعد ان حالات میں کوئی نہ کوئی بڑی تبدیلی آئے گی۔ میں اس کام کو جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کروں گا۔''

''معلوم ہو رہا ہے کہ تمہارے ذہن میں کوئی تجویز جنم لے چکی ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''ایسا نہیں ہے مگر کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

مجھے ریسیور پر بزر کی آواز سنائی دی اور بدری بولا۔

''شاید رمیش لوٹ آیا۔''

”بس میں فون بند کررہا ہوں۔ اسے نہ بتانا کہ میں نے دوبارہ فون کیا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

اس وقت بدری ناتھ ذہنی طور پر اتنا منتشر اور پریشان تھا کہ اس نے مجھ سے پتے یا فون نمبر کے لیے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ انڈین سیکریٹ سروس کا ایک پرانا وفادار تھا۔ شاید اس انکشاف نے اس کو اندر تک سے مجروح کردیا تھا کہ عمر کے اس مرحلے پر اس کی وفاداریوں کو مشکوک سمجھ کر اس کی نگرانی کرائی جارہی تھی۔

اس کے ذہن میں یہ بات میں نے ہی بٹھائی تھی۔ اگر میں اس پر یہ حربہ استعمال نہ کرتا تو وہ نگرانی کو حفاظت سمجھ کر اطمینان سے لندن میں روٹیاں توڑتا رہتا اور ایک دن اپنے ساتھ مجھے لے ڈوبتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میدان صاف ہونے کے بعد جب اس سے مل بیٹھنے..... کا موقع ملے گا تو اس کا کھویا ہوا اعتماد تیزی سے بحال ہوتا چلا جائے گا۔

اس ادھیڑبن میں ایک نئے خطرے نے میرے ذہن میں سر ابھارا۔ پہلے بدری ناتھ نے سری نواسن کو اپنا دوست کہا تھا لیکن اب وہ اس کے گھر میں رہتے ہوئے بھی اس کے طرزِ عمل سے مطمئن نہیں تھا اور اسے روایتی رابطہ افسر قرار دے رہا تھا۔

اگر وہ سری نواسن کی ہمدردیوں سے بھی محروم ہوچکا تھا تو پھر وہ ڈوبنے والا ہی تھا۔ سری نواسن کو معلوم تھا کہ اس کے لیے کسی گرنام نے فون کیا تھا۔ یہ بات رمیش کے علم میں بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ بدری نے ان دونوں کو یہی بتایا ہوگا کہ گرنام اس کا کوئی پرانا دوست ہے مگر وہاں یہ بات شبہے میں ڈال دیتی کہ ایسا کون سا قریبی دوست ہے جو لندن میں رہتے ہوئے بھی بس فون میں باتیں کرتا ہے لیکن ذاتی طور پر اس سے ملنے نہ آئے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ مایوسی کے عالم میں بدری ہر ایک کو غلط سمجھ رہا ہے۔ رمیش اس کی راہ کا اکلوتا پتھر تھا جو ساری دُشواریاں پیدا کررہا تھا۔ وہ راستے سے ہٹا دیا جاتا تو ان لوگوں میں بدری کے سوا کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔ میں گرنام یا کوئی بھی فرضی نام اختیار کرکے آزادی سے بدری سے مل جل سکتا تھا۔ یہ باہمی میل جول ہی بدری کو مایوسی سے نکال کر اس کے مقام پر بحال کرسکتا تھا۔

بدری ناتھ کی رضامندی مل جانے کے بعد رمیش کا جلد از جلد مار دیا جانا ضروری ہوگیا تھا۔ لندن پہنچنے کے بعد بدری جن ذہنی صدمات سے دوچار ہوا تھا ان کے پیش نظر یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ وہ کسی وقت اپنے فیصلے پر نظرثانی کرکے اسے زندہ چھوڑنے کا ارادہ کرلے اور بعد میں عمر بھر اپنی اس سنگین غلطی پر کف افسوس ملتا رہے۔ وہ صورتِ حال میرے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوسکتی تھی ادھر سے میرے خیالات کی رو اچانک سلیم اکبر خان کی طرف بہک گئی۔ اسے کچھ ہی دیر بعد کراچی کے.... بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اُتر جانا تھا۔

سلیم اکبر کے ساتھ جب مجھے اول خان کا خیال آیا تو میں ہڑبڑا گیا۔

کراچی والوں کے پاس ماسٹر رابرٹ اور رائل ہوٹل کے فون نمبر تھے۔ کسی بھی ضرورت کے لیے وہ ہم دونوں کو ان ہی دو نمبروں پر تلاش کرتے رہتے جب کہ عملاً وہ دونوں ہوٹل چھوڑے جاچکے تھے۔ میں نے فوراً ہی کراچی فون کرنے کے ارادے سے ریسیور اُٹھایا مگر نمبر گھمانے سے پہلے ہی مجھے آپریٹر کا دھیان آگیا۔

انٹرکام پر میں نے اسے مطلع کیا کہ میں کمرے کی بکنگ کے ساتھ ہی دوسو پاؤنڈ جمع کراچکا ہوں اور اس وقت کراچی میں فون کرنے جارہا ہوں۔ کال طویل ہونے کی صورت میں بھی اسے مداخلت کی ضرورت نہیں۔ فون کا بل میں فوری طور پر ادا کردوں گا۔

بعد کی کسی شکایت کے مقابلے میں وہ پیشگی وضاحت میری نظروں میں زیادہ بہتر تھی۔

فون ملنے پر پہلے سلطان شاہ سے بات ہوئی مگر دُعا سلام کے بعد ہی اول خان لائن پر آگیا۔

”تم کہاں غائب ہو۔ کراچی میں کسی کو تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔“ دُعا سلام کے بعد میں نے اس سے شکوہ کیا ”غنیمت ہے کہ آج فون پر تمہاری آواز سننے کو ملی ہے۔“

”مدن موہن کا ریکٹ بہت بڑا اور خطرناک تھا۔ اگر اسے تھوڑی سی اور مہلت مل جاتی تو وہ پاکستان کو ایسا نقصان پہنچاتا کہ ہم راس المیڈا اور دوسروں کو بھول جاتے۔ میں دن رات اسی سازش کے مہروں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دو آدمیوں پر اسلام آباد کی اجازت کے بعد ہی ہاتھ ڈالا جاسکا ہے۔ واپس آؤ گے تو ان لوگوں کے کرتوتوں کی تفصیل جان کر تم حیران رہ جاؤ گے۔“

”شاید اب تم اس قصے سے نمٹ گئے ہو اسی لیے سلطان شاہ کے پاس موجود ہو۔“

”نہیں۔ کل سے یہ بے چارہ بالکل اکیلا ہے۔ میں اس کا دل بہلانے کے لیے یہاں آگیا تھا۔ غزالہ کل ہی میری بیوی سے مل کر واپس آرہی تھی لیکن اس بھلی عورت نے غزالہ کو زبردستی دو چار دن کے لیے اپنے پاس روک لیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ شوہر کے چلے جانے کے بعد بیوی پر کیا گزرتی ہے۔ وہ غزالہ کو اپنے پاس مصروف رکھ کر..... ..... بہلا رہی ہے۔ تم چاہو تو میرے گھر فون کرکے اس سے بات کرسکتے ہو۔“

”غزالہ کی خبرگیری پر میری طرف سے بھابی کا شکریہ ادا کردینا۔“ میں نے خلوص دل سے کہا۔ ”اسے ایسی ہی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔“

”یہ بتاؤ کہ تم نے اس وقت کیسے فون کیا ہے؟“ اول خان نے پوچھا۔

”اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے ہوٹل چھوڑ دیے ہیں اور اب ایک نئے ہوٹل میں آگئے ہیں۔ جلدی سے اس کا فون نمبر وغیرہ لکھ لو۔“ یہ کہہ کر میں نے نمبر دہرا دیا۔

”یعنی اب تم دونوں ایک ساتھ رہو گے؟“ اول خان کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جسے میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم خود سمجھ دار ہو۔ میں اس بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ غزالہ نے تم پر اعتماد کرکے تمہارے شانوں پر بھاری ذمے داری ڈال دی ہے۔“

”میں اپنی مجبوریوں اور ذمے داریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم اس سے بے فکر رہو۔ دوسری اطلاع یہ ہے کہ وہ دونوں کل آگئے۔ میں بدری سے رابطے میں ہوں۔ ایک آدھ روز میں وہ اکیلا ہی رہ جائے گا۔ دوسرے کے بارے میں فیصلہ کرلیا گیا ہے۔“

”اسلم! ذرا آہستہ آہستہ چلو۔“ اس کی تادیبی آواز سنائی دی۔ ”اتنی تیز رفتاری اچھی نہیں ہوتی۔ ابھی تو پچھلا قصہ بھی زور شور سے چل رہا ہوگا۔“

”چل رہا ہے مگر خطرات موہوم ہیں اسی لیے ہم دونوں مل بیٹھے ہیں۔“

”میری دُعا ہے کہ تم ہمیشہ خطرات سے محفوظ رہو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

”تیسری خبر۔ سلیم آج آٹھ بجے یہاں سے نکل گیا۔ اب وہ تمہارا معاملہ ہے۔“

”میرے آدمی ہر لمحے اسے نگاہوں میں رکھیں گے۔ اُسے اس وقت رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا جب وہ اپنی تجوری میں سے ممنوعہ کاغذات اور ان کی نقلیں نکال رہا ہوگا۔“

”اُمید کی کرن پیدا ہوتے ہی اس کے حوصلے پھر بلند ہوچکے ہیں۔ خیال رکھنا کہ کہیں وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نہ نکل جائے۔ میں نے اس پر خاصی محنت کی ہے۔“

اول خان کی بے ساختہ ہنسی کی آواز آئی پھر اس نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تحویلِ مجرمین کے بین الاقوامی معاہدوں یا پھر کسی جوابی مجرمانہ کارروائی کے بغیر کسی کو واپس لانا کتنا دُشوار ہوتا ہے۔ جب تک وہ اس ملک میں ہے مجھ سے نہیں بچ سکے گا۔ یہ بتاؤ کہ اب تم لندن میں کب تک جمے رہو گے؟“

”وہ کل ہی یہاں پہنچا ہے اور آتے ہی بری طرح

اُلجھ گیا ہے۔ فی الحال آگے روانگی کا کوئی پروگرام نظر نہیں آرہا۔ ایک دوروز میں گرد بیٹھے گی تو کچھ پتا چلے گا۔"

"کراچی کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے؟" اول خان کا لہجہ متجسس ہوگیا۔

"اس سے ابھی تک صرف فون پر بات ہوئی ہے اور اس نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔ صرف اتنا کہا ہے کہ بگاڑ پیدا ہوا تھا مگر وہ دوررس نہیں تھا۔ تفصیل اسی وقت معلوم ہوسکے گی جب اس سے آمنے سامنے بات ہوگی۔"

"کوئی گڑبڑ ہونے سے پہلے تمہیں اس سے مل بیٹھنے کی کوشش کرلینی چاہیے۔"

"اس کے قدم رکھتے ہی گڑبڑ آغاز ہوچکا ہے۔ ائرپورٹ سے ہی ان کی نگرانی شروع ہوئی تھی جسے حفاظت کا نام دیا گیا تھا۔ میرے ہوش دلانے پر اس نے احتجاج کیا تو آج دوپہر وہ سلسلہ ختم ہوا ہے۔ پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہے۔ دوچار مرتبہ باہر نکلنے کے بعد اسے صحیح اندازہ ہوگا کہ اس کا پیچھا چھوڑ دیا گیا ہے یا زیادہ ہوشیاری سے نگرانی کا سلسلہ جاری ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہاں بھی تم دلدل میں پھنسے ہوئے ہو۔" اول خان کی پرتشویش آواز آئی۔ "جب تک نگرانی ختم ہونے کا یقین نہیں ہوجاتا' اس کے قریب جانا بھی خطرناک ہوگا۔"

"فی الحال گومگو کی کیفیت میں انتظار جاری ہے' اندیشوں میں وقت گزر رہا ہے۔"

"میں کام کے کسی آدمی کا سراغ لگانے کی کوشش کررہا ہوں تاکہ لندن میں تمہیں کوئی مدد مل سکے...... پتا نہیں روزی کے پرانے واقف کاروں کا رویہ اب کیا ہوگا۔"

"تم بہت اہم نکتے پر کام کررہے ہو۔ ہم خالی ہاتھ آئے تھے اور ابھی تک خالی ہاتھ ہی ہیں۔" میں نے ذومعنی الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے نہتا ہونے کے بارے میں بتایا۔ "اعتماد کا کوئی آدمی مل جائے تو یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ روزی کو اپنے پرانے آدمیوں سے کوئی... توقع نہیں ہے۔"

"ایسے کاموں میں ہر شخص چڑھتے سورج کی پو[جا] کرتا ہے۔" اول خان نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "آج کل وہ معتوب ہے کوئی اسے گھاس نہیں ڈالے گا۔"

"اس کا خیال ہے کہ امریکا میں کچھ لوگ آج بھی صدق دل سے اس کا ساتھ دیں گے۔ یہاں والے ہر اس شخص کو تعظیم دینے کے عادی ہیں جس کے سر پر قیادت کا تاج ہو۔"

"اس لڑکی کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ لیکن وہ بہت تجربے کار ہے۔ اس کی بات کے پیچھے اس کا تجربہ بول[تا] ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اسے تمہارے ساتھ بھیجنے کو ترجیح دی تھی ورنہ اس سفر میں تمہارے ساتھ ہونے کا اصل حق غزالہ کا ہی تھا۔"

"یہ بات غزالہ بھی جانتی ہے۔ اسی وجہ سے اس نے تمہارے فیصلے پر احتجاج نہیں کیا ورنہ وہ تنہائی میں مجھ سے شکایت وشکوہ ضرور کرتی۔"

"تم ساحل کو چھوڑ کر اب منجدھار میں نکلے ہو۔ میں تمہارے حق میں بس دُعا ہی کرسکتا ہوں۔ اب ذرا سلطان شاہ سے بھی بات کرلو۔ یہ بہت بے چین ہورہا ہے۔"

ریسیور ہاتھ میں آتے ہی سلطان شاہ کی زبان چل پڑی۔ "اس گھر کے درودیوار سے اب مجھے وحشت ہورہی ہے۔ تم دونوں ادھر نکل گئے۔ غزالہ اپنے نئے میکے میں جاکر بیٹھ گئی۔ چوکیداری کے لیے میں یہاں رہ گیا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں بھی تم سے آملوں۔"

"یہاں تم اور زیادہ وحشت زدہ ہوجاؤ گے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"میں روزی سے زیادہ تجربے کار ہوں۔ تمہارا کام بہت ہلکا ہوجائے گا۔" وہ کراہا۔

"کام پہلے ہی بہت ہلکا ہے۔ تمہا[را] وہاں رہنا ضروری ہے۔"

"ابھی اول خان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ روزی بھی تمہارے ساتھ آگئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب وہاں کے حالات کچھ سازگار ہوگئے ہیں۔"

"حالات پہلے بھی سازگار ہی تھے مگر ہم احتیاط سے کام لے رہے تھے۔"

"لندن سے آنے والی اخباری اطلاعات خطرناک تھیں۔ شاید وہ سب......"

میں نے اس کی بات درمیان ہی سے کاٹ دی۔ "گڑے مردے مت اکھیڑو۔ اب آگے کی بات سوچنے دو۔ یہاں ہم خود بھی ماضی کو دفن کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"تم اندازہ نہیں لگاسکتے۔ تنہائی اور بیزاری نے ان تین چار دنوں میں میرا دماغ ماؤف کردیا ہے۔ غزالہ تھی تو اس سے میں ہمدردی کے بولوں کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد وہ بے چاری بہت اداس ہے۔"

"میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں۔ روزی وہاں سے آگئی ہے تو اب تمہیں اس کی قدروقیمت کا اندازہ ہورہا ہے۔ میں نے نیا فون نمبر اول خان کو لکھوادیا ہے۔ کسی وقت روزی سے بات کرلینا۔ تمہارے دل کی ساری بھڑاس نکل جائے گی۔"

"کیا یہ نیک کام اسی وقت نہیں ہوسکتا؟" سلطان شاہ کی آواز عاجزانہ ہوگئی۔

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "وہ موجود ہوتی تو میں خود ہی اس سے تمہاری بات کرادیتا۔"

"تو کیا وہ اکیلی کہیں گئی ہوئی ہے؟"

"ایسے بھولے نہ بنو۔ تم بھی یورپ کی ہوا کھاچکے ہو۔ یہاں ہزاروں لڑکیاں اکیلی ہی گھومتی پھرتی ہیں اور کوئی انہیں سینگ نہیں مارتا۔"

"تمہاری ہدایت ہے تو میں اس سے فون پر ضرور بات کرلوں گا مگر......"

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا فقرہ اچک لیا۔ "یہ ہدایت نہیں صرف مشورہ تھا۔ ہدایت سمجھ رہے ہو تو اس سے ہرگز بات نہ کرنا میں اسے بھی منع کردوں گا۔"

"میں تمہارے مشوروں کو... بھی ہدایت ہی سمجھتا ہوں لیکن تم نے میری پوری بات نہیں سنی۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ بیکاری مجھے کھائے جارہی ہے۔ میں کب تک یوں ہی بیٹھا رہوں گا۔"

"جہانگیر کوئی چلتا ہوا کاروبار خریدنے کے چکر میں تھا۔ اس سے بات کرلو۔ تمہاری مدد ملنے پر وہ خوش ہوجائے گا مگر اس کی بیوی سے ذرا دور ہی رہنا۔ وہ گود میں سر رکھ کر اچانک ہی سینگ مارنے والی گائے ہے۔ جہانگیر کے ساتھ تمہارا وقت اچھا گزرے گا۔"

"تمہارے ساتھ اتنا وقت گزار لینے کے بعد اب کسی کی نوکری کرنا میرے بس سے باہر ہے۔"

"یہ نوکری نہیں ہوگی۔ وہ تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح رکھے گا۔"

"دل بہلانے کے لیے تم اسے کوئی بھی نام دے لو مگر وہ نوکری ہی ہوگی۔ اسے چھوٹی نہ سہی' ذرا بڑی اور بہتر نوکری کہہ لو۔ یہ میری بیزاری کا کوئی حل نہیں ہے۔"

"پھر تم اول خان کے ساتھ تھوڑی بہت تربیت لے سکتے ہو۔ اسے ہر وقت قابل اعتماد آدمیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ اس طرح تمہارے اور اس کے درمیان مراسم بھی بہتر ہوجائیں گے۔"

"یہ بہترین تجویز ہے۔" وہ خوش ہوگیا۔ "میں ابھی بات کیے لیتا ہوں۔"

میں فون بند کرنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے فون پر کہا۔ "ذرا ہولڈ کرو...... شاید روزی آگئی ہے۔"

ریسیور سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو ویرا سوٹ کیس سمیت میرے سامنے موجود تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر کہا۔ "جلدی سے فون اُٹھاؤ۔ سلطان شاہ تم سے بات کرنے کے لیے مرا جارہا ہے۔"

ویرا نے دوڑ کر ریسیور اُٹھالیا اور چہکنے لگی۔ "کہو اُداس چوزے، تمہارا کیا حال ہے؟"

سوٹ کیس ایک کنارے سے رکھ کر میں نے ویرا کو

فون پر مصروف چھوڑا اور خود غسل خانے میں چلا گیا۔ اس عمل میں میری کسی ضرورت کا دخل نہیں تھا۔ بس ویرا کو آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو کا موقع دینے کے لیے میں نے کمرا چھوڑ دیا تھا۔

سگریٹ سلگا کر آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اپنے چہرے پر داڑھی اور مونچھوں کا اضافہ کر کے میں اپنے چہرے میں ایسی تبدیلیاں لاسکتا تھا کہ پہلی نظر میں مجھے کوئی بھی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔

مجھے بس وقت ہی گزارنا تھا۔ میں دیر تک آئینے کے سامنے اپنے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ سگریٹ ختم کر کے میں باہر نکلا تو ویرا فون پر گفتگو ختم کرچکی تھی۔

''تم نے اپنے دونوں کام بہت جلد نمٹا لیے۔'' میں نے ویرا سے متحیر ہوکر پوچھا۔

''کون سے دو کاموں کا ذکر رہے ہو؟ میں ماسٹر رابرٹ ہوٹل گئی تھی۔''

''پہلے تمہارا ارادہ موی عجائب گھر دیکھنے کا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عجائب گھر کھلنے سے پہلے وہاں قطار لگاتے ہیں۔ وہ آدھے دن کا کام ہے۔ اسے کسی اور دن پر ملتوی کر کے میں ہوٹل چلی گئی تھی۔ وہاں کل کے واقعے کے چرچے آج بھی سننے میں آرہے تھے۔ مجھے پورٹر نے بتایا کہ لندن پولیس کے اسپیشل اسکواڈ نے بہت تیز اور ڈرامائی کارروائی کر کے ان دونوں کو بے بس کیا تھا۔ وہ دونوں بھارتی صورتوں سے بدمعاش لگ رہے تھے۔''

''ہوسکتا ہے کہ پکڑے جانے والوں کو علم ہی نہ ہو کہ وہ انڈین ہائی کمیشن کے لیے کام کررہے ہیں۔ ایسے مواقع پر عام طور پر بیچ کا کوئی آدمی ضرور موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے دونوں فریق ایک دوسرے سے بے خبر رہتے ہیں اور کام پورا ہوجاتا ہے۔''

''یہاں آباد تارکین وطن میں بھارتی نژاد شہریوں کی بڑی تعداد کی وجہ سے ان لوگوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ انہیں اس بھیڑ میں ہر قسم کے آدمی مل جاتے ہیں۔''

میرے لیے یہ بات حیران کن ہے کہ یہاں کا انڈین ہائی کمیشن نک موڈلے کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیا تمہیں بدری اور رمیش کی آمد سے اس گٹھ جوڑ کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہاں بھی یہی صورت تھی۔ یہ دونوں تو تنیں مل کر اب کسی بڑے منصوبے کا تانا بانا تیار کررہی تھیں۔''

''اس وقت رمیش ہمارے منصوبے کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس کا کوئی فیصلہ ہوجائے تو کام کافی آسان ہوجائے گا۔''

''تو یہ خوش خبری بھی سن لو کہ اس کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے بدری نے گرین سگنل دے دیا ہے۔ اب ہمیں جلد از جلد اسے گھیر کر ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔''

''نگرانی کرنے والوں کی موجودگی میں یہ کام بہت دُشوار ثابت ہوگا۔'' ویرا پر تشویش انداز میں بڑبڑائی ''ہماری توجہ دو طرف بٹی رہے گی۔ اس سے کام بگڑ سکتا ہے۔''

وہ اپنی بات کہتی رہی مگر میرا ذہن کسی اور طرف اُلجھ چکا تھا۔ میرے ذہن میں رمیش اگروال کے الفاظ گونج رہے تھے۔ میری پہلی کال پر اس نے بتایا تھا کہ سری نواسن اور اس کی بیوی کام پر گئے ہوئے تھے، بچے اسکول میں تھے، بدری بازار گیا ہوا تھا اور وہ گھر میں اکیلا تھا۔ اگر اس گھر کا روز کا معمول تھا اور اگلے دن بدری کسی مقررہ وقت پر گھر سے غائب ہوجاتا تو سری نواسن کا گھر رمیش اگروال کے بہترین مقتل میں تبدیل ہوسکتا تھا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کن سوچوں میں گم ہو؟'' ویرا نے مجھے خاموش پا کر ٹوکا۔

''اس کے قتل کا منصوبہ ذہن میں آگیا ہے۔ بدری سے پتا لے کر مجھے آج رات ہی سری نواسن کے گھر کا جائزہ لینا ہوگا اور کل ساؤتھ آل والوں کو اپنے علاقے میں تیسرے بھارتی ایجنٹ کی لاش کا تحفہ ملے گا۔'' میں نے کہا۔

ویرا حیرت اور بے یقینی سے میری طرف دیکھے جارہی تھی۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے فون کا ریسیور اٹھالیا۔

میں نے فون پر پہلے تین ہندسے ہی ڈائل کیے تھے کہ ویرا نے اچانک جھپٹ کر کریڈل دبا دیا۔ درمیان میں لائن منقطع ہونے پر میں جھنجلا کر غصیلی نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

ویرا بے خوفی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند ثانیوں تک چڑنے والے انداز میں مسکراتی رہی پھر بولی۔ ''ریسیور رکھ دو اور مجھے بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔''

میں نے ایک گہرا سانس لے کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور کہا ''بعض اوقات تمہارا رویہ ضدی بچوں سے بھی گیا گزرا ہوجاتا ہے۔ فون پر ہونے والی گفتگو سن کر تمہیں معلوم ہوجاتا کہ میں کیا کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر تم اپنی فطرت سے مجبور ہو۔ بتاؤ تم کیا جاننا چاہتی ہو۔''

''تم فون پر کس کا نمبر ملانے جارہے تھے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سلیم اکبر خان کے چلے جانے کے بعد لندن میں میرے کتنے شناسا رہ گئے ہیں؟'' اس کے لہجے پر میں نے بدمزگی سے ایک جوابی سوال کر ڈالا۔

''تمہاری آشنائیوں کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ شانے اچکا کر بے پروائی سے بولی ''تمہارے ذوق کا معیار اب اتنا گر چکا ہے کہ تم نے لڑکیوں کو چھوڑ کر چار چار بچوں کی ماؤں کے پیچھے بھاگنا شروع کردیا ہے۔''

''چار بچوں کی وہ ماں میری نہیں، سلیم اکبر خان کی گرل فرینڈ تھی۔''

میرے چٹخنے پر وہ ہنس پڑی ''اس نے جاتے ہوئے ایلیزا کو تمہارے حوالے کردیا تھا۔''

''اس کے بھونکنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں، میں نے ہی تمہیں پوری تفصیل بتائی تھی اور اب تم ان ہی باتوں کے سہارے مجھ پر الزام تراشی کررہی ہو۔''

''یہ صورت حال تم نے خود ہی پیدا کی ہے۔ تم اپنی شناسائیوں کے بارے میں سوال کرتے نہ مجھے ایلیزا کا خیال آتا میں نے تم سے صرف یہ جاننا چاہا تھا کہ تم کسے فون کررہے ہو۔''

''کیا اتنی معمولی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی کہ رمیش اگروال کے بارے میں اس وقت صرف بدری ناتھ سے ہی بات کی جاسکتی ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس بار بھی تم نے گھما پھرا کر جواب دیا ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''مگر پھر بھی بات واضح ہوگئی ہے۔ بدری نے رمیش کے بارے میں تمہیں گرین سگنل دے دیا ہے اور اب تم اس سے بات کر کے کل ہی اس کا قصہ تمام کرنے کا ارادہ کرچکے ہو مگر یہ کام کیسے ہوگا؟''

میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کے لیے خاموشی سے سگریٹ سلگائی پھر دھیرے سے کہا ''رمیش اگروال نے خود ہی مجھے اس کام کا راستہ سمجھایا ہے۔ میں بہت اطمینان سے اسے سری نواسن کے گھر میں ہی ٹھکانے لگاؤں گا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکے گی۔''

''تو کیا سری نواسن اس گھر میں اکیلا رہتا ہے؟'' ویرا نے چونک کر پوچھا۔

''وہ عیال دار آدمی ہے۔ میں نے دن میں فون کیا تو گھر پر رمیش اکیلا تھا۔ اس نے بتایا کہ سری نواسن کے ساتھ اس کی بیوی بھی کام کرتی ہے، بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ اس وقت بدری بھی باہر گیا ہوا تھا۔ ایسے ہی کسی وقت پر وہاں چھاپا مارا جائے تو رمیش کو آسانی سے زیر کرلیا جائے گا۔''

''بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا کہ ساؤتھ آل کے علاقے میں ہونے والا یہ تیسرا قتل پورے شہر کو چونکا دے گا۔ لندن میں جرائم کثرت سے ہوتے ہیں لیکن ان میں قتل جیسی سنگین وارداتیں خال خال ہی ہوتی ہیں۔ گپتا اور جیھو کے بعد رمیش اگروال پراسرار طور پر مارا جانے والا تیسرا بھارتی ہوگا۔ چند روز میں ہونے والی یہ وارداتیں پولیس کو تمہاری راہ پر ڈال سکتی ہیں۔''

’’یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہاری یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ لوگوں کو کڑیاں یک جا کر کے سوچنے کے لیے بہت سا مواد مل جائے گا لیکن اس میں میرا ذکر نہیں آسکتا۔‘‘

’’تم سے مراد تمہارا نام نہیں ہے۔‘‘ ویرا نے وضاحت کی’’۔قانونی طور پر تمہاری یہاں آمد کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔تم نے اسلم خان کے نام سے سفر کیا ہے۔میں یہ بھی فرض کیے لیتی ہوں کہ رمیش اگروال کو تم بے داغ طریقے سے ٹھکانے لگاؤ گے اور جائے واردات پر کوئی سراغ نہیں چھوڑو گے مگر واقعات کی یکسانیت سے قاتل کے بارے میں بہت سے اندازے قائم کرلیے جائیں گے۔‘‘

’’وہ اندازے بے بنیاد ہوں گے۔ اصل خطرہ صرف اس ٹیکسی ڈرائیور سے ہوگا جس نے مجھے اور گیتا کو ساؤتھ آل تک پہنچایا تھا۔ہوسکتا ہے کہ رمیش کے قتل کے بعد پولیس زیادہ سرگرمی سے اس ڈرائیور کی تلاش شروع کردے۔اس خطرے کے سدباب کے لیے میں نے فوری طور پر داڑھی مونچھیں رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔‘‘

’’اپنے چہرے پر یہ فصل اگانے کے لیے تمہیں وقت درکار ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک وہ ڈرائیور پولیس کے ہاتھ نہ آسکے۔میں حیران ہوں کہ اتنی تشہیر کے باوجود وہ دونوں ڈرائیور اب تک سامنے کیوں نہیں آئے۔ اسے صرف اور صرف ہماری خوش قسمتی کہا جاسکتا ہے۔‘‘

’’تمہیں لانے والے ڈرائیور کی خاموشی قابلِ فہم ہے۔اس نے تمہارے ایما پر گیتا کی ٹیکسی کا تعاقب کر کے ایک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ سامنے آئے گا تو خود بھی پھنس جائے گا مگر ہمارے ٹیکسی ڈرائیور کی روپوشی حیران کن ہے۔ وہ کسی بھی وقت سامنے آکر دشواریاں پیدا کرسکتا ہے۔‘‘

’’میں نے اسی لیے تمہیں فون کرنے سے روکا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر، عجلت میں کوئی قدم اٹھا کر تم خطرات میں پڑ سکتے ہو اور تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی۔‘‘

میرے پاس فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔میں خاموشی سے سگریٹ کے گہرے کش لے کر حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

ویرا نے میرے بشرے سے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگالیا اور نوک جھونک سے گریز کر کے خود بھی سگریٹ نوشی میں مصروف ہوگئی۔ ریموٹ کنٹرول کی مدد سے اس نے ٹیلی وژن کھول لیا تھا۔

کافی دیر کی ادھیڑ بن کے بعد آخر کار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری نگاہوں کے سامنے سے پردہ سرکا دیا ہو میں نے ویرا سے کہا’’اپنی الجھن میں پڑ کر ہم کل کے واقعے کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہیں۔‘‘

’’کون سا واقعہ؟‘‘ میرے انکشاف پر ویرا نے چونک کر پوچھا۔

’’ماسٹر رابرٹ ہوٹل پر دو مسلح اور مشتبہ بھارتیوں کی گرفتاری۔‘‘ میں نے اسے یاد دلایا۔’’ وہ دونوں ہمارے لیے قربانی کے بہترین بکرے ثابت ہوسکتے ہیں۔‘‘

’’وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔تم ان سے کوئی فائدہ کیسے اٹھا سکو گے؟‘‘

’’یہ نیک کام اس شہر کی پولیس خود انجام دے گی۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’وضاحت کے بغیر تمہاری یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آسکے گی۔‘‘ وہ بولی۔

’’لندن پولیس کے اسپیشل اسکواڈ نے دونوں مسلح آدمیوں کو گرفتار کرلیا مگر وہ ایشیائی مسافر نکل گئے جن کا تعاقب کیا جارہا تھا۔ پولیس کو یقینی طور پر ان کی بھی تلاش ہوگی۔ان کے بیانات سے مسلح افراد کے اصل عزائم کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔‘‘

’’یہاں تک تمہاری ہر بات سمجھ میں آرہی ہے۔‘‘ ویرا نے میرے خاموش ہوتے ہی لقمہ دیا۔

’’دوسری طرف بدری ناتھ اور رمیش اگروال کو سری نواسن کے گھر پہنچا دیا گیا۔سری نواسن انڈین ہائی کمیشن میں ملازم ہے۔اگر اس کے گھر میں رمیش اگروال قتل کردیا جاتا ہے تو سوچو کہ کیسی دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے۔‘‘

’’میں بڑی حد تک تمہارا منصوبہ سمجھ رہی ہوں۔کل دن میں سری نواسن اور اس کے بال بچے گھر پر نہیں ہوں گے۔بدری کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے کھسک جائے گا اور تم وہاں پہنچ کر رمیش کو گھیر لو گے۔ گیتا سے حاصل کیا ہوا ریوالور تمہارے پاس موجود ہے۔شاید تم اسے آسانی سے مار کر نکل آؤ گے مگر اس طرح بدری کی گردن پھنس جائے گی۔ وہ اس شہر میں اجنبی ہے۔ جائے واردات سے اس کی غیر حاضری کی ہر شہادت کمزور سمجھی جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ رمیش کا قتل اسی کے سر منڈھ دیا جائے۔‘‘

’’میں فون پر بدری سے یہی کہنے والا تھا کہ وہ کل کا دن اپنے ہائی کمیشن میں گزارے۔ بھارتی ہائی کمیشن کے سفارت کاروں کی شہادت کو لندن پولیس مسترد نہیں کرسکے گی۔‘‘

’’وہ ہائی کمیشن جائے گا تو رمیش گھر پر کیوں پڑا رہے گا؟ وہ اس کے ساتھ جائے گا۔‘‘

’’یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔‘‘ میں نے اس کے بھٹکنے پر چڑ کر کہا’’بدری دودھ پیتا بچہ نہیں، ایک گھاگ سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ رمیش کو گھر پر روک کر ہائی کمیشن پہنچنا اس کا دردسر ہوگا۔تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ وہ خود بھی رمیش سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔‘‘

’’ابھی تک قربانی کے بکروں کی بات واضح نہیں ہوئی۔سب کچھ وہی ہے جو میں سمجھ رہی تھی۔ اتنا سا فرق ہے کہ تم نے کچھ احتیاطی تدابیر پر بھی غور کرلیا ہے۔‘‘

’’میرا خیال تھا کہ تم بات سمجھ لو گی مگر تمہاری کھوپڑی پر اس وقت شاید برف جمی ہوئی ہے۔ رمیش کی لاش دریافت ہوتے ہی یہ بات کھلنے میں دیر نہیں لگے گی کہ دو مسلح بھارتیوں نے ہیتھرو سے ماسٹر رابرٹ ہوٹل تک جن مسافروں کا تعاقب کیا تھا، ان میں رمیش بھی شامل تھا۔‘‘

اشارہ ملتے ہی ویرا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں’’اوہ خدا! تم واقعی شیطان کے چیلے ہو۔ رمیش اور بدری کی آمد کے ریکارڈ اور پھر دونوں قیدیوں کی شناخت کے بعد اس بات کو واقعی نہیں چھپایا جاسکے گا اور پولیس یہ سمجھے گی کہ وہ دونوں رمیش اور بدری کو قتل کرنے کی نیت سے ان کا پیچھا کررہے تھے۔ اپنے اناڑی پن کی وجہ سے وہ گرفتار ہوگئے تو..... ان کے کسی ساتھی نے رمیش کو قتل کر کے ان کا ادھورا کام پورا کردیا۔ پولیس کی ساری توجہ ان دونوں قیدیوں پر مرکوز ہوجائے گی۔‘‘

’’انڈین ہائی کمیشن میں گھسے ہوئے را کے ایجنٹوں پر بھی برا وقت آجائے گا۔‘‘ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ’’دنیا کی کوئی طاقت پولیس والوں کو اس ٹریک سے نہیں ہٹا سکے گی۔ گیتا اور جیمز کے قتل کو بھی رمیش کی ہلاکت سے ملا لیا جائے گا۔سری نواسن ہائی کمیشن کا ملازم ہے۔اس کے گھر میں مارے جانے والے کا ماضی کریدا جائے گا۔ یہ حالات انہیں چکرا کے رکھ دیں گے۔ بوکھلاہٹ میں ان سے ایسی ایسی غلطیاں ہوں گی کہ وہ عذاب میں آجائیں گے۔‘‘

’’ان کی بازی ان ہی پر الٹ دی جائے گی۔ میں پوری طرح تمہاری ہم خیال ہوں۔ رمیش کا قتل اب ضروری ہی نہیں، ناگزیر ہوچکا ہے۔ پولیس کو سوچنے کے لیے لائن اور ستم آزمائی کے لیے ٹارگٹ میسر ہوں گے تو ہمارے لیے خطرات بہت کم ہوجائیں گے اور ہم سکون سے رہ سکے گے۔‘‘

’’بدری کو ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ رمیش کے قتل سے کیسی الجھنیں جنم لے سکتی ہیں ورنہ وہ اس کام پر ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ جب پولیس رمیش کے بارے میں چھان بین شروع کرے گی تو بدری کے لیے بھی کچھ دشواریاں پیدا ہوں گی۔ یہ مجبوری ہے۔‘‘

’’ہوسکتا ہے کہ ہائی کمیشن والے رمیش کے قتل کے بعد بدری کو سرے سے سامنے ہی نہ لائیں۔‘‘

’’تازہ امیگریشن ریکارڈ کی وجہ سے یہ مشکل ہوگا۔ اس کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ ہائی کمیشن میں اس کے ہمدردوں کا کتنا اثر و رسوخ ہے۔‘‘

’’رمیش کے قتل کے بعد حالات اسی ڈگر پر چلیں گے۔بس ایک ہلکا سا جھول پولیس کو تشویش میں مبتلا کرسکتا ہے۔ مرنے والے بھارتی اور پکڑے جانے والے بھی بھارتی ہوں گے۔اس بنا پر قتل کا کوئی مضبوط محرک سامنے نہیں آسکے گا۔‘‘ ویرا نے آہستہ سے کہا۔

’’بھارت ایک بڑا ملک ہے۔وہاں کسی نہ کسی خطے میں ہر وقت بغاوت کی کوئی نہ کوئی تحریک موجود رہتی ہے۔ کوئی اور سبب دریافت نہ ہوا تو یہ خوں ریزی سیاسی

منافرت کے کھاتے میں ڈال دی جائے گی۔ اس پر ہمیں سرکھپانے کی ضرورت نہیں۔ میری نظریں اس قتل سے ہونے والے فوائد پر مرکوز ہیں۔"

"فائدوں کے ساتھ ایک بڑا خطرہ بھی تمہاری نظر میں رہنا چاہیے۔" ویرا نے سنجیدگی سے کہا۔

"بڑا خطرہ بس ایک ہی ہوسکتا ہے۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا "بدری ناتھ کا دامن بالکل بے داغ رہنا چاہیے۔ کسی کو شبہ بھی ہوگیا کہ رمیش اگروال کو اس کی مرضی یا اشارے پر مارا گیا ہے تو سارا پروگرام منسوخ کرکے اسے امریکا کے بجائے بھارت بھیج دیا جائے گا اور ہماری ساری بھاگ دوڑ رائگاں جائے گی۔ میں اس کے سہارے ڈیوڈ اسٹارز کے آئزک نیل تک پہنچنے کی آس لگائے بیٹھا ہوں۔

"تمہارا منصوبہ ایسا ہے کہ یہاں والے بدری ناتھ کی بے گناہی کی گواہی دیں گے۔ ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا نک موڈلے بھی ان حقائق کو نہیں جھٹلا سکے گا۔ پھر بھی میں بتادوں کہ بدری ناتھ امریکا بھیجا جائے یا بھارت، ہم دونوں امریکا ہی جائیں گے۔ کراچی سے لندن تک آنے کے بعد بے نیل مرام لوٹنا ناممکن ہے۔ بدری ناتھ کی مدد کے بغیر بھی ہم وہاں کچھ نہ کچھ کامیابیاں حاصل کرلیں گے۔"

اس کے ارادے جان کر مجھے تقویت کا احساس ہوا ورنہ بدری ناتھ کے مایوسانہ رویے نے مجھے کچھ ناامید سا کردیا تھا۔ وہ پیشہ ورانہ رقابتوں کے جال میں پھنس کر ایسی بے بسی کا شکار ہو چکا تھا کہ اس کا حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے بس ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ وہ کسی طرح اپنی آستین کے اس سانپ سے نجات حاصل کرلے جو اس کا سایہ بن کر دھیرے دھیرے اسے ڈس رہا تھا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ اس کے بعد اسے کہاں بھیجا جاتا۔

ویرا نے اپنے پرعزم الفاظ سے میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف کردی تھی۔ ہم کراچی سے ایک مشن لے کر نکلے تھے۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ اس وقت تک اس مشن میں بدری ناتھ کو کلیدی اہمیت حاصل تھی مگر میں یہ بھول رہا تھا کہ مشن کبھی بھی افراد کے محتاج نہیں ہوتے۔ کسی کو موت کی دلدل نگل لیتی ہے تو دوسرے اس مشن کو آگے بڑھاتے ہیں۔

لندن میں وہ سب نہ ہوا ہوتا اور بدری کو امریکا کوچ کرنے کا حکم مل جاتا مگر دوران سفر ہی وہ مر جاتا تو کیا ہوتا؟ اس وقت بھی ہمیں اس کے بغیر ہی اپنی راہ بنانا پڑتی۔ مجھے خوشی ہوئی ویرا نے اپنے دوٹوک الفاظ سے میرے وسوسوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

"اچھا ہوا کہ یہ بات بھی اسی وقت صاف ہوگئی۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا "بدری کے بغیر امریکا سفر کے بارے میں میرا ذہن صاف نہیں تھا۔"

"تمہارا ذہن؟" ویرا استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی "وہ تو کسی وقت بھی صاف نہیں رہتا۔ اس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی شیطانی چکر چلتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رمیش کو مار لینے کے بعد کوئی گڑبڑ ہوتی تو تم بھی اسی نتیجے پر پہنچتے کہ ہماری واپسی مناسب نہیں۔ بدری کے بغیر ہمارا کام مشکل ضرور ثابت ہوسکتا ہے مگر ناممکن نہیں۔ اب تک ہم نہ جانے کتنے بڑے بڑے معرکہ سر کرتے آئے ہیں۔"

باہمی طور پر جملہ معاملات طے پاچکے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "اجازت ہو تو اب بدری کو فون کرلوں؟"

ویرا ہنس پڑی اور میں فون پر سری نواسن کا نمبر ملانے میں مصروف ہوگیا۔

اس مرتبہ شاید سری نواسن کی بیوی نے فون اٹھایا۔ اس کی آواز نرم اور بااخلاق تھی۔ اس وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک ہی نام سے بار بار بدری کو فون کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس طرح دوسروں کے ذہنوں میں بہت سے شکوک وشبہات پیدا ہوسکتے تھے۔

میں نے انگریزی لب ولہجے میں اسے اپنا نام جان بتا کر بدری سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے شاید انگریزی پر زیادہ عبور نہیں تھا۔ اس نے بوکھلا کر صرف "ہولڈ" کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

چند ثانیوں بعد میرے کانوں میں بدری کی تحیر زدہ آواز آئی۔ "میں بدری بول رہا ہوں۔ تم کون؟ کیا میں تم سے واقف ہوں؟" اس نے ایک ہی سانس وہ فقرے انگریزی میں ادا کیے تھے۔

"انگریزی مت بولو۔ حلق کا کوا گر جائے گا۔" میں نے پرمزاح لہجے میں کہا "میں نے سوچا کہ اس بار نام کے ساتھ قومیت بھی بدل لی جائے تو تمہارے ساتھی گرنام کے بارے میں زیادہ نہیں سوچیں گے۔"

"اوہ! تو یہ تم ہو...... کہو کیا سوچا ہے تم نے؟" ایک گہرا سانس لے کر وہ اردو پر آگیا۔

"کل کا پروگرام ہے۔ دن میں گھر والے غائب ہوتے ہیں۔ تم بھی غائب ہوجاؤ۔ کام ہوجائے گا۔" میری آواز غیر ارادی طور پر دھیمی اور رازدارانہ ہوگئی۔

"تو کیا یہ کام یہیں ہوگا؟" اپنے تمام تر تجربے اور شقاوت کے باوجود وہ اس انکشاف پر گھبرا گیا۔

"اس سے بہتر موقع اور جگہ تم تجویز کردو۔" میں نے ذمے داری اسی پر ڈال دی۔

لمحہ بھر کے لیے لائن پر سکوت طاری رہا۔ شاید وہ تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اس کی سرگوشیانہ آواز ابھری "کل گیارہ بجے میں اپنے سفارت خانے چلا جاؤں گا پھر شام کو سری کے ساتھ ہی واپس آؤں گا۔ اسکول سے پہلا بچہ دو بجے آتا ہے۔ تمہارے لیے یہ وقت کافی ہوگا۔"

میرے کہے بغیر اس نے اپنے سفارت خانے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ اس کی ذہانت کا کھلا ثبوت تھا۔ ہنگامی طور پر سوچتے ہوئے بھی اس نے اپنے تحفظ کے پہلو کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔

"تمہیں وہاں پہنچنے میں وقت لگے گا۔ میں بارہ سے ڈیڑھ بجے تک فارغ ہوجاؤں گا۔ اب جلدی سے پتا بھی بتادو تاکہ میں آج رات ہی جائزہ لے لوں۔"

گھر کے نمبر، سڑک کے نام اور علاقے پر مشتمل وہ بہت مختصر سا پتا تھا۔ پتا بتانے کے بعد اس نے بے اعتباری سے پوچھا "یہ پروگرام بالکل پکا ہے یا اس میں کسی تبدیلی کا امکان بھی ہے۔"

"اٹل سمجھو۔ کوئی بڑی قدرتی آفت نازل نہ ہوئی تو یہ واقعہ رونما ہوکر رہے گا۔"

"گڈ لک اینڈ گڈ بائی۔" اس نے گفتگو کو طول دیے بغیر فون بند کردیا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ یہ کام تمہارے بجائے مجھے کرنا چاہیے۔" میرے فارغ ہوتے ہی ویرا بول پڑی۔

"تمہارے ذہن میں ایسے ہی نادر خیال آتے ہیں۔ ان کے اظہار میں احتیاط سے کام لیا کرو۔"

"بات مذاق میں مت ٹالو۔ میں تمہارے بھلے کی سوچ رہی ہوں۔ وہ تم سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔ ایک دن کا شیو بڑھا کر تم اس کی نظروں کو دھوکا نہیں دے سکو گے۔ کراچی میں تم سے بچھڑنے کے بعد وہ سری نواسن کے دروازے پر اچانک ہی تمہیں اپنے روبرو دیکھے گا تو اس کی چھٹی حس جاگ اٹھے گی۔ وہاں معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ ویسے بھی وہ تم پر کبھی بھروسا نہیں کرتا تھا۔ وہ بھڑک گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے اٹھائے ہوئے نکتے نے مجھے فکرمند کردیا۔ میرے برعکس وہ رمیش اگروال کے لیے اجنبی تھی اور پھر ایک خوب صورت دوشیزہ تھی۔ ہر اوباش صفت مرد اس جیسی اجنبی لڑکیوں پر خوشی کے ساتھ اپنے دل اور گھر کے دروازے کھول دیتا ہے۔

"یہ مسئلہ اسی وقت پیدا ہوگا جب دروازے کی گھنٹی بجا کر اندر جانا پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ اس گھر میں داخلے کا کوئی اور راستہ بھی ہو۔ گھر کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مہذب انداز میں دروازے سے اندر جانا ہی مناسب رہے گا۔ دن دہاڑے کسی بھی آبادی میں کھڑکی توڑ کر اندر گھسنا محفوظ نہیں ہوتا۔ ساؤتھ آل کے رہنے والے آج کل گیتا اور جمو کے دہرے قتل کی وجہ سے ویسے ہی ضرورت سے زیادہ چوکنے ہوں گے۔ کسی نے تمہاری جھلک بھی دیکھ لی تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ ایسا کوئی خطرہ مول لوں گا۔ میں وہاں......"

ویرا نے میری بات درمیان میں سے ہی اچک لی "یہ فیصلہ ہوجانا چاہیے کہ اسے کون ٹھکانے لگائے گا۔ جو کام کرے گا، جائزہ بھی اسی کو لینا ہوگا۔ تم واپسی پر میری

رائے سے متفق ہو گئے تو مجھے بھی اس طرف دوڑ لگانی پڑے گی۔ آخر تم مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کر رہے ہو؟"

"اعتماد کی بات نہیں، میں تم پر بلاوجہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔" میں نے اصرار کیا۔

"یہ بوجھ نہیں ہے۔ حالات کے سبب میں خود پیشکش کر رہی ہوں۔ یہاں پڑے پڑے میرے ہاتھ پیروں کو زنگ لگ رہا ہے۔ تم گیتا اور جیمز کے ساتھ ورزش کر چکے ہو۔ اس بار میں ہاتھ پیر رواں کر لوں تو کیا برا ہے؟"

ویرا کا انداز اس قدر خوشامدانہ تھا کہ میں بے اختیار ہنس دیا۔ "تم بہت ڈھیٹ اور ضدی ہو۔ تم وہاں جاؤ گی تو گیتا کا ریوالور تمہارے پاس ضرور ہو گا مگر اس کے استعمال سے پیدا ہونے والا شور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے قول کے مطابق تمہیں ہاتھ پیروں ہی سے کام لینا ہو گا۔"

"تم فکر مت کرو۔ کام تمہارے اطمینان کے مطابق نہ ہوا تو پیسے واپس۔" وہ خوش ہو کر بولی اور کرسی چھوڑ کر فوراً ہی باتھ روم کی طرف چل دی۔

بظاہر ویرا نے مجھے اپنا ہم خیال بنا کر ایک بڑی کامیابی حاصل کی تھی لیکن اس کی تجویز ابتدا سے ہی میرے دل کو لگی تھی اور میں نے اس پر امکانی خطرات واضح کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اگر ویرا کے ذریعے ایک کام محفوظ اور ستھرے اندا. میں ہو سکتا تھا تو محض انا پرستی کی خاطر اس میں سنگین خطرات مول لینا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔

چند منٹ بعد ویرا غسل خانے سے برآمد ہوئی تو تر و تازہ اور بالکل تیار تھی۔

"اب میں یہاں اپنے پہلے مشن پر نکل رہی ہوں۔ تم گھر پر آرام کرو۔" وہ اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر ایک ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"اتنا مبالغہ نہ کرو۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "پچھلے قصے میں بھی تم شروع سے آخر تک شریک تھیں اور تم ہی نے جیمز پنڈت کی پشت پر لات رسید کر کے اس ڈرامے کو اختتام تک پہنچایا تھا۔ اس بار تم میری شراکت سے گریز کر رہی ہو۔"

"اسے میرا پہلا سولو مشن کہہ لو۔" ویرا نے اسی موڈ میں جواب دیا "پچھلی بار لات میں نے رسید کی اور اسکور تم نے کر لیا۔ کل حالات سازگار رہے تو میرا اسکور بھی تمہارے برابر ہو جائے گا۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ ایسے معاملات میں تمہاری برابری کر کے مجھے بہت تسکین ملتی ہے۔"

اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں جوڑ کر انہیں چوما اور پھر وہی ہاتھ فضا میں میری طرف اچھال کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا زیر لب مسکراتا رہا۔ اگر وہ کسی بھی وجہ سے خوشی سے سرشار تھی تو میں اسے اس سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اپنی ذات میں ایک بالکل ہی انوکھی لڑکی یا عورت تھی۔ اس کے دل میں میرے لیے بیک وقت محبت، عداوت، منافقت اور مسابقت کے جذبات موجزن رہتے تھے اور وہ اپنے موڈ کے مطابق دل کھول کر ان کا اظہار کرتی رہتی تھی۔

یہ اس کی کھلی منافقت ہی تھی کہ ایک طرف وہ غزالہ کی غم گسار اور خیر خواہ ہونے کی دعوے دار تھی اور دوسری طرف سب کی نظریں بچا کر مجھ پر تحریص اور ترغیب کے حربے آزمانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔

میں بستر پر دراز ہو کر یہی سب سوچتا اور ماضی کی یادوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر یکا یک ہی مجھے خیال آیا کہ میں باتوں میں الجھ کر ویرا کو ایک اہم ترین مشورہ دینا بھول گیا تھا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ سے ساؤتھ آل تک سفر کے لیے کئی ذرائع موجود تھے لیکن پیدل چلے بغیر تیزی سے اس دور افتادہ منزل تک پہنچنے کے لیے ٹیکسی بہترین ذریعہ تھی۔ واردات کے انکشاف کے بعد شناخت کے خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ٹیکسیوں کا پیچھا چھوڑ دیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں زمین دوز ریل یا بس بہتر تھی جن میں ہر وقت اتنے مسافر اترتے چڑھتے ہیں کہ اس بھیڑ میں کسی کے لیے اپنے کسی ہم سفر کا چہرہ مہرہ یاد رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

میں ویرا کو یاد دہانی کرانی بھول گیا تھا مگر مجھے امید تھی کہ اس نے ذرا بھی احتیاط سے کام لیا تو وہ اس خطرناک نکتے کو فراموش نہیں کر سکے گی۔

اس وقت میں ہوٹل کے کمرے میں اکیلا تھا۔ سوچنے اور ویرا کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی۔

عام حالات میں، میں بے خبری کی گہری نیند سوتا ہوں لیکن سر پر بھیانک خطرات منڈلا رہے ہوں تو خفیف سی اجنبی آہٹ سے بھی میری نیند اچاٹ ہو جاتی ہے پھر وہ تو چوبی دروازے پر ویرا کی دستکیں تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کر مسہری چھوڑی اور دروازہ کھول دیا۔

ویرا کے بشرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو اندازہ ہوا کہ میں کافی دیر تک سوتا رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ میرے جاتے ہی تم سو جاؤ گے۔" وہ اپنے ہاتھ میں لٹکا ہوا وزنی شاپنگ بیگ میز پر ڈالتے ہوئے بولی "تنہا رہ کر کسی کا انتظار کرنا دنیا کا بدترین کام ہے اور میں اکثر اس امتحان سے گزرتی رہی ہوں، آج تم نے بھی یہ تجربہ کر لیا۔"

"تجربہ بہت خوش گوار تھا۔ کئی دن کے بعد گہری اور لمبی نیند نصیب ہوئی ہے۔"

"اور شاید تمہیں بھوک بھی نہیں لگ رہی ہو گی؟" اس نے طنز سے پوچھا۔

"بھوک اور نیند..... انسان کی بس یہی دو بنیادی ضرریات ہیں۔ جسے پیٹ بھر کر من پسند کھانا اور بے فکری کی نیند میسر ہو، وہ خوش نصیب ہوتا ہے۔ مقابلے کی دوڑ میں شامل ہو کر ہر شخص نے اپنے اوپر ایسی ایسی خود ساختہ ضرورتوں کا بوجھ لاد لیا ہے کہ زندگی عذاب ہو گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس تھیلے میں کھانے کا سامان ہی لائی ہو۔"

"عجیب بات ہے کہ تم نیند سے بیدار ہوتے ہی فلسفہ بول رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوتے ہوئے تمہاری عقل معدے میں اتری ہوئی تھی اور وہیں کام دکھا رہی تھی۔"

میں نے اسے نظر انداز کر کے شاپنگ بیگ خالی کرنا شروع کر دیا جس میں گتے کے دو ڈبوں کے ساتھ پینے کے کچھ لوازم بھی موجود تھے۔

مجھے حریصانہ انداز میں اس کارروائی میں مصروف دیکھ کر ویرا تیزی سے آگے بڑھی اور دھکیل کر مجھے الگ کر دیا "ابھی سو کر اٹھے ہو اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ میں اس طرح تمہیں ایک لقمہ بھی نہیں لینے دوں گی۔"

"میں خود بھی ان باتوں کا خیال رکھتا ہوں مگر غسل خانے میں جانے سے پہلے تمہاری کارکردگی کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میری کارکردگی؟" وہ غرائی "تو کیا میں تمہارے لیے من و سلویٰ لینے گئی تھی؟"

"بھٹیار خانوں کے ڈبوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے جیسے یہی اصل کام تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بھنا کر غصیلے لہجے میں بولی "اگر میرا اصل کام یہی تھا تو اب مجھ سے ساؤتھ آل کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔"

"نہ دینا۔ وہ سولو مشن اب تمہارا دردِ سر ہے۔ میں تو شکم سیر ہو کر دوبارہ اشغفیل ہونے دہ رکھتا ہوں۔ صبح میں دیر تک سوتا رہوں تو تم اپنے مشن پر نکل جانا۔"

میری اس بے نیازی پر ویرا سلگ کر رہ گئی اور میں غسل خانے میں گھس گیا۔

وہ کوئی فلیٹ یا گھر نہیں بلکہ لندن کے ہوٹل کا ایک کمرا تھا جہاں ہم صرف اسی صورت میں ایک دوسرے سے الگ رہ سکتے تھے کہ ہم میں سے ایک کمرے میں ہو تو دوسرا باتھ روم میں پناہ گزیں ہو جائے۔ اس وقت کے حالات میں، میں ہوٹل کے بار یا ریستوران میں جانے کا غیر ضروری خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دانت وغیرہ صاف کر کے میں تولیے سے منہ پونچھتا ہوا باہر آیا تو ویرا گلاس میں اسکاچ کا پیگ لیے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بلیک لیبل کی نصف لیٹر والی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

"اگر اعتراض نہ ہو تو میں بھی تمہارے اس شغل میں شرکت کر لوں؟" میں نے اس کے سامنے براجمان

ہوتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔
"تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں تمہیں کیسے روک سکتی ہوں؟" اس نے بے رخی سے کہا۔
اس کی فطرت سیمابی تھی۔ بعض اوقات وہ اتنی فراخ دل ہوجاتی تھی کہ بڑی سے بڑی بات کو بھی قہقہوں میں اڑا دیتی تھی اور کسی وقت اس قدر حساس ہوجاتی تھی کہ معمولی سی بات پر گھنٹوں ملول اور آزردہ رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ یک بیک ایسے ہی موڈ میں آچکی تھی۔
"یہ اسکاچ تم لے کر آئی ہو۔ یہ بوتل تمہاری ہے۔ تم چاہو تو مجھے اس کے استعمال سے روک سکتی ہو۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے نرمی سے کہا۔
"یہ میری کیسے ہوسکتی ہے۔ تمہارے دیے ہوئے پیسوں سے خریدی گئی ہے اس لیے یہ صرف تمہاری ہے۔" اس نے فوراً ہی ایک دور از کار پہلو نکال لیا" تم چاہو تو میرے ہاتھ سے گلاس چھین سکتے ہو، مجھے اس کمرے سے نکال سکتے ہو کیونکہ یہ سب اخراجات تم برداشت کررہے ہو۔"
"ویرا! اب میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔" میں نے بے بسی سے دانت پیستے ہوئے کہا" تم کیا خرافات بک رہی ہو؟ تم پر اچانک اتنی قنوطیت کیوں طاری ہورہی ہے؟"
"یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ مجھ پر ہاتھ اٹھا کر آج اپنا یہ ارمان بھی پورا کرلو۔" وہ غٹاغٹ اپنا گلاس خالی کرکے ہلکی سی رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
"خدا کے لیے، اب تم کسی نوجوان بیوہ کی طرح رونا نہ شروع کردینا۔" اس کے تیزی سے بدلتے ہوئے رویوں نے مجھے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا۔
اس بار اس کے پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ تیر گئی اور وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی" جو بھی کسی کی بیوی ہی نہ بنی ہو وہ بیوہ کیسے ہوسکتی ہے...... تم فکر نہ کرو۔ میں رونے والیوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا نام ویرا ہے، ویرا۔ میں اپنے بدخواہوں کو رلا کر خود قہقہے لگانے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ بس گلاس خالی کرنے سے ذرا میری آواز بھرا گئی تھی۔"
میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا کہ اس نے بکھرتے بکھرتے اچانک ہی سنبھالا لے لیا تھا۔ میں نے کہا" تو کیا تم مجھے اپنا بدخواہ سمجھنے لگی ہو؟"
"ابھی تک میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ یہ تمہارے دل کا چور ہے جو تمہیں یہ پٹی پڑھا رہا ہے۔" وہ اپنے لیے دوسرا گلاس بناتے ہوئے بولی۔
میں نے فریج پر سے دوسرا خالی گلاس اٹھایا اور خاموشی سے اس کے سامنے رکھ دیا۔
ویرا نے میری اس حرکت پر کسی ردعمل کا مظاہرہ کیے بغیر میرا گلاس بھی بنا ڈالا اور دونوں پیر قالین سے اٹھا کر کرسی پر رکھ لیے۔ اس وقت وہ فارغ اور پرسکون نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔
"کبھی کبھی تم میری طرف سے حد سے زیادہ بدگمان ہونے لگتی ہو۔" میں نے شکوہ کیا۔
"یہ ہمیشہ تمہاری سوچی سمجھی حرکتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔" اس نے سگریٹ سلگا کر جواب دیا۔
"اس وقت میں نے تمہیں کون سے سینگ مارے تھے؟" اس کی قنوطیت میں کمی رونما ہوتے ہی میں نے قدرے مضبوط لہجہ اختیار کرلیا۔
"کیا میں اس وقت لندن کے بھٹیار خانوں کی خاک چھاننے ہی گئی تھی؟" اس نے مجھ سے نظریں چار کرکے تلخ لہجے میں پوچھا۔
"ایسی نادانی کی باتیں مت کرو۔ وہ مذاق تھا۔ ناموں سے بس معیار بدلتا ہے ورنہ بنیادی طور پر فاسٹ فوڈ والے بھی بھٹیار خانوں والی سہولتیں بہتر معیار پر پیش کرتے ہیں۔"
"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تمہاری نظروں میں میری اس ریکی کی کوئی اہمیت نہیں جو میں نے کل کے لیے کی ہے...... ساری اہمیت ان کے کھانوں کی ہے جو یہاں پڑے ہوئے ہیں۔"
"مذاق کی باتوں کو ایسا رنگ دیا جانے لگے تو پھر زبان پر تالے پڑنے لگتے ہیں۔"
"سفاک زبانوں پر تالے ہی بہتر رہتے ہیں۔ مذاق اور تضحیک میں بہت باریک سا فرق ہوتا ہے۔ اس وقت تم نے میری بہت بے رحمانہ دل آزاری کی ہے۔ میں تمہاری خوبیوں پر دل کھول کر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانی ہوں اور تم......؟ خود غور کرو کہ اس وقت تمہارا سلوک کیسا تھا؟"
"میں گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے زبان چل پڑی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے دل میں میری طرف سے غبار بھرا ہوا ہے۔ آئندہ میں محتاط رہوں گا۔"
"غنودگی میں تمہیں کوئی اچھی بات بھی سوجھ سکتی تھی۔ میرے کاموں میں تم کیڑے ہی کیوں نکالتے ہو؟"
"اس وقت میں نے تمہارے کسی کام میں کوئی کیڑا نہیں نکالا۔ میری زبان پر بھٹیار خانوں کا نام آتے ہی تمہاری ذہنی رو بہکی تھی۔ میں نے تمہاری دل آزاری کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے لیے میں ہر قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔ چلو، اب بتاؤ کہ ساؤتھ آل میں تمہیں کیا خاک چھاننی پڑی۔"
"اس بارے میں اب تم مجھ سے کچھ نہیں جان سکو گے۔ جس معاملے کو تم غیر اہم قرار دے کر مسترد کرچکے ہو، اب اس پر وقت برباد مت کرو۔ جو کچھ ہوگا، ٹیلی وژن پر اور اخباروں میں آجائے گا۔ یہ عمدہ اسکاچ ہے۔ دو تین گلاس پیو، بھٹیار خانے سے لایا ہوا کھانا کھاؤ اور اپنے اصل پروگرام کے مطابق اٹا غفیل ہوجاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
"تم نے زبان نہیں کھولی تو میں سوؤں گا اور نہ تمہیں سونے دوں گا۔" مجھے غصہ آگیا۔
لمحہ بھر کے لیے ویرا کی آنکھوں میں ایک تیز حیوانی چمک لہرائی پھر وہ اطمینان سے بولی" سونے کا وقت آیا تو یہ بھی دیکھ لیا جائے گا۔ اس وقت ان بے سروپا دھمکیوں سے میرا نشہ خراب مت کرو۔ میرا دماغ سنک گیا تو اسی وقت ہوا خوری کے لیے نکل پڑوں گی اور پھر ہمیشہ سے نٹے بغیر اس کمرے میں قدم نہیں رکھوں گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں جو کہتی ہوں وہ کر بھی گزرتی ہوں۔"
اس کی وہ دھمکی خطرناک تھی۔ میں نے کرسی سرکا کر اس کا رخ قدرے تبدیل کیا اور اس پر تن کر بیٹھ گیا۔ اس طرح ویرا میری نظروں کے سامنے نہیں رہی تھی مگر میں کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ منہ پھلا کر ٹیلی وژن کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اسکاچ کا گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں روشن سگریٹ دبی ہوئی تھی۔
کافی دیر تک ہم دونوں یوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ میں نے خالی گلاس میز پر رکھا تو ویرا نے میری فرمائش کے بغیر اسکاچ اور یخ پانی ملا کر میرا گلاس لبریز کردیا۔ میں نے اس کی رضا کارانہ ساقی گری کا شکریہ ادا کیے بغیر گلاس دوبارہ اٹھا لیا۔
اس وقت لندن کی سرزمین پر صرف ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ہمدرد اور رازداں ہوسکتے تھے لیکن ویرا نے اپنی حماقت اور کٹ حجتی کی بنا پر ایسی ناخوش گوار صورت حال پیدا کردی تھی کہ اس کے طول پکڑنے کا تصور بھی مجھے سوہان روح محسوس ہونے لگا تھا۔
میں نے محسوس کیا کہ بظاہر مجھے نظر انداز کرنے کے باوجود وہ بھی رہ رہ کر میرے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔
وہ صبر آزما آنکھ مچولی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ ایک مرتبہ ہم دونوں نے بیک وقت چور نظروں سے ایک دوسرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ غیر متوقع طور پر ہماری نظریں چار ہوئیں اور کمرا ویرا کے خفت آمیز قہقہے سے گونج اٹھا۔
وہ ایسی مضحکہ خیز صورت حال تھی کہ میں نے بھی کھسیائے ہوئے انداز میں باچھیں پھیلا دیں۔
"آخر ہم دونوں ہر وقت ایک دوسرے کو گھنے اور بے وقوف بنانے کی کوششوں میں کیوں مصروف رہتے ہیں؟" اپنی ہنسی پر قابو پا کر ویرا نے بے بسی کے لہجے میں پوچھا۔
"اپنا یہ اعتراف کسی جواز کے بغیر میرے سر تھوپنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے رکھائی سے کہا" میں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔"
"اس وقت تم کسی افلاطون کی طرح اکڑ کر کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے جیسے مجھے یکسر فراموش کردیا ہو پھر بار بار چور نظروں سے میری طرف کیوں دیکھ رہے تھے؟"

''تم ٹیلی وژن دیکھنے میں منہمک تھیں تو تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں تمہارا جائزہ لے رہا ہوں؟'' میں نے تنک کر سوال کر ڈالا۔ اس وقت ہم دونوں پر نشے کی ہلکی سی جھونک سوار ہو چکی تھی۔

''شاید ہم یہاں ایک دوسرے کی ضرورت یا مجبوری بن کر رہ گئے ہیں۔'' اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بات وہیں سمیٹ دی۔ ''بوتل خالی ہونے والی ہے۔ آخری پیگ پیتے ہوئے ہم کچھ اچھی اچھی باتیں کریں گے۔ اب جلدی سے اپنا گلاس خالی کر ڈالو۔''

''رمیش والے ...'' اسے سمجھوتے پر آمادہ پاتے ہی میں نے اپنے دماغ میں کلبلاتے ہوئے سوال کو الفاظ کے روپ میں ڈھالنا چاہا مگر ویرا نے میری بات فوراً کاٹ دی۔

''اس بارے میں اب ایک لفظ بھی نہ بولنا۔ میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ لندن کی یہ سرد رات مجھے کسی پارک کی بینچ یا فٹ پاتھ پر بسر کرنی پڑی تو میرے نمونیے کا عذاب تمہاری گردن پر ہوگا۔ اس کے سوا تم دنیا کے ہر موضوع پر مجھ سے بات کر سکتے ہو۔''

وہ اس بارے میں اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے حلق میں تلخی سی گھلتی محسوس کی۔

دونوں گلاس خالی ہو کر میز پر پہنچ چکے تھے۔ ویرا بہت اہتمام سے قطرہ قطرہ اسکاچ میرے گلاس میں ٹپکاتی جا رہی تھی اور اسی کے ساتھ بوتل میں رہ جانے والی مقدار کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ میرا حصہ پورا کرنے کے بعد وہ اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں دلچسپی سے اس کی وہ حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ کسی عادی اور پیشہ ور شرابی جیسی حرکات کر رہی تھی۔

آخری چند قطرے ٹپکانے کے بعد اس نے بوتل سیدھی کی۔ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے چوما اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''لاسٹ لکی ڈراپ میرا ہے اور یہ رات بھی میری ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اچانک ہی بوتل اپنے گلاس پر الٹ دی۔ بوتل کی گولائیوں میں رہی سہی اسکاچ کی ایک چھوٹی سی بوند پھسل کر ویرا کے گلاس میں ٹپک گئی۔

ویرا نے بوتل میز پر رکھ کر ایک دیا سلائی روشن کی اور اسے بس اتنی دیر تھامے رہی کہ مسالا جلنے کے بعد تیلی شعلہ پکڑ لے۔ یکساں شعلہ نمودار ہوتے ہی ویرا نے وہ جلتی ہوئی تیلی بوتل میں ڈال دی۔ تنگ منہ والی بوتل میں بھق کی ایک تیز آواز کے ساتھ الکحل کے بخارات نے آگ پکڑ لی اور لمحہ بھر میں وہاں صرف سرمئی دھواں بھرا رہ گیا۔

ویرا نے بوتل میز سے اٹھا کر نیچے ڈال دی اور فخریہ لہجے میں بولی۔ ''آخری قطرہ میرا تھا۔ اب کوئی اس بوتل کو کولھو میں پیس کر بھی کچھ نہ نکال سکے گا۔ یہ میرا شگون تھا۔''

آخری فقرے پر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہاں مجھے بلور کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں میں خمار کے ڈورے تیرتے نظر آرہے تھے۔ میرے بدن میں سنسنی کی لہریں سرایت کر گئیں۔

ویرا نے میرے گلاس میں ٹھنڈا پانی اور اپنے گلاس میں برف کے چند ڈلے ڈال کر پیگ مکمل کیے۔ اس بار فضا میں شیشے سے شیشہ ٹکرانے کی ہلکی سی مترنم آواز گونجی اور پھر اس محفل کا آخری دور شروع ہو گیا۔ پہلا گھونٹ لینے کے بعد ویرا نے دونوں ڈبے کھول دیے جن پر کیے جانے والے تبصرے سے اس رات کی خرابیوں کا آغاز ہوا تھا۔

اپنی لائی ہوئی بوتل سے آخری قطرہ کشید کر لینے کے باوجود ویرا ذرا بھی نہیں بہکی تھی۔ بس گہرے سرور میں آگئی تھی۔ یہی کچھ کیفیت میری بھی تھی۔ میں نے اپنی اس بری عادت کو ترک نہیں کیا تھا مگر مہینوں سے بس بقدر اشک بلبل ہی اور وہ بھی کبھی کبھی لیتا تھا۔ اتنے لمبے تعطل کے بعد اس رات ویرا کے ساتھ ذرا سی بے اعتدالی کی تو طبیعت میں اس کا رنگ آنا ناگزیر تھا۔

ویرا کو نہ صرف ضد یاد تھی بلکہ میری دی ہوئی دھمکی بھی یاد تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد اس کی جون ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کے دماغ پر چھائی ہوئی قنوطیت اور مایوسی شوخیوں کے سیلاب میں نہ جانے کہاں بہہ گئی تھی۔ اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اور وہ میرے ساتھ مسلسل منہ زوری پر آمادہ تھی۔ میں مدافعانہ انداز میں اسے ڈھیل دے کر اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب اس کے تھکے اعصاب اس کی خوش فعلیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے۔

میرے لیے وہ لندن کی ایک طویل مگر بے ثمر رات تھی۔ ہر جتن اور ہر ناز برداری کے باوجود میں ویرا کی زبان سے رمیش کے بارے میں ایک لفظ بھی اگلوانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

تھک ہار کر میں سویا تو رات کا بڑا حصہ دھیرے دھیرے گزر چکا تھا۔ میرے ذہن پر ایک ہی خوف سوار تھا کہ کہیں ہم اگلی دوپہر تک سوتے ہی نہ رہ جائیں اور رمیش کے آسیب سے نجات پانے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔

یہ اسی لاشعوری دباؤ کا نتیجہ تھا کہ صبح دس بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ویرا بے سدھ سے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا حسن خوابیدہ مسہری کے اس حصے کو گویا آگ لگائے دے رہا تھا۔

میں بس چند ثانیوں تک پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھتا رہا۔ قربتوں اور فاصلوں کے شب گزیدہ تصور ذہن میں ایک نئے جہنم کو بھڑکانے لگے تو میں نے اضطراری انداز میں اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

وہ بڑبڑا کر بیدار ہو گئی۔ اس کی مخمور نگاہوں میں حیرت سی تھی اور ہونٹوں پر ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

رات گزر چکی تھی۔ ویرا نے رات کی تاریکی اور خنکی ہی سی مجھے ڈرا دادیا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے میں نے ایک نئے عزم سے رمیش اگروال کا ذکر چھیڑ دیا۔

''تم باز نہیں آؤ گے۔'' وہ شوخی سے بولی ''ہمیشہ تم نے میری انا کو تاراج کیا ہے اور اب بھی میری ضد کو توڑنے پر تلے ہوئے ہو۔ آخر کیا چاہتے ہو؟''

''تم ایک خطرناک مشن پر جا رہی ہو۔ رات بھر زبان بند رکھ کر تم اپنی ضد پوری کر چکی ہو۔ اب ناشتے کے بعد تمہیں نکل جانا ہے۔ میں دل و جان سے تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو رہوں گا مگر کسی وجہ سے تم ناکام بھی ہو سکتی ہو۔ تمہارے تحفظ کے لیے میرا کسی حد تک باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔''

''تم کیا جاننا چاہ رہے ہو؟'' آخر کار اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تمہارا منصوبہ کیا ہے؟ وہاں تک کیسے جاؤ گی؟ اس کا سامنا کیسے کرو گی؟''

''میں کل بھی ٹیوب اور بس کے ذریعے وہاں گئی تھی۔ آج بھی یہی ارادہ ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے چھوٹے گھر ہیں جہاں دروازے کے سوا کسی اور راستے سے داخلے کی کوشش خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں ایک نووارد بیمہ ایجنٹ بن کر اس تک رسائی حاصل کروں گی۔ بعد کے حالات کا انحصار اس کے رویے پر ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ میں ریوالور استعمال نہ کروں لیکن ضرورت پیش آئی تو میں فائر بھی کر گزروں گی۔ میرا نشانہ بے خطا ہے۔ اگر صرف ایک گولی چلائی جائے تو کسی کو بھی اس کی سمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ فائر کے بعد مجھے گھبراہٹ کے بجائے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔''

''تم اس کی لاش کے ساتھ وہیں رک کر لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کرو گی؟'' میں نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا ''کیا تمہیں وہاں سے نکلنے کا موقع مل سکے گا۔''

''میں یہاں بیٹھ کر سب کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہاں رونما ہونے والے واقعات میں وہ برابر کا کردار ادا کرے گا۔ میرے ذہن میں بس ایک مبہم سا خاکہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں تین بجے تک یہاں واپس لوٹ آؤں گی۔ تم کو یاد نہیں کہ رات کو لاسٹ لکی ڈراپ میرا تھا۔ وہ شگون کام کرے گا...... رات میری تھی اس کی کوکھ سے نکلنے والا دن بھی میرا ہی ہوگا۔''

وقت تنگ تھا۔ ویرا کو محفوظ ذرائع سے ایک لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں نے اضطراب کے عالم میں کہا ''تم چاہو تو میں بھی دور رہ کر تمہاری دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔''

''آخری لمحات پر ایسی باتیں کر کے تم میرا حوصلہ پست کر دو گے۔ وہاں دو آدمیوں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ فائر ہوتے ہی خوف زدہ...... لوگ گھروں سے نکلیں گے اور اپنی گلیوں میں بھٹکتے ہوئے ہر اجنبی کو دھر لیں گے۔ وہاں خوف دہراس کا راج ہے۔''

جاتے جاتے وہ میرے سامنے آگئی ''ایک دوسرے سے دور رہ کر ہم فائدے میں رہیں گے۔کامیابی ہر جگہ سرچڑھ کر بولتی ہے۔میں ناکام ہوگئی تو تم ان لوگوں سے میرا بدلہ لو گے۔میں اکیلی جان ہوں اور غزالہ کو تمہاری ضرورت ہے۔مجھے کچھ ہو جائے تو میری غلطیوں اور خطاؤں کو معاف کر دینا۔''

میں نے بے اختیار ویرا کو اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔اس وقت وہ میرے لیے پچھلی رات والی سرکش اور منہ زور ویرا سے بالکل مختلف ایک قابلِ احترام لڑکی تھی۔

انسانی وجود کو ریزہ ریزہ کر دینے والے چند نرم ونازک اور دل گداز لمحوں سے گزر کر ویرا کمرے سے رخصت ہوگئی اور میں خالی پن کے احساس کے ساتھ کرسی میں گر گیا۔

ویٹر ناشتے کے ساتھ ڈیلی میل اخبار بھی لایا۔ جو اس وقت تک ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ویرا کی روانگی کے وقت اخبار کے مطالعے کا کوئی موقع محل نہیں تھا۔تھوڑی دیر بعد میں نے نیم دلی سے ڈیلی میل کے صحت مند شمارے کی ورق گردانی شروع کر دی۔اس وقت میرے اوپر خالی الذہنی کا سا عالم طاری تھا۔اخباری صفحات اور دنیا جہاں کے لیے بے شمار خبروں کے ساتھ ساتھ مضامین اور تجزیوں پر مشتمل اس قدر متنوع اور کثیر مواد یکجا کر دیا گیا تھا کہ اس اخبار کا کوئی باقاعدہ قاری بھی فرصت کے محدود وقت میں اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔ہاں یہ ضرور تھا کہ ان صفحات میں ہر ذوق کے قاری کو اپنی اپنی پسند کی کچھ نہ کچھ چیزیں مل سکتی تھیں۔

ویرا کے چلے جانے کے بعد میری طبیعت یکا یک اچاٹ ہوگئی تھی۔ذہن سنسنا رہا تھا۔لاشعور کے نہاں خانوں میں اس کی ناکامی کا موہوم سا امکان کسی زہریلے بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔میں نے کچھ پڑھے بغیر اخبار کی مشینی ورق گردانی مکمل کی اور پھر اسے ایک طرف ڈال دیا۔

ہم لوگ اس سے پہلے بھی بہت سے خطرناک کاموں میں ہاتھ ڈالتے رہے تھے۔کہیں سب مل جل کر دشمن پر کاری ضرب لگاتے تھے تو کہیں کوئی ایک اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر موت کے جبڑوں کو چیرنے کی مہم پر نکلتا تھا اور دوسرے کی غازیانہ واپسی کا انتظار کرتے تھے۔

وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔طویل اور صبر آزما انتظار کے ایسے لمحات سے گزرنا ہمارے معمولات میں شامل ہو چکا تھا اور میں نے کبھی بھی ایسے کرب واضطراب کا سامنا نہیں کیا تھا جو اس وقت میرے وجود میں خود بخود داخل چلا آرہا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ اس بار میری بے چینی شاید تنہائی کی وجہ سے تھی۔میں بے کاری کے عالم میں تن تنہا اس عذاب سے گزر رہا تھا۔اگر مجھے کسی معروفیت کی پناہ میسر آجاتی تو ذہن پر طاری ہونے والا بوجھ کم ہو سکتا تھا۔لندن میں میرا کوئی شناسا باقی نہیں رہا تھا جس کے ساتھ میں وقت گزار سکتا۔

بدری ناتھ اپنے ساتھی کے مقتل سے غیر حاضری کے چکر میں انڈین ہائی کمیشن میں تھا۔سلیم اکبر خان لندن میں اپنی مہلت کے آخری چند ایام بسر کر کے اپنے عبرت ناک انجام کا سامنا کرنے کے لیے کراچی پہنچ چکا تھا۔

.....دوشیزہ نظر آنے والی ایلیزا کا چہرہ بلش نقاب سرکتے ہی اپنی ساری دلکشی کھو بیٹھا تھا۔وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر لندن کی بھیگی بھیگی فضاؤں میں اپنے ارمانوں کی سیج سجا کر نہ صرف اپنے شوہر کی وفا کا خون کر رہی تھی بلکہ اپنے بچوں کی ممتا کو بھی دغا دے رہی تھی۔اپنے بہروپ سے اصل روپ میں آنے کے بعد وہ کسی بھی طرح اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ وقت بسر کیا جاتا۔

اس وقت شہر ٹیوڈر ہوٹل میں کام کرنے والی ہی ایک فراخ دل لڑکی قابلِ احترام تھی جو ایک گندے پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود صاف دل اور صاف گو تھی مگر اس کے لیے وہ آرام کا وقت تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ لندن میں چند دن گزار کر میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ کراچی کا وقت وہاں سے ان دنوں چار گھنٹے آگے تھا۔میری رسٹ واچ ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔اس کا مطلب تھا کہ کراچی میں شام کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

سلیم اکبر خان کراچی پہنچنے کے بعد پہاڑ جیسی رات اور تقریباً پورا دن گزر چکا تھا۔اس کے انجام کے لیے وہ مہلت بہت کافی تھی۔مجھے اول خان سے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

میں نے کراچی فون کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔میں اپنی دھن میں کھویا ہوا تھا، گھنٹی کے شور نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو ہوٹل کی شیریں سخن آپریٹر نے مجھے طویل فاصلے کی کال کی اطلاع دے کر فوراً ہی لائن میری طرف منتقل کر دی۔

دوسری طرف سے اول خان کی آواز سن کر خوشی سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا ''تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ابھی ابھی میں نے تمہیں فون ملانے کا فیصلہ کیا تھا کہ تمہاری کال آگئی۔یہ بتاؤ کہ یہاں سے بھیجے ہوئے تحفے کی کیا پوزیشن ہے۔میرے حساب سے اب تک اسے تمہاری تحویل میں ہونا چاہیے۔''

''ہاں۔''اول خان کی طرف سے جواب آیا ''کراچی پہنچنے کے بعد وہ زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکا۔رات کے گیارہ بجے وہ اپنے دفتر پہنچ کر تجوری سے مسروقہ خفیہ کاغذات نکالتے ہوئے پکڑ لیا گیا تھا......''

''تھا' کیا مطلب؟''میں نے بے چینی سے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

''تم ٹھیک سمجھے۔اب وہ ماضی کی بات ہوگئی۔وہ ہر راز اپنے سینے میں سمیٹ کر قصہ پارینہ بن چکا ہے۔''

اول خان کی سرد اور سپاٹ آواز ابھری''قومی رازوں کے ساتھ وہ فوجی رازوں میں بھی خیانت کر رہا تھا۔اس کی گرفتاری میں انٹرسروسز انٹیلی جنس کے باوردی افسران پیش پیش تھے۔غیر متوقع طور پر خود کو ان سنگین چٹانوں کے درمیان محصور پا کر وہ دہشت زدہ ہو گیا۔اپنے عبرت ناک انجام کے خوف سے اس پر اسی وقت دل کا دورہ پڑا اور وہ جناح اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔''

''یہ برا ہوا۔''میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا''وہ مر گیا لیکن اپنے ساتھیوں اور آقاؤں کے سارے نام بھی اپنے سینے میں لے گیا۔اب شاید ہمیں اندر کی پوری کہانیاں کبھی معلوم نہ ہو سکیں۔''

''انٹرسروسز والے جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اسے اس کے منطقی انجام تک ہر قیمت پر پہنچاتے ہیں۔شاید اس کہانی کے سارے کردار بے نقاب نہ ہو سکیں مگر بڑے مجرموں کی گردنیں نہیں بچ سکیں گی۔سلیم اکبر کے سارے خفیہ کاغذات اب ان کے قبضے میں ہیں۔ہر کاغذ خود بتائے گا۔وہ کہاں سے چل کر سلیم کی تجوری میں پہنچا تھا۔وہ ایسے ہر خائن ہاتھ کو بے رحمی سے کاٹ دیں گے جس نے کاغذات اور فائلوں کے اس سفر میں کوئی بھی سہارا دیا ہے۔اب تم اسے بھول جاؤ۔یہ مقدمہ اپنے اصل وارثوں کے ہاتھ میں پہنچ چکا ہے۔وہ اپنا حساب خود ہی بے باق کر لیں گے۔''

''اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔لیکن تمہاری آواز میں کوئی خوشی یا گرمجوشی نہیں ہے۔تم ایسے سرد اور سپاٹ مزاج کے مالک نہیں ہو.......کہیں ایسا تو نہیں کہ بنا بنایا کھیل اپنے ہاتھ سے نکل جانے پر تمہیں قلق ہو رہا ہو کہ اس کامیابی کا پورا سہرا ان لوگوں کے سروں پر سج جائے گا؟''

''وہ بھی ہم جیسے ہیں۔ہم سب ستائش کی تمنا یا صلے کی پروا کیے بغیر بے لوثی سے اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔''

وہ کسی قدر مجروح لہجے میں بولا''میرے یا میری بے نام فورس کے بارے میں ایسی چھوٹی باتیں مت سوچا کرو۔میری اداسی کا سبب سنو گے تو تم خود بھی دہل کر رہ جاؤ گے۔''

اول خان کے وہ چبھتے ہوئے الفاظ بہت سنگین تھے۔میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی سرسرانے لگیں۔میں نے اپنے ذہن پر ہونے والی اندیشوں کی بدترین یلغار سے سنبھل کر ڈرتے ڈرتے پوچھا''شاید تمہاری کال کا سبب بھی وہی ہے۔غزالہ تو خیریت سے ہے نا؟''

''وہ بال بال بچی ہے۔''مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اول خان کسی تنگ اور گہرے کنوئیں کی تہ سے بول رہا ہو۔میں سانس روکے ریسیور کان پر جمائے کھڑا رہا۔وہ کہہ

رہا تھا ’’اگر میری بیوی نے چند روز کے لیے اسے اپنے پاس نہ روکا ہوا ہوتا تو اس وقت ہم اس کے سراغ سے بھی محروم ہو چکے ہوتے......‘‘

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی ’’تم پہلے ہی سلیم کے تذکرے میں بہت وقت برباد کر چکے ہو۔ جلدی بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ غزالہ تمہارے گھر پر ہے تو سلطان شاہ کہاں ہے؟‘‘

’’کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔‘‘ اول خان کی آواز کرب آلود ہو گئی ’’میرے آدمی پورے شہر میں دیوانہ وار اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔‘‘

’’وہ تنہائی سے اکتایا ہوا تھا۔‘‘ میں نے پُر امید لہجے میں کہا۔ ’’ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے چلا گیا ہو۔‘‘

’’وہاں بیٹھ کر تم یہ سب سوچ سکتے ہو مگر کوئی خوش گمانی نہیں ہے۔ تمہارا گھر ابتر حالت میں ہے۔ فلیٹ کا پورا سامان الٹ پلٹ دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے اچانک ہی ہم پر کاری گھاؤ لگایا ہے۔‘‘

میرا دل ڈوبنے لگا۔ سلطان شاہ ایک مرتبہ پھر چکی کے دو وزنی پاٹوں کے درمیان آ گیا تھا۔

ہراساں اور جذباتی ہو کر ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ’’ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں باتیں نہ کرو۔ مجھے کھل کر بتاؤ کہ کیا ہوا ہے۔ وہ زندہ تو ہے نا؟‘‘

’’وہ یقیناً زندہ ہو گا۔‘‘ اول خان نے پُر یقین لہجے میں کہا ’’مارنا ہوتا تو وہ اس کی لاش فلیٹ میں ہی چھوڑ جاتے۔ وہ اس طرح غائب نہ ہوتا۔‘‘

’’تم کہتے چلے جاؤ۔ میں پوری توجہ سے ایک ایک لفظ سن رہا ہوں۔‘‘ اسے خاموش پا کر میں نے بے چینی سے لقمہ دیا ’’وقت ہمارے لیے سب سے اہم ہے۔ وقت کھو دیا تو وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتا ہے۔‘‘

’’رات کو وہ گھر پر ہی تھا اور ویرا سے بات ہو جانے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ آج میں نے اسے سلیم اکبر خان کے انجام سے مطلع کرنے کے لیے فون کیا تو کوئی جواب نہیں ملا۔‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا ’’صبح گیارہ بجے تک جب فون پر اس سے رابطہ نہ ہو سکا تو میں خود وہاں پہنچ گیا۔ تمہارے فلیٹ کا دروازہ بند لیکن غیر مقفل تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ گھر میں سارا سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ الماریوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے عجلت میں پورے فلیٹ کی تلاشی لی ہو۔ سلطان کا پورے گھر میں کہیں پتا نہیں تھا۔‘‘

’’پڑوسی کیا کہتے ہیں؟‘‘ میں اضطراری لہجے میں اس سے وہ سوال کر بیٹھا۔

’’سب لاعلم تھے۔ کسی نے کوئی غیر معمولی آواز یا آہٹ نہیں سنی۔ چوکیدار سے پتا چلا ہے کہ صبح چار بجے ایک نئی لینڈ روور میں خاکی وردی والے دو مقامی اور دو گورے وہاں آئے تھے۔ ایک مقامی نے اسے بتایا کہ وہ اینٹی نارکوٹکس فورس کے بڑے افسر ہیں اور ہیروئن کے ایک بین الاقوامی اسمگلر کی تلاش میں وہاں آئے ہیں۔ وہ اپنی زبان بند رکھ کر ان سے دور رہے اور اپنے کام سے کام رکھے۔ ان پڑھ چوکیدار وردیوں اور گاڑی سے مرعوب ہو گیا اور وہ گاڑی سمیت احاطے میں اندر تک چلے گئے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کس فلیٹ میں گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ لینڈ روور تیز رفتاری سے پھاٹک سے نکلتی چلی گئی۔ چوکیدار اس ناگہانی افتاد پر اتنا بدحواس تھا کہ واپسی پر جیپ میں موجود افراد کی تعداد پر دھیان نہیں دے سکا۔‘‘

’’اور اینٹی نارکوٹکس والے کیا کہتے ہیں؟‘‘ میں نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

’’نیچے سے اوپر تک سب اس واقعے سے لاعلم ہیں۔ ان کی طرف سے صبح سویرے تو کیا، پچھلے تین دن سے ایسا کوئی آپریشن نہیں کیا گیا۔ ویسے بھی وہ اپنے پاس آئے ہوئے غیر ملکی ماہرین کو کسی فیلڈ آپریشن میں شامل نہیں کرتے۔ چھاپوں اور گرفتاریوں کے فرائض مقامی عملہ سرانجام دیتا ہے۔‘‘

’’ان کا نام استعمال کر کے یہ شبِ خون مارا گیا ہے۔ سلطان شاہ اتنی خاموشی اور آسانی سے ان کے ساتھ

جانے والا نہیں تھا۔ وہ یقیناً اسے بے ہوش یا زخمی کر کے وہاں سے نکال لے گئے ہوں گے۔‘‘

’’میں بھی ان ہی خطوط پر کام کر رہا ہوں۔ ایک مشکل یہ ہے کہ چوکیدار اس لینڈ روور کا نمبر نہیں دیکھ سکا۔ صبح چار بجے فضا میں اتنا اندھیرا تھا کہ گاڑی کے رنگ کے بارے میں بھی وہ پر یقین نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ سلطان شاہ کو برآمد کرنے کے لیے کہاں دھاوا بولا جائے۔‘‘

’’اس معاملے میں نک موڈلے ہی ملوث معلوم ہوتا ہے اور یہ سلطان شاہ کے لیے سب سے مہلک بات ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بدری ناتھ کی طرف سے علی شیر کے نمائندے کے طور پر کئی بار نک سے مل چکا ہے۔‘‘ ایک سنگین خطرہ سامنے آ جانے کے بعد میں نے ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کر فون پر کھلی گفتگو شروع کر دی۔

’’میں چیک کر چکا ہوں۔ نک کل صبح ہی کسی سرکاری کام سے سنگاپور گیا ہے۔ یہ کوئی اور ہی لمبا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سلیم اکبر خان کی گرفتاری پر کچھ لوگوں نے منہ اندھیرے یہ جوابی کارروائی کی ہو۔ اس کے پکڑے جانے سے ان کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے ہوں گے۔‘‘

میرے لیے وہ بدترین اور تکلیف دہ صورت حال تھی۔ میرا ذہن صدمے اور مایوسی سے دوچار ہونے کے باوجود تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اول خان کی بات کا جواب دینے کے لیے مزید سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی ’’نک ملک سے باہر ہے۔ اسے میرے یا سلطان شاہ کے بارے میں ذرا بھی بھنک مل جاتی تو وہ نک سے پہلی ملاقات کے بعد زندہ نہیں لوٹ سکتا تھا۔ نہ ہی بدری کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکتا تھا۔ اس بارے میں میرا شبہ بہت کمزور ہے۔ دوسری طرف سلیم مدن موہن اور اس کے نیچرل انفارمیشن سیل کا آلہ کار تھا۔ مدن تمہاری تحویل میں ہے۔ سلیم کے پکڑے جانے سے سب سے زیادہ دکھ مدن کے ساتھیوں کو ہو سکتا تھا مگر لینڈ روور میں آنے والوں میں دو سفید فام شامل تھے۔ ان کے لیے سفید فاموں کو اس قدر کھل کر میدان میں اتارنے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘

’’کیا یہ ممکن نہیں کہ سفید فاموں کو لے کر آنے والے باوردی افراد بھارتی ایجنٹ یا ان کے مقامی مددگار رہے ہوں۔‘‘ اول خان اپنے طور پر اس واقعے کو ہر پہلو سے پرکھ رہا تھا۔

’’سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی کم مدت میں انہیں سلطان شاہ کے ٹھکانے کا علم کیسے ہوا۔ اگر وہ پہلے سے باخبر تھے تو ان کی طرف سے آج تک کوئی کارروائی کیوں نہیں کی گئی۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ اول خان نے کمزور لہجے میں اعتراف کیا ’’اگر سوچنے کی یہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو پھر سلطان شاہ کے اغوا کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے؟‘‘

’’اب تک تم نے ایک نتیجہ بہت ٹھیک اخذ کیا ہے۔ اگر آنے والوں کو سلطان شاہ سے دشمنی ہوتی تو وہ اسے فلیٹ میں ہی مار دیتے۔ لاد کر اپنے ساتھ نہ لے جاتے۔‘‘

’’تو... کیا یہ نکتہ کسی خاص سمت کی نشان دہی کر رہا ہے؟‘‘ اول خان نے پوچھا۔

’’میرا یہی خیال ہے۔ بدری کہہ چکا ہے کہ کراچی میں میری روپوشی کی خبریں گردش کر رہی ہیں۔ میرے دشمنوں میں اس وقت صرف آئزک بیل کو معلوم ہے کہ میں اس فلیٹ میں رہ رہا ہوں۔‘‘

میرے جواب نے اول خان کو بری طرح چونکا دیا ’’یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟‘‘

’’پرانی بات ہے۔ تم بھول رہے ہو کہ وہ امریکا سے دو بار اسی فلیٹ کے فون پر مجھ سے رابطہ کر چکا تھا۔ بعد میں اس نمبر پر آبزرویشن وغیرہ کے خوف سے اس نے یہ سلسلہ بند کر دیا تھا۔‘‘

’’تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ اول خان کی آواز یک بیک پر جوش ہو گئی ’’مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے یوم السبت پر کوٹ ادو کے تھرمل پاور پلانٹ میں تباہی کی پیش گوئی نما دھمکی دی تھی۔‘‘

’’فون نمبر اسے راس المیڈا سے مل چکا تھا۔ اب وہ میرے لہو کا پیاسا ہے۔ اتنے دنوں تک وہ یقیناً خاموش نہیں بیٹھا رہا۔ اس کے آدمی یہاں آئے اور انہوں نے فون نمبر کے سہارے فلیٹ کا کھوج لگا لیا۔‘‘

''تم واقعات کا صحیح تجزیہ کرکے بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا آئزک اب کسی پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تمہیں گھیرنے کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔''

''اس وقت یہی معلوم ہو رہا ہے۔ چار کی وہ ٹولی میری تلاش میں وہاں پہنچی۔ جب میں نہ ملا تو وہ سلطان شاہ کو اٹھا لے گئے۔ اب تک انہوں نے اس کا بھرکس نکال دیا ہوگا۔''

''میں اسے اچھی طرح پرکھ چکا ہوں۔ وہ مر جائے گا مگر تمہارے بارے میں اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالے گا۔ انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ مٹانے کے لیے ایک غلط آدمی پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''ایسی بدفال منہ سے نہ نکالو۔'' میں نے تڑپ کر کہا ''مریں اس کے دشمن۔ یہ سوچو کہ اب تم کیسے اس تک پہنچ سکتے ہو۔''

''شاید راس المیڈا کا انجام دیکھ کر وہ اپنے سفارت کاروں سے بدظن ہو چکا ہے۔ وہ سرخ فیتے سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان سے دور رہ کر کام کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو کراچی کی زیر زمین دنیا کے چند بڑے ناموں سے کوئی نہ کوئی سراغ مل سکتا ہے۔''

''جلدی کرو۔ یہ کام جتنی جلد ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' میں نے بے قراری سے کہا۔

''یہ سوچ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں کہ اگر غزالہ بھی میرے گھر کے بجائے سلطان شاہ کے ساتھ ہوتی تو کیا ہوتا۔ ایسی خون آشام دشمنیوں میں عورت ذات سب سے سہل نشانہ ہوتی ہے۔''

میرے وجود میں قہر و غضب کی ایک لہر نے انگڑائی لی اور میں نے دانت پیستے ہوئے کہا ''میں ان کے سر کچل دوں گا۔ ضرورت پیش آئی تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی بھی وقت واپس چل دوں گا۔ میرے لیے غزالہ اور سلطان شاہ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔''

''روزی بھی تمہاری بے لوث جان نثار ہے۔ اس کی قدر کیا کرو۔ تمہاری بات سن کر اسے دکھ ہوا ہوگا۔''... اول خان نے جھجکتے ہوئے مجھے یاد دلانا چاہا۔

''وہی نہیں، تم بھی میری فہرست میں شامل ہو مگر وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔''

''وہ کہاں گئی ہوئی ہے؟'' اول خان پرتجسس لہجے میں سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ویرا کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ سلطان شاہ کے اغوا کی خبر سنتے ہی میں اسے بھول چکا تھا حالانکہ اس وقت وہ دونوں ہی خطرات سے دوچار تھے۔ سلطان شاہ میرے بدترین حریفوں کا قیدی تھا اور ویرا محض اپنے بل بوتے پر ایک خون آشام درندے کی سرکوبی کرنے کے لیے نکلی ہوئی تھی۔

''آج روزی گدھے کے ساتھ لگی ہوئی پخ کو ہمیشہ کے لیے الگ کرنے گئی ہے۔''

''وہ اکیلی گئی ہے؟'' میرے جواب نے اول خان کو ششدر کر دیا۔

''وہاں ایک سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ بہتر اور محفوظ انداز میں کام پورا کر سکے گی۔ تم سے بات ہونے تک میں اسی کے بارے میں فکرمند تھا۔''

''تم سر نیچا کرکے خاموشی سے بڑے سے بڑا کام کر گزرتے ہو اور اس پر ذرا بھی غرور نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت اپنی صلاحیتوں پر گھمنڈ کرتی رہتی ہے۔ وہ بہت بے جگر اور ذہین لڑکی ہے مگر پھر بھی لڑکی ہی ہے۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی تمہاری گرد کو نہیں پہنچ سکتی۔''

''دونوں طرف طبلِ جنگ بج چکا ہے۔ میں سلطان کے بارے میں سوچتا رہوں گا۔ تم روزی کے لیے فکرمند رہو گے۔ ہمارا آپس کا قریبی رابطہ برقرار رہنا ضروری ہو گیا ہے۔''

''فکر مت کرو۔ میں ہر ایک گھنٹے کے بعد تمہیں رپورٹ دیتا رہوں گا۔''

''ہوٹل میں اتنی کثرت سے غیر ملکی کالوں کی آمد یہاں کے عملے کو شبہات میں ڈال دے گی۔ میں باہر کے کسی بوتھ سے تم سے بات کرتا رہوں گا۔''

''اپنے ان مسائل کو تم مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

اس وقت گھر ہی سے بول رہے ہوتا؟'' مجھے اچانک وہ اہم سوال یاد آ گیا۔

''گھر؟'' میرے کان میں اول خان کی تلخ سی ہنسی ابھری ''سلیم کے چکروں سے صبح دو بجے نجات ملی تھی اور میں دفتر ہی میں لیٹ گیا تھا۔ دس بجے سے سلطان شاہ کی فکر شروع ہو گئی۔ اب میں دفتر میں جما ہوا ہوں۔ سلطان شاہ کا سراغ ملنے تک میں یہیں رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دفتر میں فون کرتا رہوں گا۔ درمیان میں کوئی اچھی خبر مل جائے تو تم مختصر سی کال کر لینا۔ میں صرف تمہیں فون کرنے کے لیے ہوٹل سے نکلوں گا ورنہ مجھے بھی کمرے میں جم کر مسز روزی برڈ کی واپسی کا انتظار کرنا ہے۔''

اول خان نے سب کے لیے عافیت کی ایک دل گیر دعا کے ساتھ فون بند کر دیا۔

کراچی سے نکل کر میں دبئی کے راستے لندن پہنچا تو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بھاگتی دوڑتی اور ہنگامہ خیز زندگی یک لخت ٹھہر سی گئی ہو۔ سلیم اکبر دوران سفر دریافت ہونے والا ایک غیر متوقع اور آسان شکار تھا جو کسی قابلِ ذکر جدوجہد کے بغیر، ہنستے کھیلتے میرے دام میں آ گیا ہے۔ اس کے علاوہ گیتا اور جیمز کا قضیہ بھی چند گھنٹوں میں نمٹ گیا۔

کسی تخریبی ارادے کے بغیر، محض وقت گزاری کے لیے کی جانے والی چھیڑ چھاڑ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں کے عبرت اثر انجام پر منتج ہوئی تھی۔ اپنی اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ دونوں ہی واقعات بہت سنگین تھے لیکن ان میں ہمارا زیادہ وقت صرف نہیں ہوا تھا۔

پچھلے چند دنوں میں ہم نے اپنا بیشتر وقت لندن کی سیر میں صرف کیا تھا اور عملاً ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم کام کرنے کی بجائے محض پکنک منانے کے لیے لندن آئے ہوں۔

پچھلی رات سے واقعات نے اچانک ہی نیا رخ بدلا تھا۔ پہلے ویرا نے مجھے رمیش اگروال کے قصے سے بے دخل کیا اور خود ایک مشکل صورت حال کا سامنا کرنے چل دی۔ دوسری طرف سلطان شاہ بے خبری میں کیے جانے والے ایک وار کا نشانہ بن چکا تھا۔ پہلے ہر محاذ پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور اب ہر طرف خبریں ہی خبریں تھیں۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آئزک بیل سے ہمارا تصادم کہاں ہونے والا تھا۔

اگر وہ نیویارک میں بیٹھ کر اپنی کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں ہلا رہا تھا تو ہمارا بدری ناتھ کے پیچھے پیچھے یا اس کے بغیر وہاں جانا ضروری ہو گیا تھا اور وہ خود کراچی میں موجود تھا تو ہمیں پہلی فرصت میں وہاں پہنچ کر اس کے گرد جال ڈالنا تھا۔

میں نے اضطراری طور پر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اول خان نے کافی دیر تک فون پر بات کی تھی مگر اس دوران میں وقت بمشکل پندرہ منٹ آگے سرکا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔

وہ وقت بہت نازک تھا۔ میری چشم تصور میں ایک فلم سی چلنے لگی۔

اگر سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا تو بدری ناتھ نے رمیش اگروال کو کوئی چکر دے کر گھر میں اکیلا چھوڑ دیا تھا اور خود انڈین ہائی کمیشن میں سرگرمی سے ایک ایک سے مل کر اسے اپنی موجودگی کا گواہ بنا رہا تھا۔ اندر سے وہ بہت مسرور تھا کیونکہ آنے والے چند گھنٹوں میں اسے اپنے اس بدترین حریف سے نجات ملنے والی تھی جو دوست بن کر اس کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوسری طرف رمیش اگروال ہیری نواسن کے خالی گھر کے کسی کمرے میں بیٹھا بدری ناتھ کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے خود کو ٹیلی وژن کی اسکرین یا اخباری صفحات میں الجھایا ہوا تھا۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ باہر موت اس کی گھات لگائے پھر رہی تھی اور فرشتہ اجل کسی بھی لمحے ویرا کے سحر انگیز روپ میں اس کے سر پر مسلط ہونے والا تھا۔

ساؤتھ آل کے علاقے میں ترتیب پانے والے اس ڈرامے میں تیسرا اہم ترین کردار ویرا کا تھا۔ وہ شاید اپنے ہدف کے قرب و جوار میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے لیے کام کا

وقت بارہ اور ڈیڑھ بجے کے درمیان مقرر کیا جا چکا تھا۔ وہ بارہ بجے سے پہلے اپنی شکار گاہ میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بارہ بجنے کے انتظار میں سخت بے چینی اور اضطراب کے عالم میں وہیں کہیں چکراتی پھر رہی ہوگی۔

میرے لیے وہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ وقت جونک کی چال سے رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ بارہ بجے اور میرے اعصاب پر تناؤ سا سوار ہو گیا۔ شاید ویرا فیصلہ کن قدم اٹھانے کی پوزیشن میں آچکی تھی۔

میرے ذہن پر دباؤ بڑھتا رہا۔ بارہ بج کر دس منٹ پر اس دباؤ سے میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ میں اس وقت میدان عمل سے بالکل باہر تھا مگر وہاں کی صورت حال جاننے کی خواہش میرے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ میں تذبذب کے عالم میں چند ثانیوں تک فون کو گھورتا رہا پھر بے اختیار ریسیور اٹھالیا۔

میں نے ایک لمحہ بھر غور کیا۔ میری وہ حرکت ہر خطرے سے خالی نہیں تھی۔ سری نواسن کے گھر میں رمیش اگروال شکار تھا اور ویرا شکاری۔ شکار کی کوئی بھی غفلت اس کے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ میں وہاں کا نمبر ملاتا تو لازمی طور پر رمیش ہی فون کی طرف متوجہ ہوتا۔ اس کے لب و لہجے سے مجھے وہاں کے بارے میں خاصا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اگر جواب نہ ملتا تو پھر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ویرا بجلی کی سی پھرتی سے اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے نکل چکی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں واپس پہنچنے والی تھی۔

میں نے لائن کا کوڈ ملا کر سری نواسن کے گھر کا فون ملانا شروع کر دیا۔

لندن میں فون کا نظام کچھ ایسا ہے کہ پاکستان کی طرح وقفے وقفے سے گھنٹی نہیں بجتی۔ لائن ملتی ہے تو دہری بیپ بیپ کی صورت میں گھنٹی بجتی چلی جاتی ہے۔ دوسری طرف گھنٹیوں کی آواز شروع ہوتے ہی میرا دورانِ خون تیز ہو گیا۔

بدری ناتھ مجھے بتا چکا تھا کہ سری نواسن نے ان دونوں کو اپنے گھر کا ایک ایسا کمرا دیا ہوا تھا جہاں ضرورت کی تمام چیزیں میسر تھیں لیکن فون اور ٹیلی وژن کی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ شاید رمیش اگروال ویرا کو ایک آسان شکار سمجھ کر اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو فون تک پہنچنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ ویرا اس عفریت کو اتنی سرعت سے زیر نہیں کر سکتی تھی۔

متعدد گھنٹیوں کے بعد آخر کار ریسیور اٹھالیا گیا۔ ہیلو کہنے والا رمیش ہی تھا۔

''کیا بات ہے؟ ہر وقت تم ہی فون سے لگے بیٹھے رہتے ہو۔'' میں نے کسی تمہید کے بغیر اسے چڑانے کے لیے کہا۔ اس سے قدرے طویل گفتگو کر کے ہی میں وہاں کی پوزیشن کے بارے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔

''اوہ...... تم کو بدری کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے جو دور دور سے اسے بس فون ہی کرتے رہتے ہو۔'' میری بدلی ہوئی آواز سن کر اس بار بھی وہ مجھے گرنام سنگھ سمجھا تھا۔

''وہ خود ڈرپوک ہے۔'' میں نے جواب دیا ''وہ کسی اور کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے اس لیے مجھے وہاں بلانے سے ڈرتا ہے۔ تم اسے آمادہ کر لو تو میں آج شام ہی اس سے ملنے آسکتا ہوں۔''

''اتفاق ہے کہ جب بھی تم فون کرتے ہو وہ گھر پر نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی وہ کہیں گیا ہوا ہے۔'' اپنے فطری تجسس سے مجبور ہو کر وہ خود بھی گفتگو آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ لندن میں بدری ناتھ کا کون سا ایسا دوست ہے جس سے وہ بے خبر ہے۔

''اب میں شام کو سات آٹھ بجے دوبارہ فون کروں گا۔ اس سے کہہ دینا کہ وہ گھر پر ہی رہ کر میرا انتظار کرے۔ مجھے اس سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے بدلی ہوئی بھاری آواز میں کہا۔

اس وقت تک ہم دونوں اردو یا ہندی میں باتیں کر رہے تھے۔ اچانک اس نے مجھے ہولڈ کرنے کے لیے کہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر انگریزی میں کسی سے مخاطب ہو گیا۔

''ارے ڈارلنگ! تم یہاں کیوں آگئیں۔ وہیں میرے کمرے میں بیٹھو۔ میں فون پر گفتگو کر کے ابھی وہیں آتا ہوں۔ اکیلے گھر سے تمہیں خوف زدہ ہونے کی

ضرورت نہیں۔''

سوا بارہ بجنے والے تھے۔ وہ انگریزی میں ڈارلنگ کہہ کر کسی عورت ہی کو مخاطب کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً ویرا ہی تھی اور پروگرام کے مطابق رمیش تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

رمیش کو ملنے والا ویرا کا جواب میں نہیں سن سکا مگر پھر رمیش کی آواز آئی ''ٹھیک ہے۔ تم اس مشرقی گھر کا جائزہ لیتی رہو۔ میں بس ابھی فارغ ہوتا ہوں۔''

انگریزی میں وہ فقرے مکمل کر کے رمیش دوبارہ مجھ سے مخاطب ہو گیا ''بدری سے تمہارے ایسے کیا راز و نیاز ہوتے ہیں کہ تم اس بارے میں مجھے نہیں بتا رہے۔''

''بدری چاہتا تو وہ خود بھی کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی غیر موجودگی میں تم سے بات کر لوں۔ اس بارے میں ضد مت کرو اور یہ بتاؤ کہ ابھی تم کسی ڈارلنگ سے بات کر رہے تھے؟''

''یہ ولایت ہے۔ یہاں لڑکیوں کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے۔ مقدر اچھا ہو تو لڑکیاں خود ہی ٹکرائی رہتی ہیں۔ یہ کوئی......''

اچانک اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ریسیور پر اس کی ایک شدید ہچکی کی آواز سنائی دی، ریسیور کہیں گرا اور پھر فرش پر کسی وزنی وجود کے گرنے کی تیز دھمک سنائی دی۔

میں نے ماؤتھ پیس میں بار بار ہیلو ہیلو کی تکرار کی مگر ریسیور پر گہرا سکوت چھایا رہا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بات کرتے کرتے اچانک رمیش اگروال کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

فون پر کسی واردات کی جزئیات سننے کا وہ تجربہ بہت انوکھا اور سنسنی خیز تھا۔ میں سانس روکے ریسیور پر کوئی آواز سننے کا منتظر رہا لیکن دوسری طرف گہرا سکوت چھایا رہا پھر کریڈل دبنے کی کلک کی آواز سنائی دی۔ کسی نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔

میں نے اپنے سینے میں رکا ہوا سانس آزاد کر کے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

کمرے کی فضا خنک تھی مگر مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کے قطروں کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پیشانی پر شہادت کی انگلی پھیری اور پسینے کی ایک ہلکی سی، داہنے رخسار کے بڑھے ہوئے شیو میں رینگتی ہوئی قالین پر گر گئی۔

عملی طور پر میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن فون کے ریسیور پر میں نے جو کچھ سنا وہ بہت لرزہ خیز تھا۔ مجھے یک بیک نقاہت کا احساس ہونے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں نے شدید جسمانی مشقت کے کئی مرحلے طے کیے ہوں۔ میں بستر پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

میں نے فون پر جو کچھ سنا وہ ناقابل یقین تھا۔ رمیش اگروال کی آخری بھیانک ہچکی میرے ذہن میں جم کر رہ گئی تھی۔ شاید اسے بالکل آخری لمحے پر خطرے کا ادراک ہوا تھا اور اس نے چیخنا چاہا تھا مگر اس کی وہ حیوانی چنگھاڑ بس ایک ہچکی میں گھٹ کر رہ گئی۔

میں دیر تک یوں ہی پڑا رہا۔ میرا ارادہ ایک بجے کے قریب باہر جا کر اول خان سے فون پر رابطہ کرنے کا تھا اور ایک بجنے میں خاصی دیر باقی تھی۔

ایک بجے سے پہلے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے بے تابی سے دروازہ کھول دیا۔

ویرا اپنے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ سجائے میرے سامنے موجود تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بائیں آنکھ دبائی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

رمیش اگروال سے فون پر بات کرتے ہوئے میں نے وہاں کی صورتِ حال کے بارے میں صرف اندازے قائم کیے تھے۔ میں ویرا کے سامنے ان قیاسات کا قبل از وقت اظہار کر کے کسی شرمندگی سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم بہت جلد واپس آ گئیں؟''

''وہ بہت کٹھن کام تھا لیکن حیرت ناک طور پر آسان ہو گیا۔'' وہ فخریہ انداز میں بولی ''ریوالور کے چیمبر میں ساری گولیاں محفوظ ہیں اور رمیش اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔''

''میں خلاصہ نہیں، پوری تفصیل سننی چاہتا ہوں۔'' میں نے کرسی پر جھولتے ہوئے مطالبہ کیا۔

''یہاں سے نکلتے ہی میں نے اپنے پروگرام میں

معمولی سی تبدیلی کر لی تھی۔'' وہ بتانے لگی ''میرے پاس بیمہ فروشی کے بارے میں کوئی مواد نہیں تھا اس لیے میں نے آکسفورڈ اسٹریٹ کی ایک بک شاپ سے انسانی صحت اور اس کی غذائی ضروریات کے بارے میں آٹھ دس کتابیں خرید ڈالیں اور دو بسیں تبدیل کر کے مقررہ وقت سے پہلے ساؤتھ آل میں پہنچ گئی۔''

''ٹھیک بارہ بجے میں نے سری نواس کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو رمیش نے دروازہ کھولا۔ پہلی ہی نظر میں وہ رنگین مزاج اور اوباش فطرت نظر آتا ہے۔ پہلے وہ مجھے اپنے میزبانوں کا کوئی مہمان سمجھ کر اخلاق سے پیش آیا مگر جب میں نے اسے بتایا کہ میں صحت عامہ سے متعلق کتابوں کی گشتی سیلز گرل ہوں تو اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک عود کر آئی اور اس نے مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا۔''

میں نے پہلو بدل کر کرسی چھوڑ دی۔ یکا یک ہی مجھے اپنے کانوں کی لوئیں تپتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ ویرا کی اس تمہید کا رخ خاصا اشتعال انگیز تھا۔

''وہ بہت غیر مہذب بلکہ وحشی تھا۔ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں میرے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گیا۔'' ویرا میرے دلی جذبات سے بے خبری کے عالم میں کہے جا رہی تھی ''میں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی کتابیں کھول کر اسے باتوں میں الجھانا چاہا تو اس نے وہ پلندہ سمیٹ کر ایک طرف ڈال دیا اور بے حیائی سے کہا کہ وہ دیکھے بغیر ساری کتابیں خرید چکا ہے اور مجھے اس سے کچھ اور باتیں کرنی چاہئیں۔ میرے حسن کی تعریف کرتے ہوئے اس نے افسوس ظاہر کیا کہ میں ذرا سی آمدنی کے لیے سارا دن گھر گھر ماری پھرتی رہوں۔ وہ اتنی تیزی سے پیش قدمی کر رہا تھا کہ مجھے اس کی طرف سے دست درازی کا خطرہ نظر آنے لگا۔ وہ مجھ سے اتنا قریب تھا کہ میں اپنے بیگ میں سے ریوالور بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ کمرا چھوٹا اور فرنیچر سے اس طرح بھرا ہوا تھا کہ میں اچانک دوڑ کر بھی اس کی دسترس سے نہیں نکل سکتی تھی......''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ان باتوں کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ انہیں دہرا کر بلاوجہ میرا خون نہ کھولاؤ۔''

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ اس کی توہین کا تذکرہ سننا میرے بس سے باہر ہو رہا تھا۔

''وہ میرے سر پر اس بری طرح سوار تھا کہ میں فکر مند ہو گئی۔ میں جوابی گرم جوشی کا اظہار کر کے بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتی تھی مگر میری دانست میں رمیش کے خون کی وہ قیمت بہت زیادہ ہو جاتی۔ میں تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میرے لیے وہ تائید غیبی تھی۔ چند ثانیوں تک اس نے گھنٹی پر دھیان نہیں دیا مگر قدرت مجھ پر مہربان ہو چکی تھی۔ فون کرنے والا بھی ڈھٹائی سے انتظار کرتا رہا اور آخر وہ جھنجلا کر اٹھنے پر مجبور ہو گیا۔''

''اور جب وہ فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھا تو تم ٹہلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئیں۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی تو اگلی بات میں نے پوری کر دی۔

وہ میرا اشارہ نہیں سمجھ سکی اور بولی ''وہ میرا پہلا اور آخری موقع تھا۔ میں اسے برباد نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے واپس بھیجنا چاہا مگر میں نے اس مشرقی گھر کی سجاوٹ کی تعریف کی تو اس نے میری موجودگی میں بات جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اردو یا ہندی نہیں جانتی۔ وہ فون کرنے والے کو میرے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا تو میں پنجوں کے بل تقریباً دوڑ کر اس کی پشت پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر بائیں طرف سے کھڑی ہتھیلی کی ایک نپی تلی اور مہلک ضرب لگائی اور وہ خاموشی سے گر کر تڑپے بغیر ختم ہو گیا۔''

''یہاں تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔ وہ خاموشی سے نہیں مرا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے روح کو لرزا دینے والی ایک بھیانک ہچکی لی تھی۔ اسے مار گرانے کے بعد تم نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔'' اس کی بات پوری ہو جانے پر میں نے اس واردات میں اپنی شمولیت کا راز فاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم کیا جانو؟'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

میرے فقروں نے اسے حیران کر دیا تھا۔

''رمیش کو وہ فون میں نے ہی کیا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اگلا دھماکا کیا۔

''نہیں۔'' وہ حیرت اور بے اعتباری سے بول پڑی ''تمہیں کیا پتا کہ اس وقت مجھے ایسی ہی کسی مداخلت کی ضرورت تھی جس کے نتیجے میں مجھے ذرا سی مہلت مل سکے۔''

''اسے دل کو دل سے راہ ہونا کہتے ہیں۔ میں یہاں بے کار بیٹھا فکر اور تشویش سے مرا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ فون پر ہی تم دونوں کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے اور اب تم بتا رہی ہو کہ میرا فون ہی تمہارے لیے فیصلہ کن غیبی تائید ثابت ہوا۔''

''میں نہیں مان سکتی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے اتفاقات صرف فلموں میں رونما ہوتے ہیں۔''

میں اس سے کہہ سکتا تھا کہ فلموں میں تو فلمی ہیرو اپنی ہیروئن کو بچانے کے لیے ماؤتھ پیس کے سوراخ میں گھس کر تاروں پر سفر کرتا ہوا کسی دور افتادہ ریسیور سے بھی برآمد ہو سکتا ہے مگر اس وقت سلطان شاہ کے اغوا کے صدمے سے میرا دل غمگین تھا۔ ویرا کے لوٹ آنے کے بعد میرا ذہن پھر اسی کی طرف بھٹک گیا تھا اور میں ویرا کے سنبھلنے کے بعد اسے بھی وہ بری خبر سنانی چاہتا تھا۔

''تمہیں یقین دلانے کے لیے میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس نے تمہیں ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کیا تھا اور تمہیں اکیلے گھر سے خوف زدہ نہ ہونے کا مشورہ دیا تھا۔''

''یہ ناقابلِ یقین واقعہ ہے۔ اتنی دور رہ کر بھی تمہاری چھٹی حس میری ضرورتوں سے باخبر تھی۔ میں اپنی اس خوش قسمتی پر جتنا بھی ناز کروں وہ کم ہے۔''

میری بات کا اعتبار آتے ہی اس کا چہرہ اندرونی مسرت سے کسی انار کی طرح دمکنے لگا۔

''میں اس وقت ایک کرب میں مبتلا تھا۔ تمہارے ساتھ سلطان شاہ بھی خطرے میں پڑ چکا تھا۔ اول خان سے ملنے والی اس بری خبر نے مجھے وحشت زدہ کر ڈالا تھا۔''

''سلطان شاہ!'' اس نے بوکھلا کر دہرایا ''اسے کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟''

''جعلی وردیوں میں ملبوس دو مقامی اور دو سفید فام آج علی الصبح اسے فلیٹ سے اغوا کر کے لے گئے ہیں اور پورے شہر میں ان لوگوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔''

ویرا نے غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔ ''یہ کیا ہو گیا......؟ میدان خالی ہوتے ہی اس پر ہاتھ ڈالا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ حرام زادے پہلے سے اس کی گھات میں تھے مگر غزالہ بھی تو وہیں تھی۔ وہ کس حال میں ہے؟ کیا بتا رہی ہے؟''

''خوش قسمتی سے وہ اول خان کی بیوی کے ساتھ تھی اس لیے بچ گئی۔ میرے لیے یہ اندوہ ناک خبر ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے تمہیں اس صدمے میں شریک کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔ اس بوجھ سے تڑپ کر مجھے تمہاری فکر ہوئی تھی ورنہ شاید میں رمیش کو فون بھی نہ کرتا۔''

''شاید تمہارے دشمنوں کو بھنک مل گئی ہے کہ اب تم وہاں نہیں ہو۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ تمہیں اسی وقت کراچی چل دینا چاہیے......''

''تم میرے کس دشمن کا ذکر کر رہی ہو؟'' میں نے اس سے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ سلطان شاہ کو لے جانے والے تمہارے خیر خواہ رہے ہوں گے؟''

''ظاہر ہے کہ وہ دوست نہیں ہو سکتے مگر ان کی شناخت کیا ہے؟''

میرے سوال پر وہ متفکر نظر آنے لگی پھر پر تشویش آواز میں بولی ''یوں بات نہیں بنے گی۔ مجھے پورے واقعات بتاؤ۔ ہم سر جوڑ کر کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ ہی جائیں گے۔''

ایک خیال کے تحت میں نے بری طرح چونک کر ویرا کے آس پاس دیکھا پھر سخت لہجے میں اس سے پوچھا ''تمہاری خریدی ہوئی کتابیں کہاں ہیں؟ کیا تم وہ سری نواسن کے یہاں چھوڑ آئی ہو؟''

''میں بھول کر بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ ان میں سے ہر کتاب پر بک شاپ کی مہر موجود تھی جو قاتل کا سراغ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں کتابوں کے ساتھ تھیلی تک وہاں سے اٹھا لائی تھی۔''

''مگر تم یہاں تو خالی ہاتھ آئی ہو۔'' میں نے اشتباہ آمیز لہجے میں کہا۔

''بے کار بوجھ لادنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ واپسی پر وہ بنڈل میں نے کوڑے دان میں پھینک دیا تھا۔ یہاں تمہارے شہروں کی طرح کچرا گھروں پر کوڑا چننے والوں کا راج نہیں ہوتا۔ بند کوڑے دان کو ٹرک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ آخر تک کتابوں کا پتا نہیں چل سکے گا۔ ردی میں مل کر وہ بھی ردی ہو جائیں گے۔''

ویرا کی اس وضاحت نے مجھے مطمئن کر دیا اور میں نے اول خان سے ملنے والی معلومات کو اختصار اور اپنے تبصروں کے ساتھ اس کے سامنے دہرانا شروع کر دیا۔

''تم صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔'' تفصیلات سننے کے بعد اس نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ''یہ نک موڈلے یا مدن موہن کے ساتھیوں کا کام نہیں ہو سکتا۔ مدن موہن کی روپوشی کے بعد ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور وہ بکھر کر رہ گئے ہیں۔ نک اتنا ہی باخبر ہوتا تو بہت پہلے یہ کارروائی کر گزرا ہوتا۔ اس وقت وہ ویسے بھی سنگاپور گیا ہوا ہے۔ اس وقت کوئی اور ہی قوت میدان میں اتری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔''

''وہ تیسری قوت ڈیوڈ اسٹارز کی ہی ہو سکتی ہے۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''رمیش راستے سے ہٹ چکا ہے۔ کیا بدری ہمارے لیے ایک کام کر سکے گا؟'' قدرے توقف کے بعد ویرا نے تفکر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''وہ ہر کام کرے گا لیکن فوری طور پر نہیں۔ رمیش کے قتل کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ ہر طرف گند اچھلے گا۔ جب تک وہ گرد نہ دب جائے، بدری محتاط رہے گا۔''

''بظاہر وہ ہمارے مخالفوں کا آدمی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ہمیں صرف ایک نمبر فراہم کر دے۔''

''کس کا؟ ہو سکتا ہے کہ دور رہ کر وہ ایسے چھوٹے موٹے کام کر گزرے۔ رمیش کے قتل کے بعد بدری کے بڑے جب تک اس کے نئے مقام کا تعین نہیں کرتے، وہ زیادہ ہاتھ پیر پھیلانے سے گریز کرے گا۔ موجودہ حالات میں یہی حکمتِ عملی اس کے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔''

''ہمیں آئزک بیل کا فون نمبر مل جائے تو پیش رفت تیز ہو سکتی ہے۔'' ویرا نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسا اس نے میری بات پر دھیان ہی نہ دیا ہو۔

''آئزک بیل اب راس المیڈا کا جانشین ہے۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہو گا۔''

''ڈیوڈ اسٹارز تیسرے درجے کے چور اچکوں کا گروہ نہیں ہے جس کے ارکان دن میں چار بار ٹھکانے بدلتے ہوں۔ وہ معزز اور مال دار یہودیوں کی تنظیم ہے۔ وہ بالکل مافیا کے انداز میں کام کرتے ہیں اور ان کے بڑے گاڈ فادرز کی طرح جم کر اپنی اپنی حدود میں حکمرانی کرتے ہیں۔ آئزک بیل ان کا نمبر ون ہے۔ اس کا ایک نمبر مل جائے تو کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ ہو ہی جائے گا۔''

''فون پر تم اس کو کیا پیغام دینا چاہ رہی ہو؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''اس نے فون پر تمہیں [illegible] تھا۔ تم اسے گالیاں دو گے۔ اگر سلطان شاہ اسی کے [illegible]گوں کی تحویل میں ہے تو وہ پھٹ پڑے گا۔ ایک بار یہ یقین ہو جائے کہ سلطان شاہ کہاں ہے تو یکسوئی کے ساتھ اس کی بازیابی کی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔''

''کوشش کروں گا۔ رمیش کے قتل کے بعد اب بدری پوری طرح ہماری مٹھی میں آ گیا ہے۔ اس کی طرف سے میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا ہے۔''

''آج وہ شام تک اپنے ہائی کمیشن میں رہے گا۔ کل اس سے ضرور بات کر لینا۔''

''اس کا انحصار کل کے حالات پر ہو گا۔ پتا نہیں رمیش کی بے داغ لاش دریافت ہونے کے بعد حالات کس ڈگر پر چلتے ہیں۔ قانون کے محافظ شاید بہک جائیں مگر را والوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا کوئی بہت طاقتور حریف ان کے خلاف میدان میں اترا ہوا ہے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ بدری بھی اسی طرح گردن

توڑنے میں مہارت رکھتا ہے۔''

''ہاں۔ایک بار اس نے میرے سامنے اپنے اس فن کا مظاہرہ کیا تھا۔نک موڈلے کے دو آدمی نادرہ کے مکان کے اطراف میں ان کے اپریٹس کے سگنلز پکڑتے پھر رہے تھے اور خود پکڑ لئے گئے تھے۔ان میں سے ایک بدری کی ہتھیلی کا شکار ہوا تھا۔''

''یہ بہت مہارت کا کام ہے۔اپنی جگہ پر ریڑھ کی ہڈی بہت اہم نہیں ہوتی۔یہ دراصل اندر والے حرام مغز کا حفاظتی خول ہوتی ہے اور یہی حرام مغز دماغ کو جسم سے ملاتا ہے۔مہروں کی ٹوٹ پھوٹ سے انسان معذور ہو کر بھی زندہ رہتا ہے۔حرام مغز ٹوٹ جائے تو ایک پل بھی زندہ رہنا محال ہے۔''

''بدری بھی کچھ اسی قسم کی باتیں بتا رہا تھا۔شاید یہ سبق مارشل آرٹس کی تربیت کا حصہ ہوتے ہوں گے۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''وار کرتے ہوئے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ کس عضو کا کیا فعل ہے اور اس کی ٹوٹ پھوٹ سے حریف کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔گردن پر جچے تلے وار کا نتیجہ صرف موت ہوتا ہے۔بدری سوچ بھی نہیں سکے گا کہ یہ کارنامہ تمہارے بجائے میں نے سرانجام دیا ہے۔''

تھوڑی دیر تک کمرے میں وقت گزارنے کے بعد ہم دونوں ہی ہوٹل سے نکل کھڑے ہوئے۔ارادہ یہ تھا کہ اول خان سے بات کرنے کے ساتھ ہی کہیں سے شکم پری بھی کرلی جائے گی۔

لندن کے سخت موسم کی وجہ سے وہاں کے بیشتر فون بوتھ بند اور خاصے کشادہ ہوتے ہیں جن کے اوپری حصے میں نصب شیشے کے ذریعے بوتھ کے خالی یا زیر استعمال ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔بعض نوعمر جوڑے بلاوجہ ریسیور ہاتھ میں لے کر ان پناہ گاہوں کو اپنی خرمستیوں کے لیے استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔

محض اسی غلط ریت کی وجہ سے میں اول خان سے اکیلے میں بات کرنی چاہ رہا تھا مگر ویرا میرے ساتھ زبردستی بوتھ میں گھس آئی۔معاملہ سلطان شاہ کے اغوا کا تھا اور وہ خود بھی اول خان سے براہ راست بہت کچھ پوچھنے کے لیے بے چین تھی۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد گھنٹی کے لیے ہمیں خاصی دیر تک انتظار کرنا پڑا اور پھر پہلی گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا گیا۔اول خان نے ریسیور اٹھاتے ہی سمجھ لیا کہ وہ کس کی کال ہو سکتی تھی۔

میری آواز سننے کے بعد وہ بتانے لگا ''خفیہ رابطوں کی سرتوڑ کوششیں جاری ہیں مگر ابھی تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی...... یہ بتاؤ کہ روزی کے مشن کا کیا رہا؟''

اس کی آواز سے مایوسی سی مترشح تھی۔ناکامی کا پیغام ملتے ہی میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔میں نے کہا ''اسی سے بات کرلو۔وہ میرے ساتھ موجود ہے۔''

میں نے ریسیور ویرا کو تھمایا اور بوتھ سے باہر نکل آیا اور اسی کے سہارے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت بھی شہر کا مطلع ابر آلود تھا۔پھوار وغیرہ نہیں پڑھ رہی تھی مگر سرد ہواؤں میں کچھ تیزی آئی ہوئی تھی۔میں نے ہتھیلیاں آپس میں رگڑنے کے بعد ایک سگریٹ سلگا لی۔

ہر محاذ پر کھیل شروع ہونے کے بعد اس شہر نگاراں کی ہر کشش میرے لیے بے کیف ہو چکی تھی۔ذہن پر صرف سلطان شاہ کی فکر حاوی تھی۔

میں گردوپیش کے ماحول سے لاتعلق رہ کر ویرا کے نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔وہ کارڈ کے سارے یونٹ ختم کر کے باہر آئی تو اس کے چہرے پر بھی اداسی کا راج تھا۔

فش اینڈ چپس نامی ایک دکان کا سائن بورڈ دیکھ کر میرے قدم اسی طرف ہو لیے۔پچھلے کئی دن سے فاسٹ فوڈ پر گزارہ کرتے کرتے طبیعت اکتا گئی تھی۔مچھلی اور آلو کے تلے ہوئے قتلے بھی فاسٹ فوڈ ہی کی ایک پرانی قسم میں شمار کیے جاتے تھے لیکن غذائیت اور ذائقے کے اعتبار سے وہ بہت بہتر ثابت ہو سکتے تھے۔

بیئر کی دو بڑی بوتلوں کے ساتھ ہم نے خوب ڈٹ کر مچھلی کھائی۔یہ حیران کن بات تھی کہ طبیعتوں پر اداسی طاری ہونے کے باوجود ہمارے معدے پوری طرح فعال تھے۔

کھانے کے دوران میں ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے رہے۔ویرا نے اپنی عادت کے برخلاف اپنی اور اول خان کی گفتگو میرے کانوں میں انڈیلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ہوٹل واپس لوٹ آئے۔

☆☆☆

مجھے ٹیلی وژن سے کبھی بھی زیادہ رغبت نہیں رہی لیکن اس دن رات گئے تک میں نے اپنے کمرے کا ٹیلی وژن آن رکھا مگر اس پر پرانے واقعات کی بازگشت کے سوا کوئی نئی ہلچل نظر نہیں آئی۔

بدری کے بیان کے مطابق اسکول سے سری نواسن کے بچوں کی آمد دو بجے شروع ہو جاتی تھی اور اسی وقت رمیش اگروال کی لاش دریافت ہو جانی چاہیے تھی۔

سری نواسن کے بچوں کی عمروں سے لاعلمی کی بنا پر یہ رعایت دی جا سکتی تھی کہ رمیش کے بدن پر زخم یا خون کا کوئی نشان نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے محض بے ہوش ہی سمجھتے رہے ہوں اور اس کی ٹوٹی ہوئی گردن بچوں کی نظروں میں نہ آسکی ہو مگر چھ سات بجے گھر کے بڑوں کی واپسی کے بعد اس خبر کو جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے سفر کرتے ہوئے ٹیلی وژن اسکرین تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔

رات کے گیارہ بجے تک اس بارے میں کوئی خبر نہیں آئی اور بالغوں کے لیے ایک فلم شروع ہو گئی تو میں نے اکتا کر ٹیلی وژن بند کر دیا۔

اس دوران میں ہم دونوں باری باری ہوٹل سے نکل کر کراچی سے پانچ مرتبہ رابطہ کر چکے تھے۔اول خان کسی زخم خوردہ شیر کی طرح اپنے دفتر میں مسلسل موجود تھا اور اپنے آدمیوں کو پورے شہر میں دوڑائے جا رہا تھا مگر کہیں بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے دس بجے اس سے آخری بار بات کی تو اس وقت کراچی میں رات ..... کے دو بجے ہوں گے۔مجھے اول خان پر ترس آنے لگا۔اس کی آواز سے تھکن اور بے خوابی مترشح تھی۔میں نے اسے اپنے گھر جا کر چند گھنٹوں کی نیند لینے کا مشورہ دیا لیکن وہ نہ مانا۔

ناامیدی اور مایوسی کے گھور اندھیروں میں وہ نہ جانے کس امید پر دفتر میں موجود رہنے پر مصر تھا۔وہ میری دسترس سے باہر تھا۔میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر فون بند کرنے پر مجبور ہو گیا اور اضمحلال کے عالم میں ہوٹل میں لوٹ آیا۔

''حیرت ہے کہ رمیش کے بارے میں مکمل سناٹا ہے۔'' ٹیلی وژن بند ہونے کے بعد ویرا نے کہا تھا۔

اس وقت مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنے شبہات پر کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تمہیں یقین ہے کہ تم نے رمیش کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟''

''یہ تم پوچھ رہے ہو؟ کیا تم نے فون پر اس کی آخری آواز میں موت کا کرب محسوس نہیں کیا تھا؟''

''ہو سکتا ہے کہ تمہارا وار اوچھا پڑا ہو۔کسی رگ پر ضرب لگنے کی وجہ سے وہ محض بے ہوش ہوا ہو اور پھر اسے ہوش آگیا ہو اور ہم بلاوجہ اپنی کامیابی پر ناز کر رہے ہیں۔''

''بے ہوش آدمی کے دل کی دھڑکنیں بند ہوتی ہیں، نہ اس کی نبض تھمتی ہے۔میں نے سری نواسن کا گھر چھوڑنے سے پہلے پوری طرح اس کی موت کا یقین کر لیا تھا۔میں اتنی احمق نہیں ہوں کہ اس کی گردن پر محض ایک ہاتھ رسید کر کے خوشی سے بغلیں بجاتی ہوئی لوٹ آتی۔''

''پھر اس کی موت کی خبر کہاں رہ گئی؟ اس پر تو ادھم مچ جانا چاہیے تھا۔''

''میں خود حیران ہوں کہ یہ بلیک آؤٹ کیوں کیا جا رہا ہے؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

''مغرب میں خبروں کی فراہمی میں مسابقت کی دوڑ جاری رہتی ہے۔میڈیا آزاد ہیں۔اچھی اور بری ہر خبر جلد از جلد لوگوں تک پہنچائی جاتی ہے۔یہاں بلیک آؤٹ کا کوئی تصور نہیں ہے۔''

''تو کیا اس کی لاش زمین نے نگل لی؟ میں تو سوچ رہی تھی کہ رمیش کے قتل پر شام تک اخباروں کے ضمیمے شہر بھر میں پھیل جائیں گے مگر یہاں سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔''

''کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔'' میں نے ویرا

کوکوئی جواب دیے بغیر دل ہی دل میں سوچا۔ وہ کوئی ترقی پذیر یا پسماندہ ملک نہیں تھا جہاں مقتدر اہل کاروں کی ایک جنبشِ ابرو پر بڑی سے بڑی خبر کو طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا جاتا تھا۔

نیند کا غلبہ ہونے سے پہلے ویرا نے ایک مرتبہ پھر ٹیلی وژن کھولا، چند منٹ تک پروگرام دیکھتی رہی اور پھر اسی کے ساتھ کمرے کی روشنی بھی گل کر دی۔

ویرا کچھ ہی دیر بعد نیند کی پرسکون وادیوں میں کھوگئی مگر میری آنکھوں میں دور دور تک نیند کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ رات کے خواب آور اندھیرے میں میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات اور وسوسے مجسم ہو رہے تھے اور اسی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں کم و بیش ہو رہی تھیں۔

میں نے وہ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی۔ جب میرا وہ اضطراب بہت بڑھ گیا تو صبح پانچ بجے میں نے آواز بند کر کے ٹیلی وژن کھول دیا۔

اسکرین پر نظر آنے والی تصاویر سے بڑی حد تک موضوع کا اندازہ ہو رہا تھا۔

خبریں شروع ہوئیں تو میں نے اپنی پوری توجہ اسی طرف مبذول کر دی۔ بدلتی ہوئی تصویری رپورٹوں اور خبر نگاروں کے ساتھ وہ سلسلہ جاری رہا لیکن رمیش اگروال کا چہرہ کہیں نظر نہ آسکا۔

میں نے ٹیلی وژن بند کرتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ دن نکلنے کے بعد میں بدری ناتھ سے فون پر رابطہ کر کے صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرا اندازہ تھا صبح نو بجے تک سری نواسن اور اس کے جملہ اہل خانہ گھر سے رخصت ہو چکے ہوں گے۔

سسک سسک کر نو بھی بج گئے۔ ویرا بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے اس کی نیند میں خلل ڈالے بغیر نہایت خاموشی سے سری نواسن کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجی اور پھر بجتی ہی چلی گئی لیکن کوئی جواب نہیں مل سکا۔ کئی منٹ کے انتظار کے بعد میں نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔

شبِ بیداری اور تفکرات کی وجہ سے میری عقل ماؤف ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لندن میں کیا ہو رہا ہے۔

ایک چھ فٹے کڑیل مرد کی سالم لاش خبروں میں کوئی جگہ پائے بغیر ناپید ہو چکی تھی۔ اس راز پر سے پردہ اٹھانے والا بدری ناتھ اپنی کمین گاہ میں نہیں تھا جبکہ اس سے پہلے سری نواسن کے گھر سے میری ہر فون کال کا جواب ملتا رہا تھا اور کوئی نہ ہوتا تو خود رمیش ہی فون اٹھایا کرتا تھا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو روم سروس کی طرف سے فراہم کیا جانے والا اخبار راہداری میں دروازے کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں اخبار لے کر سیدھا باتھ روم میں جا گھسا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈیلی میل کے پہلے صفحے سے آخری صفحہ تک دیکھ ڈالا مگر صبح کے اس موقر اخبار میں بھی رمیش کے قتل کی خبر غائب تھی۔ یہ امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ جو خبر ڈیلی میل کو نہ مل سکی ہو وہ صبح کے کسی دوسرے اخبار میں آ گئی ہو۔ وہاں اخبارات کی بیشتر مقامی اور ملکی خبریں مشترکہ ہوتی تھیں بس خبر نگاری کا انداز اپنا اپنا ہوتا تھا۔ اصل مقابلہ اسکینڈلوں کے میدان میں ہوتا تھا۔ ہر اخبار اپنے قارئین کے لیے روز کوئی نئی، منفرد اور چونکا دینے والی کہانی سامنے لاتا تھا اور اس ضمن میں شاہی خاندان سے وابستہ افراد اور جوڑوں تک کو رگید دیا جاتا تھا۔

مزید صبر اور انتظار میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے بدری ناتھ کا کھوج لگانے کے لیے انڈین ہائی کمیشن کے کیتھی والے نمبر پر قسمت آزمانے کا ارادہ کر لیا اور تیار ہو کر کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔

بدری کے ساتھیوں میں دو افراد میری آواز اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ان میں سے رمیش کا معاملہ شکوک و شبہات کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ دوسری بیلا تھی جس سے میں نے اپنی اصل آواز میں کسی خاتون کی رفاقت کا مطالبہ کیا تھا۔

وہ ایک ایسے سفارت خانے کا معاملہ تھا جو برطانوی سرزمین پر خاصی کامیابی سے اپنی خفیہ سرگرمیاں چلا رہا

تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ انہوں نے آنے والی فون کالز کی شناخت کے لیے اپنے مواصلاتی نظام میں کیا کچھ آلات لگائے ہوئے تھے، اس وجہ سے میں نے کال اپنے کمرے کے بجائے پبلک بوتھ سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک بار بدری سے میری بات ہو جاتی تو بہت سے معاملات صاف ہو سکتے تھے۔

نمبر ملنے پر خوش قسمتی سے مجھے بیلا کی ہی مانوس آواز سنائی دی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ان لوگوں نے اپنا کوڈ نہ بدل لیا ہو مگر میری بدلی ہوئی آواز میں کیتھی کے کوڈ کے ساتھ کیے جانے والے سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ بدری دوسرے نمبر پر مل سکتا تھا اور وہ دوسرا نمبر سری نواسن کے گھر کا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں ایک ناکام کوشش کر چکا تھا۔

میں نے بوتھ سے دوبارہ وہ نمبر ملایا اور اس بار بدری کی آواز سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

”کیا حال ہے، ابھی تم کہاں غائب تھے؟“ میں نے تپاک سے پوچھا۔

”میں ناشتے کا سامان لینے گیا تھا۔“ اس کی آواز سے گرم جوشی غائب تھی ”اس وقت تم مجھ سے کہاں مل سکتے ہو۔ میں تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں سینٹرل لندن میں ہوں۔ جہاں چاہو آ جاؤ، میں منتظر رہوں گا۔“ اس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ میں نے فوراً ہی اسے کھلی پیش کش کر دی۔

”پھر رٹز ہوٹل کی لابی میں آ جاؤ۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔“

”لابی کے بجائے باہر ہی مل لو۔“ میں نے اس پرشکوہ ہوٹل کا نام سن کر کہا ”وہاں کے لیے تیار ہونے میں مجھے دیر ہو جائے گی۔“

وہ کسی وجہ سے کسی بڑے ہوٹل ہی میں ملنا چاہتا تھا۔ ہلٹن کا پروگرام طے کر کے میں نے فون بند کر دیا۔

اس وقت میرا لباس نامناسب نہیں تھا، میں ہلٹن تو کیا رٹز بھی جا سکتا تھا۔ مجھے تھوڑی سی الجھن اپنے بڑھے ہوئے شیو کی وجہ سے تھی جس نے دو دنوں میں داڑھی کا روپ دھارا تھا اور نہ مجھے کلین شیو رہنے دیا تھا۔

بدری سے پروگرام طے ہو جانے کے بعد میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔ اسے ملنے پر بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں اور میں آئزک بیل کے بارے میں بھی اس سے بات کر سکتا تھا۔

میں نے اپنے ہوٹل کی طرف لوٹنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میرے پروگرام سے واقف ہونے کے بعد ویرا بھی میرے ساتھ چلنے پر مصر ہو سکتی تھی۔ یہ بات خود میں نے ہی اس کے دماغ میں بٹھائی تھی کہ رمیش کے قتل کی سازش میں ہمارا ساتھ دے کر وہ ہماری مٹھی میں آ چکا تھا اور ہمیں اس کی طرف سے رازداری یا اپنی سلامتی کے بارے میں کوئی موہوم سا خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔

تیسری کال میں نے اپنے ہوٹل کے لیے ملائی۔ آپریٹر نے مجھے کمرے سے ملا دیا۔

ویرا نے خالص امریکی لب و لہجے میں ہائے کہہ کر کال وصول کی تھی۔

”میری واپسی میں ذرا دیر ہو گی۔ میری طرف سے پریشان نہ ہو جانا۔“ میں نے بلا کسی تمہید کے کہا۔

”میں پہلے ہی پریشان ہوں، ابھی تک وہ خبر غائب ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں ہوٹل سے کافی دور ہوں۔ امید ہے کہ میری واپسی پر تمہارے سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ میں بھی تم سے آ ملوں؟ میں تقریباً تیار ہوں۔“

”آرام سے ناشتا کرو۔ میں نے تمہارا انتظار کیا تو دوسرا آدمی نکل جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا اور دھیمے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا بوتھ سے نکل آیا۔

میں خنک موسم میں مزے سے چہل قدمی کرتا ہوا وقت سے پہلے ہی ہلٹن ہوٹل پہنچ گیا۔ اس کی لابی میں اس وقت ایسے مسافر اپنے ساز و سامان سمیت براجمان نظر آ رہے تھے جو ہوٹل سے روانگی کے لیے طلب کی ہوئی سواریوں کی آمد کے منتظر تھے۔

لابی کا ایک جائزہ لے کر میں دوبارہ داخلی دروازے تک پہنچا تو بدری ناتھ پورے سوٹ میں ملبوس

اندر داخل ہو رہا تھا۔ لباس سے باوقار نظر آنے کے باوجود وہ اپنے بشرے سے پریشان لگ رہا تھا۔

قریب آتے ہی وہ تپاک سے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ مغربی سرزمین پر وہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔

''ریستوران میں چلتے ہیں۔'' وہ میرا ہاتھ تھام کر ایک راہداری میں مڑ گیا۔

''کیا بات ہے، تم پریشان اور خوف زدہ نظر آ رہے ہو؟'' اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''کل تک میں ایک مسلسل ذہنی عذاب سے گزر رہا تھا۔ اس نے یہاں پہنچتے ہی میرے خلاف ہر ایک کے کان بھرنے شروع کر دیے تھے اور ہر شخص مجھ سے کھنچا کھنچا نظر آنے لگا تھا۔''

''وہ غائب کہاں ہو گیا؟'' ریستوران کے نیم روشن ماحول میں پہنچنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''وہ بدنیت تھا، اسے وطن کی خاک تک نصیب نہیں ہو سکی۔ آج اس کی ارتھی کو خاموشی بلکہ رازداری سے یہیں چتا میں آگ دکھادی جائے گی۔''

وہ صبح کا وقت تھا۔ ریستوران میں بیشتر میزیں خالی تھیں۔ بدری ایک دور افتادہ گوشے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں اردگرد کی ساری میزیں خالی تھیں اور ہم بے فکری سے باتیں کر سکتے تھے۔

''ارتھی جلانے کے لیے اتنی رازداری کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' میز کے گرد بیٹھتے ہوئے میں نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔ اس نے ارتھی کا ذکر کر کے میرے اس بدترین خوف کی تردید کر دی تھی کہ ویرا اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کے چکر میں رمیش کو محض بے ہوش کر کے چلی آئی تھی۔

''تم نے کام اتنی صفائی سے کیا ہے کہ تمہارے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔'' وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے محبت بھرے لہجے میں بولا ''تم علی شیر نہیں علی کے شیر ہو۔ سیدھے ہاتھ سے کام کرتے ہو لیکن تم نے بائیں طرف سے وار کر کے اتنی صفائی سے اس کا منکا توڑا کہ میں حیران رہ گیا۔ تم نے کبھی ذکر نہیں کیا کہ میری طرح تم بھی اس فن میں طاق ہو۔''

''کیا ذکر کرتا۔ وقت آیا تو تم نے دیکھ ہی لیا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ فائر کا دھماکا خطرناک ہو جاتا اس لیے اس پر دوسرا طریقہ آزمایا گیا لیکن اخباروں وغیرہ سے یہ سب کیوں چھپایا گیا ہے؟''

اس نے ایک گہرا سانس لے کر سگریٹ سلگائی پھر بولا ''ان کے اپنے کرتوت ان کے گلے پڑ گئے ہیں۔ ہمارا پیچھا کرنے والے دونوں آدمی ابھی تک گرفتار ہیں۔ اگر بات کھل جاتی کہ وہ میرا اور رمیش کا پیچھا کر رہے تھے تو پھر بات بہت دور نکل جاتی۔ مجھ سمیت بہت سے لوگوں کی اصلیتیں بے نقاب ہو جاتیں اور ہمارے خلاف ایک بہت بڑا سیاسی اسکینڈل کھڑا ہو جاتا۔''

میرے لیے بدری ناتھ کا وہ انکشاف نیا نہیں تھا۔ وہ سارے امکانات میری نظروں میں تھے اور میں ان کے بارے میں کھل کر ویرا سے تبادلہ خیال کر چکا تھا۔

چائے کے ساتھ ناشتے کے ہلکے سے لوازم کا آرڈر دینے کے بعد میں اس بارے میں بدری سے دیر تک کرید کرید کر سوالات کرتا رہا۔ مجھے توقع تھی کہ شاید اس طرح کوئی نئی بات سامنے آ جائے لیکن اس کے جوابات میں صرف وہی باتیں تھیں جو میرے ذہن میں موجود تھیں۔

''رمیش کی لاش سری نواسن کے کسی بچے نے دیکھی ہوگی پھر یہ خبر اس قدر پوشیدہ کیسے رہی اور یہ فیصلہ کس کا تھا؟'' سارے امکانات ٹٹولنے کے بعد میں نے پوچھا۔

''لاش سب سے پہلے سری نواسن کے بارہ سالہ بیٹے نے دیکھی تھی۔ زخم یا تشدد کا کوئی نشان نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ سمجھا کہ رمیش پر اچانک کوئی دورہ پڑا ہے۔ وہ بچے اپنے باپ کی پراسرار پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے تقاضوں سے خاصے باخبر ہیں۔ اس نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بجائے فوراً فون پر اپنے باپ کو خبر دی اور وہ میرے اور ڈاکٹر کے ساتھ ہائی کمیشن کی ایمبولینس لے کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے پہلی نظر ڈالتے ہی رمیش کی موت کا اندازہ لگا لیا۔''

''یہ فیصلہ کب ہوا کہ اس کی موت کی خبر کو دبا دیا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''سری نواسن نے دفتر چھوڑنے سے پہلے ہائی کمشنر کو ابتدائی اطلاع سے باخبر کر دیا تھا۔ رمیش کی موت کی طبی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے دوبارہ اپنے افسر اعلیٰ سے رابطہ کیا تو اسے حکم ملا کہ رمیش کو بے ہوش ظاہر کر کے فوری طور پر ہائی کمیشن میں منتقل کر دیا جائے۔''

''یہ قانون کی ایک سنگین خلاف ورزی ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس کا قتل کون سا قانون کے مطابق تھا۔ بڑے اور سنگین الزامات سے گردن بچانے کے لیے یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔''

''اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں تم پوری طرح شریک تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجبوری تھی۔'' وہ شانے اچکا کے بولا ''اپنے وطن سے باہر ہائی کمشنر یا سفیر ہی ہم لوگوں کا سب سے بڑا حاکم ہوتا ہے اور اس کے فیصلوں پر ہمیں سر جھکانا پڑتا ہے۔''

''اس طرح تمہارے دوسرے سیکرٹ ایجنٹوں میں بددلی نہیں پھیلے گی۔''

''ہم لاش لے کر ہائی کمیشن پہنچے تو وہاں اہم عہدے داروں کو اعتماد میں لے کر یہ طے کیا جا چکا تھا کہ رمیش کے قتل کو اتفاقی موت کا رنگ دے کر واقعے کو دبا دیا جائے گا۔ ان سب کو اندازہ تھا کہ خبر پھیلنے سے کیسی تباہی آ سکتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''یہ سب باتیں قابلِ فہم ہیں لیکن بہت سے لوگوں کی نظروں میں رمیش قومی ہیرو رہا ہوگا۔ اس کی لاش کو وطن بھیجنے کے بجائے یہاں گمنامی کے عالم میں کیوں ٹھکانے لگایا جا رہا ہے۔''

''اس پر طویل اور تلخ مب[illegible] ہوئے ہیں۔'' اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا ''ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم بند گلی میں پھنسے ہوئے تھے۔''

''ہائی کمیشن کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے رائے ظاہر کی۔

''مجبوری یہ تھی کہ رمیش کوئی سفارتی ملازم نہیں تھا۔ ہم دونوں بھارت کے عام شہری پاسپورٹ پر یہاں پہنچے تھے۔ اس کی لاش انگلینڈ سے باہر لے جانے کے لیے اس کے پوسٹ مارٹم کی سرکاری رپورٹ کی موجودگی لازمی تھی۔ پوسٹ مارٹم ہوتا تو ٹوٹی ہوئی گردن سے قتل کا راز فاش ہو جاتا۔'' لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر اس نے اپنی بات جاری رکھی ''اگر وہ سفارتی ملازم ہوتا تو ہائی کمشنر کی صوابدید پر اس کی لاش کو کسی بھی طبی معائنے کے بغیر وطن لے جایا جا سکتا تھا۔''

وہ عجلت میں کیے ہوئے فیصلے نہیں تھے۔ انڈین ہائی کمیشن کے اعلیٰ دماغوں نے بہت دور تک غور و خوض کرنے کے بعد وہ حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔

''پھر اب اس کی موت کا کیا جواز ہوگا؟'' میرے لیے کئی سوال اس وقت بھی تشنہ تھے۔

''دنیا کے ہر خطے میں روزانہ ہزاروں آدمی اچانک مر جاتے ہیں۔ کسی اچانک دورے میں وہ بھی مر گیا اور اس کی لاش کو یہیں ٹھکانے لگا دیا گیا۔''

''بعد میں اس کی لاش کی باقیات کے جائزے سے اصلیت کا پتا چل سکتا ہے۔''

''جب تک کوئی مخبری نہ کرے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم اپنے مردوں کو دفنانے کے بجائے شمشان گھاٹ میں جلاتے ہیں۔ جلتی ہوئی چتا میں جب مردہ اینٹھتا ہے تو لکڑیوں سے اسے جگہ پر روکا جاتا ہے۔ وہ لکڑیاں ٹوٹی ہوئی گردن کا ہر نشان مٹا دیں گی۔ ویسے بھی چتا سرد ہونے کے بعد وہاں مردے کی راکھ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ وہ راکھ مرتبان میں بھر کر اس کے گھر والوں کو بھیج دی جائے گی۔''

وہ سرد مہری اور سفاکی کی انتہا تھی۔ لندن میں موجود چیدہ چیدہ سفارتی ملازمین کے سوا کسی کو بھنک بھی نہیں مل سکتی تھی کہ رمیش کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

''ایک طویل رفاقت کے بعد اس کے بچھڑنے پر تمہیں تھوڑا بہت قلق تو ضرور ہو رہا ہوگا۔''

''وہ تو ہوتا ہی ہے لیکن ایک پنڈلی میں سرطان ہو جائے تو آدمی اسے پال کر اپنی جان کا خطرہ مول نہیں لیتا، ٹانگ کٹوا دیتا ہے۔ یہ بھی میری ایسی ہی مجبوری تھی۔ یہ سیکرٹ ایجنٹوں کی زندگی کا وہ تاریک اور دردناک پہلو

ہے جوانجام سے پہلے کبھی سامنے نہیں آتا۔" وہ غمگین اور بوجھل آواز میں بولا۔

"اس کی ارتھی کے ساتھ شمشان گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے شاید تمہارا یہ دکھ کچھ اور بڑھ جائے لیکن وہ اسی انجام کا حق دار تھا۔ جو شخص اپنے دوست کا نہ بن سکے، وہ انسانیت کی سطح سے گر چکا ہوتا ہے۔ یہ تمہارا رضا کارانہ فیصلہ نہیں تھا۔ اس نے تمہیں مجبور کر دیا تھا۔"

"مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ہلکی سی تلخی سے کہا" میں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہوں اور کچھ کر گزرتا ہوں تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ اس کی ارتھی کو کوئی پروٹوکول نہیں دیا جائے گا۔ بس چند آدمی ساتھ جائیں گے اور میرے لیے یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"

"پھر تم کس لیے پریشان ہو اور مجھ سے کس بارے میں مشورہ کرنا چاہ رہے تھے؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ اسی وقت ہلٹن کی خوبرو ویٹرس ہم دونوں کے لیے ناشتے سمیت آموجود ہوئی اور میز سجانے میں مصروف ہو گئی۔

"تم باہر کے آدمی ہو۔ تمہاری سوچ کے اپنے رخ ہیں۔" ویٹرس کے چلے جانے کے بعد بدری نے میرے سوال کے جواب میں بولنا شروع کیا" تمہارے لیے یہ قصہ نمٹ گیا مگر میری پریشانیاں بڑھ گئی ہیں۔ پورے ہائی کمیشن میں یہ سوال گردش کر رہا ہے قاتل کون ہے۔ یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ گیتا جیمو پنڈت کی گولی سے مری لیکن پنڈت کو مارنے والا کون تھا اور اب رمیش اس کا نشانہ بنا ہے۔ وہ لوگ ان واقعات کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جبکہ تم گیتا اور جیمو سے لاتعلقی ظاہر کر رہے ہو۔"

"تم سکون سے تماشا دیکھتے رہو، تمہیں کیا پریشانی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کھوج لگانے کے لیے جو ٹیم بنائی گئی ہے اس میں میرا نام بھی شامل ہے۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب تم پر اعتماد کیا جا رہا ہے۔"

"ہاں۔ رمیش کے قتل نے سب کا اطمینان رخصت کر دیا ہے۔ لوگ مجھ سے کھل رہے ہیں۔ ... ہر طرح سے یقین دلانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ لندن پہنچ کے بعد میری نگرانی نہیں بلکہ حفاظت کا بندوبست کیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے آنے سے پہلے گیتا اور جیمو... پراسرار حالات میں مار دیے گئے تھے۔"

"یہ حالات میں بہتری کے آثار ہیں، ان پر تمہیں خوش ہونا چاہیے۔"

"اس وقت میں خلا میں معلق ہوں۔ مجھے راے چھٹی ملی ہوئی ہے۔ میرے کیریئر کا انحصار نک کے فیصلے پر ہے۔ پتا نہیں وہ رمیش کی موت پر کس ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

"کل تک تمہیں نک موڈلے کی خوشنودی کی ذرا بھی پروا نہیں تھی اور تم امریکا کے بجائے بھارت جانے کے لیے آمادہ نظر آ رہے تھے۔" میں نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"وہ اس وقت کی باتیں تھیں جب رمیش زندہ تھا اور میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اس کا کانٹا نکلنے کے بعد میری ترجیحات بدل چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کئی ہفتوں سے دن رات رمیش کے ساتھ رہ کر میں ذہنی طور پر بیمار ہونے لگا تھا۔ اب میں مثبت انداز میں سوچ سکتا ہوں۔"

"تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب تمہیں صرف انتظار کرنا ہوگا۔ پتا نہیں تمہاری بدلی ہوئی ترجیحات میں میری اور نک کی کیا پوزیشن ہے؟" میں نے متردد ہو کر کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس پڑا" تم نے دیکھ ہی لیا کہ میں کتنا منتقم مزاج ہوں۔ میں اپنے بدخواہ کو دنیا کے آخری سرے پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ رمیش نے میرا راستہ کاٹنے کی کوشش کی اور آج جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اسی طرح نک نے بھی میرے سینے میں ناسور ڈالے ہوئے ہیں۔ جب بھی میرا داؤ چل گیا، اس کا انجام رمیش سے بدتر ہی ہوگا۔ وہ وقتی طور پر مجھے اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے۔"

"تم چاہو تو اس کے خلاف ابھی سے اپنا کھیل شروع کر سکتے ہو۔"

"مجھے اکسا رہے ہو یا تمہارے ذہن میں کوئی بات آ چکی ہے؟" اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے کبھی ڈیوڈ اسٹارز کا نام سنا ہے؟" میں نے اس کی طرف جھک کر پوچھا۔

"ہم لوگ اسے یہودی مافیا کہتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں انہوں نے اچانک ہی بے پناہ طاقت حاصل کی ہے مگر ان کے عزائم ابھی تک زیادہ واضح نہیں ہو سکے۔ تمہیں اچانک ان کا خیال کیوں آ گیا؟"

"اڑتی اڑتی خبریں ملی ہیں کہ نک موڈلے کو ڈیوڈ اسٹارز کے سربراہ کے اشارے پر ہی پاکستان میں مامور کیا گیا ہے اور دونوں میں اب بھی قریبی رابطہ ہے۔"

"یہ خبر تمہیں کہاں سے ملی؟" اس نے چائے کا گھونٹ لے کر گمبھیر آواز میں پوچھا۔

"میرے اپنے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ کراچی میں یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی۔"

"سچ سچ بتاؤ کہ تم کون ہو؟" اس نے جوشیلی آواز میں کہا۔

"مقامی سطح پر چھوٹے موٹے جرائم کرنے والا کوئی شخص دنیا بھر کے معاملات کے بارے میں اتنا باخبر نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تمہارا نہیں، تمہاری بدلتی ہوئی ترجیحات کا اثر ہے کہ آج تمہیں مجھ پر بھی شبہ ہو رہا ہے۔" میں نے منہ بنا کر خشک لہجے میں جواب دیا" ارد گرد رونما ہونے والے واقعات سے باخبر رہنا گناہ تو نہیں ہے۔"

"ہر خبر کا ایک اپنا حلقہ ہوتا ہے۔ عام آدمی کے لیے جو باتیں اہم راز ہوتی ہیں، طاقتور حلقوں میں لوگ کھل کر ان پر باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات تم اچانک ہی اتنی بڑی بڑی باتیں کر جاتے ہو جو مجھے چونکا دیتی ہیں۔ یہی معاملہ ڈیوڈ اسٹارز کا ہے۔"

"جب تم چونکتے ہو تو تمہیں میرا چہرہ بدلا ہوا نظر آتا ہے؟" میں نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

"مجھے بے اختیار ڈینی کا خیال آ جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیں خاص طور پر بریفنگ دی گئی تھی۔ وہ بہت باخبر اور خطرناک آدمی ہے اور اکثر مقابلوں میں پہل کر کے فتح مند رہتا ہے۔"

"کاش میں وہی ہوتا۔" میں نے حسرت سے کہا" کبھی کبھی ایسے شبہات کا اظہار کرتے رہو۔ اس طرح مجھے اپنی بڑائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔"

"تم نک موڈلے کے خلاف کسی کھیل کا ذکر کر رہے تھے؟" اس نے مجھے یاد دلایا۔

"ہو سکے تو ڈیوڈ اسٹارز کے سربراہ سے رابطے کا کوئی سراغ نکالو۔"

"اب تم مجھے ایک بار پھر شبہے میں ڈال رہے ہو۔ اس کا تم کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

"وہی جو تم نک موڈلے کا بگاڑنا چاہ رہے ہو۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اگر تم کوئی بات چھپانی چاہ رہے ہو تو میں تمہیں اس کے اظہار پر مجبور نہیں کروں گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا" یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے ڈیوڈ اسٹارز کا راس المیڈا پراسرار حالات میں کراچی کے مضافات میں مارا گیا تھا، اسی کے ایما پر ہمیں کراچی بلایا گیا تھا۔"

"آج سے پہلے تم نے کبھی مجھ سے ڈیوڈ اسٹارز کے حوالے سے بات نہیں کی تھی۔"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ آپس میں افہام و تفہیم کا رشتہ دھیرے دھیرے پروان چڑھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے ڈیوڈ اسٹارز کا ذکر نہ کیا ہو لیکن دوسری ہر بات تمہارے علم میں ہے۔ ہمیں کراچی کے نیلور نامی گھاٹ پر پرنس ساگا نے خوش آمدید کہا تھا اور وہ راس المیڈا کے لیے کام کر رہا تھا۔ ان دونوں کی موت کے بعد ہی ہم حاجی دل مراد کے ڈیرے سے بھٹکتے ہوئے تم تک پہنچے تھے۔ یہ......"

اس نے اپنی صفائی میں بولنا شروع کیا۔ میرے ذہن میں ماضی قریب کے وہ تمام واقعات تازہ تھے۔ ان کو دہرانا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا اس لیے میں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔" غنیمت ہے کہ یہ سارا پس منظر تمہیں یاد ہے۔ میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔ اتنے واضح اشارے موجود ہوتے ہوئے بھی میں تمہارے، نک اور ڈیوڈ اسٹارز کے بارے میں یہ نہ سمجھتا تو

یہ میری نااہلی تھی۔“

”میرے سامنے تم ہمیشہ خود کو کام سے کام رکھنے والا آدمی ظاہر کر کے ان باتوں سے انجان بنے رہے۔“ اس بار اسے مجھ سے شکوہ کرنے کا موقع مل گیا۔

”آپس میں افہام و تفہیم کا رشتہ دھیرے دھیرے پروان چڑھتا ہے۔“ میں نے اس کی کہی ہوئی بات اسی کو لوٹا دی اور وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمارے درمیان اب ساری ہی باتیں کھل چکی ہیں۔“ ہنسی تھمنے کے بعد وہ بولا۔

”ہاں۔ یہ یاد رکھنا کہ راس المیڈا کراچی میں بلا سبب نہیں مارا گیا تھا۔ وہ کراچی بلکہ پاکستان میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ زیر زمین دنیا کے بہتیرے لوگوں نے اس سے بہت مال کمایا تھا۔ ہمیں کچھ کرنا ہے تو ڈیوڈ اسٹارز کے بارے میں ہر وقت آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔“

”ایسے منظم گروہوں میں ہر وقت اور ہر سطح پر متبادل قیادت دستیاب ہوتی ہے۔ راس المیڈا کی جگہ کوئی نہ کوئی لے چکا ہوگا۔ میں اس کے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔“

”حیرت ہے کہ تم پیشہ ور ہو کر بھی اتنے بے خبر ہو۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”کراچی میں، میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ تک کے سوا کسی سے میرا کوئی رابطہ نہیں تھا پھر خبریں کہاں سے ملتیں۔ اس حصار سے نکل کر ہی میں نے رمیش سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔ رابطے بحال ہوں گے تو تم مجھے بے خبری کا طعنہ نہیں دے سکو گے۔“

”میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ راس المیڈا کے جانشین کا نام اسحاق کھنٹی ہے۔“

”اسحاق کھنٹی!“ اس نے حیرت سے دہرایا ”یہ تو مجھے دلی یا بمبئی کے کسی بدمعاش کا نام معلوم ہوتا ہے۔ شاید تم مذاق کر رہے ہو؟“

”میں بری طرح سنجیدہ ہوں۔ امریکا میں اسے آئزک بیل کہا جاتا ہے۔“

”آئزک بیل!“ اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی ”اب جلد ہی کام بن جائے گا۔ کلکتے میں ایک مخبر اور کروڑ پتی یہودی ڈیوڈ اسٹارز کی نمائندگی کرتا ہے۔ نام معلوم ہو جانے کے بعد میں اس سے براہ راست آئزک بیل کا فون نمبر لے سکتا ہوں۔“

”یہ کام تم فون پر ہی کرو گے؟“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”اس کے سوا کیا صورت ہو سکتی ہے۔ فوراً ہی جواب مل جائے گا۔“ وہ بولا۔

”پھر اس نیک کام میں دیر مت کرو۔“ میں نے اپنی جیب سے فون کارڈ نکال کر اس کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا ”اسی وقت ہوٹل کی لابی سے اسے فون کر ڈالو۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

اس نے ہچکچاہٹ کے عالم میں اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی تو میں نے اسے ٹوک دیا ”اس وقت وہاں دوپہر ہو چکی ہوگی۔ بھارت کا وقت یہاں سے ساڑھے چار گھنٹے آگے ہے۔ جو کام اس وقت ہو سکتا ہے اسے بعد کے لیے نہ رکھو۔“

وہ کارڈ لے کر مسکراتا ہوا ریستوران کے دروازے کی طرف چل دیا۔ میں آرام دہ کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

میرے اندازے کے برعکس بدری ناتھ ذرا تاخیر سے واپس آیا اور اس نے آتے ہی ایک رقعہ میرے سامنے ڈال دیا۔ اس پر صرف ایک بڑا نمبر لکھا ہوا تھا۔

”یہ نیویارک میں آئزک بیل کے دفتر کا فون نمبر ہے۔ یہ خیال رکھنا کہ نیویارک یہاں سے چار گھنٹے پیچھے ہے۔ اس وقت وہاں صبح ہو رہی ہوگی۔“

میں نے اس کا دیا ہوا رقعہ احتیاط سے موڑ کر جیب میں رکھ لیا۔ وہ کامیابی مجھے خلاف توقع حاصل ہوئی تھی اور اب میرا ذہن سلطان شاہ کی طرف بھٹکنے لگا تھا۔

”تم نے ایک کام کے لیے کہا اور میں نے اسے پورا کر دیا۔“ بدری کہہ رہا تھا ”اب تو مجھے بتا دو کہ آئزک بیل کے بارے میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”میں ڈینی بن کر اسے امریکا پہنچنے کی دھمکی دینا چاہتا ہوں۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے بغیر سوچے سمجھے کہہ ڈالا مگر وہ میری اس بات پر کھل اٹھا۔

”یہ کام ضرور کر گزرو۔ اگر مجھے امریکا جانے کا پروانہ مل گیا تو وہاں ہم جو کچھ کریں گے اسے ڈینی کی آڑ مل جائے گی۔ لوگوں کے ذہنوں پر کسی بڑے بدمعاش کی دہشت ہو تو چھوٹے موٹے لفنگوں کی کارروائیاں بھی اس کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں اور سب بچے رہتے ہیں۔“

”تم مبالغے سے کام لے رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ ڈینی ابھی اتنا بڑا عالمی دہشت گرد نہیں بنا ہے کہ اس کے نام سے لوگ تھرانے لگیں۔“

”برصغیر کے باسیوں میں یہ ایک عام خرابی ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔“ اس نے افسردگی سے کہا ”تم ڈینی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو فیڈل کاسترو اور ڈان کارلوس کے ساتھیوں سے پوچھو۔ ابوندال، کرنل جیسی جونز اور بھنڈرانوالہ تمہیں اس کے بارے میں بتائیں گے۔ وہ چھلاوے کی طرح اپنے دشمنوں پر کہیں بھی حملہ آور ہوتا ہے اور انہیں تہس نہس کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ جانے کتنی بڑی بڑی وارداتیں منسوب ہیں لیکن ریکارڈ پر اس کی تصویر تک دستیاب نہیں ہے۔ کسی کی بڑائی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔“

”بس بس، اب میرا دماغ زیادہ خراب مت کرو۔“ میں اپنی جھونک میں کہہ گیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بوکھلا کر بے اعتباری سے میری طرف گھورنے لگا۔

”مطلب یہ ہے کہ کہیں میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہو کر خود ہی ڈینی ہونے کا دعویٰ نہ کر بیٹھوں۔“ میں نے سٹپٹاتے ہوئے انداز میں جلدی سے وضاحت کی اور وہ ہنسنے لگا۔

”میرے سامنے یہ دعویٰ کرو یا نہ کرو، آئزک بیل کے دماغ پر یہ دہشت ضرور سوار کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں امریکا گیا تو اس کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارنا ہوگا۔“

”وہ میرا کام ہے۔ اس طرف سے تم مطمئن ہو جاؤ۔“ میں نے اسے یقین دلایا پھر پوچھا ”ابھی تم سری نواسن کے گھر پر ہی رہو گے یا تمہارا ٹھکانا بدل جائے گا۔“

”فی الحال ہر چیز جوں کی توں ہے۔ صرف رمیش گھٹ گیا ہے۔ اب کم از کم مجھے اپنا فون نمبر ضرور دے دو۔ کسی وقت اچانک کوئی نادر شاہی حکم نازل ہو جائے تو تم سے رابطہ تو ہو سکے گا۔“

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر کہا ”نمبر میں دے دوں گا لیکن اسے تم جلد از جلد رٹ لو گے۔ اسے کہیں درج نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ نادیدہ آنکھیں تمہاری نگرانی کر رہی ہوں۔“

”میرا ستارہ گردش میں ضرور آیا ہوا ہے مگر یہ نہ بھولو کہ میں را کا اسٹار سیکرٹ ایجنٹ بدری ناتھ ہوں۔“ وہ میری طرف جھک کر جذباتی لہجے میں بولا ”میری نگرانی ہو رہی ہوتی تو میں اس وقت تم سے ملنے کا خطرہ ہرگز مول نہ لیتا۔ کل کلاں کو کوئی میرے اوپر مسلط کر دیا جائے تو دیگر بات ہے۔ میں چاہتا تو ایسے لوگوں کو چٹکیوں میں اڑا سکتا ہوں۔“

”یہاں آنے کے بجائے تم نے مجھے سری نواسن کے گھر کیوں نہیں بلا لیا؟“

”اس میں تمہاری بہتری پنہاں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ فی الحال لندن میں کوئی تم کو میرے حوالے سے پہچانے۔ ایک احتیاط ممکن ہو تو اس پر عمل کرنا ہی بہتر رہتا ہے۔“

”یہی بات تھی تو یہ ملاقات کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ تم رٹز یا ہلٹن میں ملنے پر مصر کیوں تھے؟“

”یہ بھی ایک مصلحت تھی۔“ وہ ہلکی سی معنی خیز ہنسی کے ساتھ بولا ”لندن میں بھارتی ایک بڑی تعداد میں آباد ہیں اور چپے چپے پر پائے جاتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہم ایک کفایت پسند یا کنجوس قوم ہیں۔ ان مہنگے ہوٹلوں میں شاید ہی کوئی بھارتی کھانے پینے کے لیے آتا ہوگا۔ سستے تفریحی مقامات پر تمہیں ان کی ریل پیل ملے گی۔“

”خوب!“ میں نے اس کی وضاحت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا ”اگر تمہارا مشاہدہ اتنا ہی وسیع ہے تو پاکستانیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم بادشاہ لوگ ہو۔“ اس نے بے ساختہ جواب دیا ”دنیا کہتی ہے کہ غربت میں ہمارے بعد اگلا نمبر تمہارا

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری قوم غریب ہو لیکن لوگ مال دار ہیں۔ شہزادوں کی طرح دل کھول کر ہر جگہ پیسہ لٹاتے ہیں۔"

میرے اشارے پر ویٹرس پہلے ہی ایک خوب صورت فولڈر میں اپنا بل رکھ گئی تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم یہ سب نہ کہتے تب بھی چائے کا بل میں ہی ادا کرتا۔"

وہ اپنے سر کو زور زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے خجالت سے ہنسنے لگا۔

بل اور ٹپ کی رقم فولڈر میں چھوڑ کر ہم ریستوران سے باہر آئے تو بدری ناتھ نے الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"آؤ یہاں سے ساتھ ہی نکلتے ہیں۔" میں نے بے تکلفی سے پیشکش کی۔

"تم جاؤ، میں بعد میں باہر نکلوں گا۔ کوئی بات باقی رہ گئی ہے تو ایک ساتھ باہر نکلنے کا خطرہ مول لیے بغیر ہم تھوڑی دیر تک یہیں کھڑے کھڑے باتیں کر سکتے ہیں۔"

"اگر یہ محض احتیاطی تدبیر ہے تو تم چلے جاؤ۔" میں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا" میں اسحاق گھنٹی کو پہلی خوراک دے کر یہاں سے نکلوں گا۔"

"آئندہ آپس کی گفتگو میں اس کا یہی نام استعمال کریں گے بلکہ صرف گھنٹی بھی کافی ہوگا۔ تم نے اس کے نام کا بہت موزوں ترجمہ کیا ہے۔ صبح صبح خوراک ملتے ہی اس کی طبیعت جھک ہو جائے گی۔"

وہ نکاس کے راستے کی طرف چل دیا اور میں راہداری کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک ڈیسک پر ہوٹل کے ایکسچینج سے منسلک انٹرکام رکھے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا آگے وہ پبلک فون بوتھ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کارڈ فون تھا، دوسرے کے لیے ریزگاری ضروری تھی۔

کلکتے کے لیے کال کے بعد بھی میرے کارڈ میں کافی یونٹ باقی تھے جو کارڈ کے سلاٹ میں جاتے ہی انسٹرومنٹ کی اسکرین پر روشن ہو گئے اور میں نے بدری کا دیا ہوا پرچہ نکال کر نیویارک کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔

انگلینڈ سے امریکا رابطے کے لیے زیرو ون زیرو ون کا کوڈ نہ جانے کیسے میرے ذہن میں اٹکا رہ گیا تھا۔ نیویارک کا کوڈ اور نمبر رقعے پر موجود تھا۔

وقت کے نمایاں فرق کی وجہ سے مجھے شبہ تھا کہ شاید اتنے سویرے آئزک بنل کا دفتر خالی ہو مگر مجھے دوسری گھنٹی پر ہی کانوں میں رس گھولنے والی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"میں آئزک بنل سے بات کرنی چاہتا ہوں۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نیویارک والی لڑکی کو اپنے مدعا سے آگاہ کیا۔

"سوری سر! دفتر کا وقت ایک گھنٹے بعد شروع ہوگا۔ وہ مزید تاخیر سے آتا ہے۔ کوئی پیغام ہو تو مجھے نوٹ کرا دو۔ وہ اسے مل جائے گا۔"

اپنے باس کے لیے لڑکی کا لہجہ احترام آمیز تھا۔ یہ انگریزی کی خرابی تھی کہ واحد غائب کے صیغے کے لیے انگریزی گرامر میں آپ جناب کے تکلفات نہیں پائے جاتے تھے۔

"وہ آئے تو اسے بتا دینا کہ اس کے لیے پاکستان سے اس کے باپ کا فون آیا تھا۔"

"باپ!" شاید میرا پیغام سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسی تحیر زدہ آواز میں اس نے پوچھا" کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟ میرا خیال ہے کہ اس کا باپ تو مدتوں پہلے مر چکا تھا۔"

لڑکی کی حیرت اور سنجیدگی کا ادراک کرتے ہوئے میں نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی" تم ٹھیک کہہ رہی ہو بے بی۔ میں آئزک کی ماں کا دوسرا شوہر یعنی اس کا سوتیلا باپ ہوں۔ یہ اس کی سعادت مندی ہے کہ وہ سگے باپ کی طرح میرا احترام کرتا ہے۔"

"اوہ!" لڑکی کی معلومات میں اضافہ مزید حیران کن ثابت ہوا تھا" مگر سر، میں نے تمہارا نام بھی پوچھا تھا۔"

"ہاں، یہ ضروری ہے کیونکہ اس کی ماں نے ایلزبتھ ٹیلر کی ضد میں نو شادیاں کی تھیں۔ اسے یہ پتا نہیں چل سکے گا کہ آٹھ میں سے ...... اس کے کس سوتیلے باپ نے اسے یاد کیا ہے، میرا نام ڈینی ہے۔"

"اوہ یو باسٹرڈ!" لڑکی کی کھکھاتی ہوئی بے ساختہ آواز کافی بلند تھی" میرا اندازہ تھا کہ تم کوئی سنجیدہ اور صحیح الدماغ آدمی ہو مگر تم پکے حرامی نکلے، تمہارا نام میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔"

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جو بھی تھی، ڈیوڈ اسٹارز کے سربراہ کے دفتر کی ملازمہ تھی۔ میرے ہاتھوں جم کلارک اور راس المیڈا کی عبرت ناک بربادی کے بعد یہ لازمی امر تھا کہ شی یا ڈیوڈ اسٹارز میں کوئی بھی مفاد رکھنے والا ہر شخص میرے نام اور کردار سے باخبر نہ رہتا۔ وہ میرا نام سن چکی تھی۔ اس وقت اس نے میری آواز بھی سن لی تھی۔

اپنی احمقانہ سادہ لوحی کی بنا پر اسے یک بیک اتنا غصہ آیا تھا کہ وہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کتنی ناقابل اشاعت گالیاں دیتی چلی گئی اور میں ریسیور کان سے قدرے دور ہٹائے وہ جھنجھناہٹ ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ نیویارک والوں سے اسی ردعمل کی امید پر میں نے وہ کال ملائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت آئزک بنل خود فون اٹھاتا تو میں اسے بھی اسی طرح آپے سے باہر ہونے پر مجبور کر دیتا۔

وہ جیسے ہی خاموش ہوئی، میں نے ماؤتھ پیس میں اسے پچکارتے ہوئے کہا" تم نے مجھے دل بھر کر گالیاں دے لیں، یہ تمہاری مجبوری ہے کیونکہ تم اس چوہے کی داشتہ یا ملازمہ ہو جو مجھے اپنا باپ ماننے سے منکر ہے حالانکہ راس المیڈا کے بعد اب میں ہی تم لاوارثوں کا خبر گیر ہوں۔ اسے بتا دینا کہ میں اس کی مزاج پرسی کے لیے جلد وہاں پہنچنے والا ہوں۔"

لڑکی نے دوبارہ فحش کلامی کا آغاز کر دیا۔ میں نے ریسور ہک سے لٹکا دیا۔

کارڈ جیب میں ڈال کر میں ہلٹن سے باہر نکلا تو میرا ذہن بہت ہلکا ہو چکا تھا۔

فون کرنے تک میرا ارادہ تھا کہ میں آئزک بنل پر سلطان شاہ کے بارے میں کوئی دباؤ ڈالوں گا لیکن آخری لمحوں پر مجھے احساس ہوا کہ محض کھوکھلے الفاظ سے کام نہیں بن سکتا تھا بلکہ میرا کوئی بھی بے وزن مطالبہ اسے اپنی برتری کے گھمنڈ میں مبتلا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے خوش دلی کے ساتھ اس لڑکی کو سلگانے اور تاؤ دلانے کے سوا کوئی اور بات نہیں کی تھی۔

لندن میں ذرا دیر سے سہی مگر حالات میں بہتری پیدا ہو رہی تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد میں جو خطرہ مول لے بیٹھا تھا وہ معدوم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے اور بدری کے درمیان تعاون کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بننے والا رمیش ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹ چکا تھا۔ مجھے بدری سے مل بیٹھنے کا موقع مل گیا تھا جس کے نتیجے میں آئزک بنل کا فون نمبر میرے ہاتھ آ چکا تھا۔

لندن کی ان کامیابیوں کی خوشی کو سلطان شاہ کے اغوا نے ماند کیا ہوا تھا۔ اپنے ہوٹل کی طرف لوٹتے ہوئے میں اسی مسئلے پر سر کھپاتا رہا لیکن کوئی حل سامنے نہ آ سکا۔ اپنے شہر سے ہزاروں میل دور ہونے کی وجہ سے میں اس معاملے میں خود کو بالکل بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں ویرا بے چینی سے میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

"جانے سے پہلے مجھے بھی جگا دیتے تو تمہارا کیا گھس جاتا۔"

میرے اندر پہنچنے کے بعد اس نے خفگی سے شکوہ کیا" اتنے سویرے تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔ مجھ سے دیوانگیاں ہی سرزد ہو سکتی تھیں۔"

"اکیلے ہی سب کچھ کرنے کی کوشش کرتے رہے تو انجام اس سے بھی برا ہو سکتا ہے۔" میرے چہرے پر بے خوابی کے آثار دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ترحم کا جذبہ ابھر آیا" اکیلے مارے مارے پھرتے ہو۔ خود ہی خود سوچتے رہتے ہو۔ اس طرح نیندیں نہیں اڑیں گی تو اور کیا ہوگا؟ وہاں سلطان شاہ جیتے جاگتے اغوا ہو گیا۔ یہاں رمیش مرتے ہی کسی آسیب کی طرح غائب ہو گیا۔ صبح کے اخبار میں کچھ چھپا ہے نہ ٹیلی وژن پر کوئی ذکر ہے۔ تم نے کہا تھا کہ واپسی پر ان سوالوں کے جواب لے کر آؤ گے۔ تمہاری اطلاعات کیا کہتی ہیں؟"

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے منہ لٹکا کے کہا ”جب وہ مرا ہی نہیں تو اس کے بارے میں کسی خبر کا انتظار بے سود ہے۔ وہ آج اپنے بائی کمیشن میں دندنا رہا ہے۔“

ویرا کا چہرہ [illegible] گیا۔ وہ کمزور آواز میں بولی ”میں قسم کھا سکتی ہوں کہ وہ مر چکا تھا، نبض اور دل کی دھڑکنیں رکنے کے ساتھ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تک اوپر چڑھ چکی تھیں۔ میں نے اس کے پپوٹے بھی پلٹ کر دیکھے تھے۔“

”ہاں ہاں، کبھی کبھی ایسا دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔“ میں نے عارفانہ بے پروائی سے کہا ”ایک بیماری کے حملے سے مریض پر ایسی علامات طاری ہو جاتی ہیں۔“

”میں نے آج تک ایسی کسی بیماری کے بارے میں نہیں سنا۔“ اس نے بے اعتباری سے کہا۔

”تم نے بہت سی چیزوں کے بارے میں نہیں سنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دنیا میں سرے سے ان کا وجود ہی نہیں ہے۔“

”مجھے اس عجیب و غریب بیماری کا نام بتاؤ۔“ اس نے مجھے گھور کر مطالبہ کیا۔

امراض کے بارے میں میری جملہ معلومات کبھی بھی نزلہ، زکام اور بخار سے زیادہ نہیں رہیں۔ میں نے بیماریوں کے پڑھے ہوئے نام یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ ڈالا ”وہ کارونری آرتھرائٹس کا مریض ہے۔“

”کیا بک رہے ہو؟“ حیرت اور غیظ سے اس کی آنکھیں پیشانی پر جا چڑھیں۔ وہ غضب ناک لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”کارونری دل کی بیماریاں ہوتی ہیں اور آرتھرائٹس ہڈیوں اور جوڑوں کا مرض ہوتا ہے۔ ان دونوں کو ملا کر تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو۔“

غصے کی شدت سے وہ ایسی ہیئت میں آ چکی تھی کہ بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی اور اس نے جھلا کر اپنے ہاتھ میں دبا ہوا لائٹر میرے اوپر پھینک دیا۔

میں اس کا پھینکا ہوا لائٹر فضا میں ہی لپک لیا اور کہا ”اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ وہ جہنم واصل ہو چکا ہے اور آج اس کی چتا کو آگ لگا دی جائے گی۔“

”تمہیں شرم آنی چاہیے۔“ وہ غصے اور جھلاہٹ کے عالم میں بولتی رہی ”میں سلطان شاہ کے لیے سخت فکر مند ہوں۔ اس کی جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”میں بھی اس کے لیے اسی قدر پریشان ہوں۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اداس بکرے کی طرح منہ لٹکا لینے سے اگر اس کی بازیابی ممکن ہے تو میں مہینوں کے لیے سوگوار رہنے کو تیار ہوں۔ ہمیں ذہنی طور پر مفلوج نہیں ہو جانا چاہیے۔ بیدار مغزی کے ساتھ ہی ہم بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔“

”اول خان سے میری بات ہوئی ہے۔“ اس نے ترشی سے کہا۔ اس کا منہ بدستور پھولا ہوا تھا ”اسے جمن نامی کسی بدمعاش کا سراغ ملا ہے۔ وہ دو دن پہلے اپنی ماں اور بیوی کو ایک بڑی رقم دے کر خود کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ جمن کی تلاش پر مرکوز کر دی ہے۔“

”جمن!“ میرے لاشعور کے کسی گوشے میں ایک بازگشت سی گونجی مگر فوری طور پر مجھے اس نام کے بارے میں کچھ یاد نہیں آ سکا۔

”یہ کیسے پتا چلا کہ اس نے اپنے گھر والوں کو کوئی بڑی رقم دی ہے؟“

”غریبوں کی جیب میں اچانک پیسہ آتا ہے تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نت نئی خریداریوں نے ہی اول خان کے کسی مخبر کو اس طرف متوجہ کیا ہوگا۔“ پانی کے جھاگ کی طرح ویرا کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر اس نے پوچھا ”رمیش کی خبر کہاں دبی ہوئی ہے۔“

میرا ذہن جمن کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ وہ نام مجھے سنتے ہی مانوس لگا تھا مگر اس وقت ویرا کی خاطر داری بھی ضروری تھی۔ میں نے اپنی مصروفیت کی روداد چھیڑ دی۔

”چند گھنٹوں میں تمہاری کارکردگی شاندار رہی ہے۔“ میری پوری کتھا سن لینے کے بعد ویرا نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ”اچھی خبریں ہیں آئزک بیل کو اشتعال دلانے والی بات بھی سمجھ میں آتی ہے مگر اس سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔“

”ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ شاید کہیں سے غیر متوقع انداز میں کوئی راہ نکل آئے۔ حرکت میں برکت ضرور ہوتی ہے۔“

”تمہیں بدری نے بتایا ہے کہ کلکتہ میں ڈیوڈ اسٹارز کا باقاعدہ نمائندہ موجود ہے؟“ ویرا نے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔

”ضرور ہے۔ اب یہ نہ کہہ دینا کہ ہمیں کلکتہ پہنچ کر اس پر ہاتھ ڈال دینا چاہیے۔“

ویرا مسکرا دی ”وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ پیرس کے ساتھ لندن بھی یورپ کا دل ہے۔ یہاں بھی ان کی تنظیم موجود ہوگی۔ ان کا اتا پتا مل جائے تو انہیں ہراساں کیا جا سکتا ہے۔“

”شاید بدری اس مقصد کے لیے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ یہ مواصلاتی انقلاب کا دور ہے اور پھر مجرم بہت تیزی سے معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ کلکتہ میں بیٹھا ہوا شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ وہ بدری کو اپنے جس مرکز کا کوئی پتا یا فون نمبر دیتا ہے وہاں گڑبڑ کیوں ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خاموشی سے اس کی گردن ہی کاٹ دیں۔“

”اس وقت ہمارے لیے سلطان شاہ بدری سے زیادہ اہم ہے۔ اس مہرے کو کہیں نہ کہیں پٹنا ہے۔ وہ آخر تک ہماری بساط پر جما نہیں رہ سکے گا۔ میں اس کی ذرا بھی پروا نہیں کروں گی۔“

”پھر بھی تم کچھ حاصل نہیں کر سکو گی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”اگر سلطان شاہ ڈیوڈ اسٹارز کے ہرکاروں کے چنگل میں پھنس چکا ہے تو اسے صرف مضبوط سودے بازی سے بازیاب کرایا جا سکتا ہے۔ کلکتہ یا لندن میں انہیں نقصان پہنچانا بے سود ہوگا۔ سودے بازی کے لیے ان کے کسی اہم آدمی کو یرغمالی بنا کر ہم اپنی پوزیشن مستحکم کر سکتے ہیں۔“

”لندن میں ان کے بہتیرے اہم آدمی ہوں گے۔ یہاں یہودیوں کی قابل ذکر تعداد رہتی ہے۔“

”اول تو یہ بہت مشکل کام ہے۔ اگر تم نے کسی کو پکڑ بھی لیا تو کہاں رکھو گی۔ ہمارے پاس پورے شہر میں ایسی کوئی جگہ پیدا نہیں ہو سکتی۔“

ہمارے پاس وقت ہی وقت تھا۔ وہ بحث پر تل گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ لندن بہت مہمان پرور شہر تھا۔ برطانوی شہریت کے بغیر ہر غیر ملکی وہاں آزادی سے جائداد خرید سکتا تھا۔ شہر کے مضافات میں کوئی جگہ لے کر ہم وہاں منتقل ہو سکتے تھے۔

میرے لیے وہ باتیں بحث برائے بحث سے زیادہ اہم نہیں تھیں۔ وہ ایک طویل المدت منصوبہ تو ہو سکتا تھا جب کہ ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ ہمیں اس شہر سے کب کوچ کرنا پڑ جائے۔

اس بے مقصد بحث میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جمن کے بارے میں اپنے ذہن کو کریدتا رہا اور آخر کار مجھے اچانک ہی سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔

ایک زمانے میں جمن میرے لیے کام کرتا رہا تھا۔ وہ مہنگی قیمت پر حاصل کی ہوئی، شی کی ملکیتی ہیروئن سستی قیمت پر کراچی کی مضافاتی آبادیوں اور گاؤں گوٹھوں تک میں پہنچایا کرتا تھا۔

ایک طرف گڈاپ، میمن گوٹھ اور انگارہ گوٹھ میں اس کے خریدار تھے تو دوسری طرف نیشنل ہائی وے پر ملیر اور گھارو سے کوٹری تک اس کی رسائی تھی۔ وہ ٹھٹھہ کے کریم نامی بدمعاش کا گہرا دوست تھا۔ ان علاقوں کی ضروریات کے لیے کریم ہر وقت ہیروئن کا خاصا ذخیرہ رکھا کرتا تھا۔

وہ باتیں ذہن میں تازہ ہوتے ہی میں نے اول خان سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس وقت وہ دفتر میں نہیں تھا۔ شکست کے احساس نے اس کی تھکن کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ آخر کار وہ دفتر چھوڑ کر گھر کی راہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں نے اس کے گھر کا نمبر ملایا تو فون پر وہ خود موجود تھا۔

”ایک قدم بڑھنے کے بعد گاڑی پھر ٹھپ ہو گئی ہے۔“ سلام دعا کے بعد اس نے ڈھیلی ڈھالی آواز میں کہا ”بہت مشکل سے جمن کا نام سامنے آیا مگر اس کا کہیں پتا نہیں ہے۔“

”یہ وہی جمن ہے نا جو ایک زمانے میں بہت بڑا منشیات فروش ہوا کرتا تھا پھر خود بھی ہیروئن کی لت میں مبتلا

ہو کر برے حال کو پہنچ گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل، بالکل وہی ہے۔ علاج معالجے کے بعد وہ سدھر گیا تھا مگر اس کے حالات پہلے جیسے نہیں ہو سکے۔" میرے حوالوں نے اس کی آواز میں گویا نئی جان ڈال دی۔

"اگر وہ شہر میں کہیں دستیاب نہیں ہے تو اس کا دوسرا ٹھکانا ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایک پارٹی لے کر کریم کے ڈیرے پر پہنچ جاؤ۔ وہ وہیں ملے گا۔ اگر وہ سلطان شاہ کے اغوا میں ملوث ہے تو پھر اس نے قیدی کو بھی وہیں رکھا ہوگا۔"

"مگر یہ کریم کون ہے اور اس کا ڈیرہ کہاں ہے؟" اول خان کی آواز میں اضطراب سمٹ آیا۔

"ٹھٹھہ میں رہتا ہے۔ ملاح قوم کا ایک بگڑا ہوا نوجوان ہے۔ دور دور تک اس کی دھاک ہوا کرتی تھی۔ اس کے مہمان بن کر ٹھٹھہ شہر میں کسی سے بھی پوچھو گے تو وہ تمہیں اس کے گھر تک پہنچا دے گا۔"

"میں تھوڑی سی نیند لینے کے ارادے سے گھر آیا تھا۔ تمہاری باتوں نے میری ساری تھکن دور کر دی ہے۔ میں اسی وقت پارٹی لے کر ٹھٹھہ جا رہا ہوں۔ میری کامیابی کی دعا کرتے رہنا۔"

"یہ تمہاری نہیں ہم سب کی کامیابی ہوگی، واپسی پر اطلاع دے دینا۔"

"بے فکر رہو۔ میں پہلا کام یہی کروں گا۔ اب غزالہ سے بات کر لو۔ میری طرف سے خدا حافظ۔"

"آپ کے سائے سے محروم ہوتے ہی ہم عتاب میں آ گئے ہیں۔" غزالہ نے ریسیور لیتے ہی بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ وہ بہت ضبط سے کام لے رہی تھی ورنہ وہ سلطان شاہ سے بہت محبت کرتی تھی اور اسے اپنے سگے بھائی کی طرح عزیز رکھتی تھی۔

"میری موجودگی میں اس سے بڑے بڑے بحران آتے رہے ہیں۔ کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ مقدرات کے کھیل ہوتے ہیں۔ جو قسمت میں لکھا ہوا ہے وہ ہر قیمت پر رونما ہو کر رہتا ہے۔ حوصلہ رکھو، وہ جلد ہی تم سے آ ملے گا۔" میں نے اسے تشفی دیتے ہوئے کہا۔

"میں سخت پریشان ہوں۔ آپ کی موجودگی سے دل کو ڈھارس رہتی تھی۔ یہ پورا گھر میری دلجوئی میں لگا رہتا ہے مگر آنسو مسلسل امڈے چلے آ رہے ہیں۔ گھنٹوں تو میں یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہی کہ میں یہاں نہ رکی ہوتی تو میرا کیا حشر ہوتا؟"

"خدا کے لیے، ایسی دلدوز باتیں نہ کرو کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہاری دلجوئی کے لیے واپس لوٹنے پر مجبور ہو جاؤں۔ اپنی اس روش سے تم اول خان اور اس کی بیوی کو پریشان کر دو گی۔"

"یہ میں بھی جانتی ہوں۔ ان کے سامنے میں خود کو بہت سنبھال کر رکھتی ہوں۔ میرے دل میں غبار بھرا ہوا ہے۔ آپ کی آواز سن کر میرا دل بھر آیا ہے۔ جی چاہ رہا ہے کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز اتنی رندھ گئی تھی کہ میں فقروں کے درمیان اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔

میں بے چین ہو گیا۔ دوسرے مسائل میں گھر کر میں اسے بالکل بھولا ہوا تھا۔ اس کی رقت انگیز آوازوں اور باتوں نے میرے دل کو بالکل موم کر دیا۔ میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "صبر اور ہمت سے کام لو۔ یہ کڑا وقت جلد ہی گزر جائے گا۔ تمہاری ان باتوں نے میرے دل میں احساسِ جرم سا جگا دیا ہے۔"

"میں نے آپ دونوں کی تھوڑی بہت باتیں سنی ہیں۔ یہاں سے جاتے ہوئے اول خان کے چہرے پر مردنی کے بجائے جوش کی سرخی جھلک رہی تھی، سلطان مل جائے گا نا؟"

"ضرور ملے گا۔" میں نے پورے وثوق اور اعتماد سے کہا "بس میں وقت کا تعین نہیں کر سکتا۔"

"اور آپ کیسے ہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ بھی پھولوں کی سیج پر نہیں سو رہے ہوں گے۔ وہاں بہت سی مشکلات نے آپ کو آن گھیرا ہے......"

میں نے نرمی سے اس کی بات کاٹ دی "ہماری فکر مت کرو۔ یہ ہوٹل کا فون ہے۔ ساری احتیاط کے باوجود اس پر غیر ملکی کالز کی تعداد غیر معمولی ہے۔ میں بعد میں باہر سے فون کروں گا تو دل کھول کر باتیں ہوں گی۔ فی الحال خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

اس نے میرے تحفظات کو فوراً بھانپ لیا۔ اس میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف خوبی یہی تھی کہ وہ بہت تیزی کے ساتھ خود کو ہر قسم کے حالات کے مطابق ڈھال لیتی تھی۔ اس کی آواز فوراً ہی خاصی ہموار ہو گئی اور اس نے وہ موضوع وہیں ختم کر دیا۔

وہ کہہ رہی تھی "آپ بھی میری فکر نہ کریں۔ میں آپ کی اگلی کال کا انتظار کروں گی۔"

میں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز بیوی کی دلگرفتگی کا تصور کرتے ہوئے محبت بھرے الفاظ کے ساتھ اسے الوداع کہا اور فون بند کر دیا۔

"واقعی ہماری انٹرنیشنل کالز بہت زیادہ ہو رہی ہیں۔" ویرا بولی۔

"یہ اس صورت میں ہے کہ بیشتر کالز پبلک بوتھ سے کی جا رہی ہیں۔"

"ہم ہرڈلز ریس کی سی سچویشن سے دوچار ہیں۔ دوڑ دوڑ کر رکاوٹ عبور کرو اور پھر دوڑ پڑو۔ ہماری کوئی کال غیر ضروری نہیں ہوتی۔ رکاوٹیں دور کرنے کے لیے ہمارے پاس باہمی رابطے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ اس سے کنارہ کشی بہت مشکل ہے۔"

"کراچی کی کالز آتی ہیں تو آنے دو مگر اب ہم ان سے بات کرنے کے لیے پبلک بوتھ ہی استعمال کریں گے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہارے اس فرمان کی تعمیل میرے بس سے باہر ہوگی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"یہ نہ بھولو کہ ہمارے پاسپورٹ پاکستانی ہیں اور آج کل ان کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ بہت زیادہ بین الاقوامی رابطوں پر ہوٹل کی انتظامیہ کو شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم بھی منشیات کے سوداگر ہیں جو یہاں بیٹھ کر فون پر کروڑوں کا لین دین کر رہے ہیں۔"

"تم ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہو۔" وہ تحیر زدہ ہو کر بولی "یہ کڑیاں اسی طرح ملائی جائیں گی۔ اگر ان لوگوں نے پولیس کو خبر کر دی یا ہماری باتیں مانیٹر کرنے کے لیے کسی اردو جاننے والے آپریٹر کو اپنے سوئچ بورڈ پر بٹھا دیا تو خاصی آفت آ سکتی ہے۔"

"تم مجھ سے بھی چار قدم آگے چلنے لگی ہو۔ کیا پتا کہ اس وقت بھی ہماری باتیں سننے کا سلسلہ جاری ہو۔ یہ خوف خاصا روح فرسا ہے۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "اب میں تمہارے فرمان پر حرف بحرف عمل کروں گی۔ ابھی تک حالات شاید نارمل ہیں۔ ہوٹل والوں کو ان فون کالز کا دھیان اس وقت آئے گا جب ہمارا بل ڈپازٹ رقم سے تجاوز کرنے لگے گا۔"

ناگزیر ضرورتوں کے لیے وہ فون ہر وقت ہماری دسترس میں تھا۔ محض ایک دوسرے کی خبر گیری اور شکوہ و شکایت کے لیے اس کا استعمال مناسب نہیں تھا۔

دو بجے ہم دونوں ایک ساتھ ہی ہوٹل سے نکلے۔ میں ایک مرتبہ پھر آئزک بنل سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنی چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہمارا باہر ہی کھانا کھانے کا پروگرام تھا۔ ٹھٹھہ سے اول خان کی واپسی تین چار بجے سے پہلے ممکن نہیں تھی جو کراچی میں رات کا وقت ہوتا۔ اس سے پہلے ہی ہمیں اپنے کمرے میں لوٹ آنا تھا تاکہ اول خان سے مختصر سی بات ہو سکے۔

ٹیلی فون بل اور ہماری جمع کرائی ہوئی رقم کے باہمی تعلق کے بارے میں ویرا کی کہی ہوئی بات میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ کاؤنٹر پر کمرے کی چابی جمع کرانے کے بعد میں نے سروس کاؤنٹر سے رجوع کیا تو پتا چلا کہ ہمارے حساب میں صرف بارہ پاؤنڈ باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے فوراً ہی مزید سو پاؤنڈ جمع کرا دیے تاکہ ہماری سہولتوں میں کوئی خلل نہ پڑ سکے۔

یہ دنیا بھر کے ہوٹلوں کا دستور ہے کہ کمروں میں فراہم کی جانے والی فون سروس کی ہر کال پر سروس چارجز اور دیگر مدوں میں سرکاری شرحوں سے کہیں زیادہ رقم وصول کر لی جاتی ہے جو ان کی اضافی آمدنی میں شامل ہو جاتی ہے۔

کاروباری یا سیاحتی دوروں پر نکلے ہوئے مسافر

ں مندی کے باعث ہر وقت سستے پبلک فونز سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بستر پر پڑے پڑے ادھر ادھر فون ملاتے رہتے ہیں۔ بل کی ادائیگی کا وقت آتا ہے تو ساری جزوی رقوم اس طرح گڈمڈ ہوتی ہیں کہ فون سروس پر موصول کی جانے والی اضافی رقم کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے مہمانوں کی موجودگی میں متعلقہ عملے سے پوچھ گچھ کرنے میں اجنبی مسافر سبکی محسوس کرتے ہیں اور کان دبا کر بل کی پوری رقم ادا ہوتی ہے کہ ان کے لکھے پر کم ہی لوگ سوال جواب کا حوصلہ کر پاتے ہیں۔ کوئی کٹر اصول پرست یہ ہمت کر ہی لے تو ایسے انداز میں وضاحتیں پیش کی جاتی ہیں کہ وہ خود شرمسار ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہوٹل سے قریب تر ایک ہی بوتھ تھا جہاں شور شرابے سے محفوظ رہ کر بیک وقت ایک جوڑا فون یا فون بوتھ سے مکمل استفادہ کر سکتا تھا۔

اس مرتبہ ویرا نے خوشامدانہ انداز میں میرے ساتھ بوتھ میں موجود رہنے کی فرمائش کی۔ شاید میں انکار کر دیتا لیکن قدرت ویرا پر مہربان تھی۔ بوتھ سے چند قدم پہلے ہی آسمان پر منڈلاتے ہوئے سیاہ بادلوں کے اشک ہائے ندامت ہلکی سی پھوار کی صورت میں برسنے لگے۔

سال کے تین سو پینسٹھ دن چمکتے ہوئے سورج کی بھرپور تمازت سے فیض یاب ہونے والی سرزمینوں پر جب بھی کبھار گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر برستی ہیں تو ہر شخص اس ہلکی اور تیز برسات سے لطف اندوز ہوتا ہے مگر انگلینڈ میں محض چند دن گزارنے کے بعد ہی سرمئی بادلوں اور مست گھٹاؤں کی نحوست سے انگریز کی بیزاری کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

سورج کی تیز اور براہ راست کرنوں کو ترستی ہوئی اس سرزمین کے مقدر پر آسمان ہر وقت روتا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ بالکل اس بوڑھی بیوی کی طرح جس کی جوان بیٹی اپنی دہلیز پر اجنبی قدموں کی چاپ کے طویل انتظار میں خود بھی اپنے بالوں میں چاندی کے تار گننے لگی ہو۔

آئزک بیل کے نمبر پر کئی گھنٹیاں بجیں تب کہیں ریسیور اٹھایا گیا۔

اس بار آواز مردانہ اور جانی پہچانی تھی۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ''صبح بخیر مسٹر بیل!''

اس نے الجھن آمیز لہجے میں جواب تو دیا لیکن میرے مہذب انداز کی وجہ سے وہ میری آواز نہ پہچان سکا اور پھر اسے سوال کرنا ہی پڑ گیا ''تم کون ہو؟ کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟''

''میں ڈینی ہوں۔ اگر تم مجھے بھول گئے ہو تو یہ تمہاری بڑی بدقسمتی ہے۔''

''اوہ...... ڈینی۔'' الفاظ چبا چبا کر کہا گیا ''کیا بات ہے۔ اس وقت تم شرافت اور شائستگی کے دائرے میں رہ کر بات کر رہے ہو۔ شاید تم پر کوئی برا وقت آیا ہوا ہے۔''

''یہ میری کال ہے اس وجہ سے اس کی ابتدا شائستگی سے ہوئی ہے۔ تم فون کرتے ہو تو تمہارے پاس گالیوں اور دھمکیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

اس کی ہلکی سی استہزائیہ ہنسی کی آواز ابھری ''تم اچھا طنز کر لیتے ہو۔ میری اسٹینو نے مجھے پوری تفصیل نہیں بتائی لیکن یہ ضرور بتایا تھا کہ صبح سویرے تم نے بہت گستاخانہ باتیں کی تھیں اور اس سے بدکلامی بھی کی تھی۔ شاید اس وقت تم نشے میں بہک رہے تھے اور اب تمہارا نشہ اتر چکا ہے۔ ایسے عالم میں تمہیں بار بار میرا خیال کیوں آرہا ہے۔''

''میں امریکا آرہا ہوں۔ سوچا کہ تمہیں پہلے سے خبر دے دوں۔ میں تمہیں کوئی دھمکی نہیں دوں گا۔ وہاں پہنچنے کے بعد بھرپور طریقے سے تمہیں اپنی موجودگی کا احساس دلاؤں گا۔''

''تم اب بھی اپنے ملک کی ماورائے قانونی قوتوں کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''کن قوتوں کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے انجان بن کر معصومانہ سا سوال کر ڈالا۔

''ان میں وہ گندی اسپیشل ٹاسک فورس سرفہرست ہے۔'' اس کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں نے کبھی کسی کے لیے کام نہیں کیا۔ میں اپنی تسکین اور شوق کی خاطر کھیلتا ہوں۔ جو جس کا حصہ ہوتا ہے وہ اسے دے دیتا ہوں۔''

''تم خود کو ضائع کر رہے ہو۔ پاکستان تمہیں بھ

کچھ نہیں دے سکے گا۔ ایک گرتے ہوئے مینار کو اپنے کندھے پر روکنے کی کوششیں کرنے والے بھی آخر کار اسی کے نیچے پس کر رہ جاتے ہیں۔"

وہ ایک متعصب اور دہشت گرد یہودی سرمایہ دار تھا۔ پاکستان کے لیے اس کی سوچ کبھی بھی سیدھی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں اسے کوئی سخت جواب دے سکتا تھا مگر اس کے فقروں میں موجود تحریص کو بھانپ کر میں نے اسی نرم آواز میں کہا "کبھی انتخاب کا کوئی موقع سامنے آیا تو میں اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔ فی الحال میں ہر طرح آسودہ اور مطمئن ہوں۔"

"کیا یہ بات تم پورے صدقِ دل سے کہہ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں آسودہ اور مطمئن نہ ہوتا تو تمہیں فون کیوں کرتا؟ مجھے وہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں تمہاری بات کے پہلے حصے کا ذکر کر رہا تھا۔ کسی پیشکش پر سوچنے کا امکان!"

"وہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ بہتر کی جستجو کس کو نہیں ہوتی؟"

"میرے لیے کام کرو۔ پاکستان میں مجھے باصلاحیت نوجوانوں کا نیٹ ورک قائم کرنا ہے۔ تم اس کے چیف ہوسکتے ہو۔ میں تمہیں منہ مانگی مراعات دوں گا...... تم کو تمہارے دشمنوں سے بھی پورا پورا تحفظ فراہم کیا جائے گا...... عالمگیر عزت اور شہرت تمہارے قدم چومے گی۔"

"تمہیں یہ خوف نہیں کہ میں پاکستان میں رہا تو تمہیں ڈبل کراس کرتا رہوں گا؟"

"ایسی حرکتیں زیادہ دیر تک نہیں چلتیں۔ ذمے داریاں سونپنے سے پہلے ہم تمہیں پگھلا کر تمہارے وجود میں ایک نیا ڈیٹی ڈھالیں گے جو ہمارا ہم نوا ہوگا اور کبھی ہم سے غداری نہیں کرے گا۔"

"برین واشنگ کرو گے۔" میں تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں تم سے اپنا سودا کرلوں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں جو ہوں وہی رہنا چاہوں گا۔ مواقع عمر بھر ملتے رہیں گے۔ میں نے خود کو ایک بار کہیں کھودیا تو میں دوبارہ خود کو دریافت نہیں کرسکوں گا۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ برین واشنگ اور تربیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ امریکا یا اسرائیل میں دو مہینے کی تربیت کے بعد تمہیں پاکستان میں پورا اختیار دے دیا جائے گا۔"

یکا یک میرے ذہن میں ایک تیز جھماکا ہوا اور اس کی باتوں کا اصل مفہوم میرے سامنے آگیا۔

رمیش اور بدری کو بھارت سے مستعار لے کر نک موڈلے ایسی ہی کسی تربیت کے لیے امریکا بھیج رہا تھا۔ اس نے بدری کی برین واشنگ کے لیے اس کے نیویارک پہنچنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ کراچی میں ہی اس کے ساتھ توہین اور تضحیک کا رویہ اختیار کرکے اسے اس کی بے وقعتی کا احساس دلانا شروع کردیا تھا تاکہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر خود کو محض نک کا غلام سمجھنے لگے۔

اس کی انا کو پوری طرح مسخ کرکے کچلنے کے بعد اس کے ذہن میں وہ لوگ اپنے پسندیدہ افکار اور نظریات جاگزیں کراتے اور آٹھ دس ہفتوں بعد جب وہ ایک نئے وجود میں ڈھل جاتا تو اسے پورے احترام سے پاکستان بھیج دیا جاتا جہاں ان کے گہرے مفادات تھے۔

نک موڈلے نے بدری ناتھ اور رمیش اگروال کا ذکر نہیں کیا تھا، آئزک بیل من دعن وہی پیشکش مجھے کر رہا تھا۔ نہیں ایک ملک کے لیے انہیں کتنے تربیت یافتہ دماغوں کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس کو بدری یا رمیش کا حوالہ نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے سرد اور سنجیدہ لہجے میں کہا "میری تربیت لینے کی عمر گزر چکی ہے۔ میرا تجربہ ہی میری تربیت ہے۔ میں تم کو بتا چکا ہوں کہ میں، میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"یہ میرا آفر ہے۔ ضروری نہیں کہ تم اسی وقت جواب دو۔ میرا فون نمبر تمہیں کسی طرح مل چکا ہے۔ میرے آفر پر خوب غور کرو اور جب رضامند ہو جاؤ تو اسی نمبر پر مجھے بتا دینا۔"

"رضامند ہونے کے بعد کیا میں تمہاری ان باتوں کو بھول جاؤں جو تم پہلے کرتے رہے ہو؟" میں نے تھوڑا سا پینترا بدل کر پوچھا۔

"کون سی باتیں؟" ریسیور میں اس کی ہلکی سی تحیر زدہ آواز ابھری۔

"وہی تمہاری پچھلی دھمکیاں...... تم مجھ سے اور میرے وطن سے راس المیڈا کے خون کا بھیانک انتقام لینے کی قسم کھائے بیٹھے ہو۔ یوم السبت پر تم کوٹ ادو کے قریب بجلی گھر کو تباہ نہیں کرواسکے لیکن تم نے اپنی طاقت کا علامتی مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں دھماکا کرادیا تھا......"

"بھول جاؤ، ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔" بے صبری سے اس نے میری بات کاٹ دی "ہم ماضی کو دفن کرکے نئے سفر پر نکلیں گے۔ دشمن کو مار ڈالنا دنیا کا سب سے آسان اور حیوانی کام ہے۔ دشمن کو اپنا دوست بنانا مشکل ترین کام ہے اور میں مشکل پسند ہوں۔"

"وہ بھی تمہاری باتیں تھیں یہ بھی تمہاری باتیں ہیں۔ میں کن پر اعتبار کروں؟"

"تم پراگندگی کا شکار ہو رہے ہو۔ ماضی کو بھول جاؤ۔ آج اور صرف آج کی بات کرو۔ آگے کی سوچو۔"

"میں آگے کی ہی سوچ رہا ہوں۔ دن گزر گیا تو آج کی باتیں بھی ماضی کا حصہ بن جائیں گی۔ اسرائیل یا امریکا میں میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گا...... کیا میں یہ نہ سمجھوں کہ لڑ کر مجھے زیر کرنے میں ناکام رہنے کے بعد تم مفاہمت اور بے حساب رعایتوں کا لالچ دے کر مجھے اپنے پنجرے میں گھیرنا چاہ رہے ہو تاکہ میری بوٹیاں ادھیڑ کر اپنے پچھلے زخموں کا قرض بے باق کرسکو۔"

"یہ تمہارے منطقی اندیشے ہیں۔ جب کوئی بہت بڑا دشمن اچانک مہربان ہونے لگے تو یقین نہیں آتا۔ ذہن میں ایسے ہی وسوسے آتے ہیں۔" اس کی آواز مفاہمانہ ہوگئی "میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ میرا دل صاف ہے۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تم بھی مجھ پر اعتبار کرو۔"

"اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، برابری سے بات کر رہے ہیں۔ میں نے تمہاری تجویز مان لی تو میں اپنا مقام کھو بیٹھوں گا۔ اسی لمحے تم میرے باس اور میں تمہارا ماتحت ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد ہم کبھی برابری سے گفتگو نہیں کرسکیں گے۔ جو تم چاہو گے، مجھے وہی کرنا

پڑے گا۔ میری نکیل ہاتھ میں آجانے کے بعد، تم مجھے جہنم میں بھی لے جاسکتے ہو۔"

"میں نیک نیت ہوں۔ میرا عمل ہی تمہارے اس خوف کو زائل کر سکے گا۔"

"اس سے پہلے تمہیں اپنی نیک نیتی کا کوئی ثبوت دینا ہوگا۔ اسی صورت میں، میں تمہارے دیے ہوئے آفر پر سنجیدگی سے غور کر سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"تم خود بتاؤ کہ میں یہ ثبوت کس طرح دے سکتا ہوں۔ میں اس پر عمل کروں گا۔"

"کراچی میں اپنے کسی اہم آدمی کے بارے میں بتاؤ۔ میں اس سے مل کر لوٹ آیا تو تم پر اعتبار کرلوں گا۔"

"تمہارے من میں کوئی کھوٹ ہوا اور تم نے اسے مار ڈالا تو کیا ہوگا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

میں ہنس پڑا "تم بالادست ہوتے ہوئے وسوسوں میں پڑ رہے ہو اور مجھے ان سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہو۔ میں رضامند ہو کر اپنی زندگی داؤ پر لگاؤں گا۔ تم اپنے ایک آدمی کی زندگی کا خطرہ مول لینے سے ڈر رہے ہو۔ اس طرح کبھی بھی بات نہیں بن سکے گی۔"

وہ ایک دم جیسے چونک کر بولا "میری نیک نیتی کے ثبوت کے طور پر تم اپنے آدمی کی رہائی کا مطالبہ پیش کرنے کی تیاری تو نہیں کر رہے۔"

میرا دل کنپٹیوں میں دھمکنے لگا۔ آخر کار بات اچانک اس موڑ پر آگئی تھی۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسا مکارانہ تجسس پوشیدہ تھا کہ میں نے سلطان شاہ کی آزادی کا مطالبہ کرنے کی شدید ترین خواہش کا گلا گھونٹ کر سرسری انداز میں کہا "اگر میرا کوئی قیدی تمہارے قبضے میں ہے تو اسے رہا کر کے بھی تم اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے سکتے ہو۔"

"اتنے بھولے اور معصوم نہ بنو!" اس کی آواز میں تلخی کا عنصر بڑھ گیا "اسی قیدی کے لیے تم نے مجھ سے رابطہ کیا ہے مگر کان کھول کر سن لو کہ تمہاری عملی رضامندی سے پہلے وہ سورج کی روشنی نہیں دیکھ سکے گا۔"

سلطان شاہ کے بارے میں اس نے کھل کر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے اس سے کوئی مطالبہ نہ کر کے اپنا بھرم رکھ لیا تھا۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ سلطان شاہ پر اسی مردود کے ہرکاروں نے ہاتھ ڈالا تھا اور وہ ان کی قید میں زندہ تھا۔

میں نے اسی بھرم کے سہارے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تم کس قیدی کی بات کر رہے ہو۔ میرا ہر اہم آدمی میرے رابطے میں ہے۔ اگر تم نے دھوکے میں کسی بے گناہ کی گردن میں پھندا ڈال دیا ہے تو میں اس بے چارے کی مغفرت کی امید ہی کر سکتا ہوں۔"

"میرے آدمی اتنے احمق نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے تمہارے اسی فلیٹ سے تمہارے ایک ساتھی کو اٹھایا ہے جہاں کا فون نمبر میرے پاس موجود ہے۔ تم جھوٹے ہو۔ تمہیں سب معلوم ہے۔"

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا "تم بلاوجہ چراغ پا ہو رہے ہو۔ یہ بھی بھول بیٹھے ہو کہ ابھی تم نے مجھے ایک آفر دیا تھا۔ میری بات کا یقین کرو کہ میں نے ایک ہفتے سے اس فلیٹ کی شکل نہیں دیکھی۔ وہاں بس ایک مسکین سا خانساماں رہ رہا ہے جو میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"اگر تمہاری بات سچ نکلی تو میں اپنے آدمیوں کی چمڑی گرا دوں گا۔"

"شاید تمہارے آدمی میری تلاش میں وہاں گئے ہوں گے اور جو نظر آیا اسے ڈینی سمجھ کر اٹھا لائے۔"

مفاہمت کی فضا ختم ہو گئی تھی۔ میں نے استہزائیہ لہجہ اختیار کرلیا۔

"انہیں معلوم ہے کہ وہ ڈینی نہیں، اس کا کوئی ساتھی ہے جو پورے فلیٹ پر قابض تھا۔"

"خانساماں سے پوچھ گچھ کرو۔ میرا بیان سچ نکلے تو اسے فوراً رہا کر دو۔ میری تلاش میں وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا نہ میں اسے بچانے کے لیے خود کو تمہاری غلامی میں دوں گا۔"

"اس کا فیصلہ امریکا میں ہی ہوگا۔" آئزک بیل کے ان سرد اور سفاکانہ الفاظ پر میں دہل گیا "پاکستان مجرموں اور تم جیسے دہشت گردوں کی جنت ہے۔ وہ ایک تابوت میں ڈال کر یہاں لایا جا رہا ہے۔ یہاں اس سے کڑی بازپرس ہوگی۔ مشین اس کا ہر جھوٹ پکڑ لے گی۔ وہ بے گناہ ہے تو چھوٹ جائے گا۔"

فضا میں رچی ہوئی سردی کے باوجود میری ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں۔ اس بار سلطان شاہ بہت خطرناک چنگل میں پھنسا تھا۔

میرے روکنے سے وہ اپنے فیصلوں پر عمل درآمد روکنے والا نہیں تھا۔ اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے سلطان شاہ کے بارے میں مصدقہ معلومات مل گئی تھیں۔ میں نے اس سے اپنی جذباتی لاتعلقی کا تاثر راسخ کرنے کے لیے دل پر پتھر رکھ کر جواب دیا "تم اسے چھوڑ دو یا کسی مشین میں پیس ڈالو، یہ تمہاری مرضی ہوگی۔ یہ اچھا ہوا کہ مجھے اس کے انجام کا پتا چل گیا۔ میں اس کے گھر والوں کی اشک شوئی کے لیے کچھ رقم دے دوں گا۔"

"میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "اس میں یہ اضافہ ہو چکا ہے کہ تمہارے رضامند ہونے پر تمہارے آدمی کو بھی رہا کر دیا جائے گا۔"

"وہ میرا آدمی نہیں ہے۔ تمہاری تلخ و ترش باتوں کے بعد اب تم پر بھروسا کرنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ تم کیسے منافق ہو کہ ایک طرف میری تلاش میں اپنے آدمی دوڑائے ہوئے ہیں اور دوسری طرف مجھے مل بیٹھنے کی سنہری پیشکش کر رہے ہو۔ تم ہرگز اعتبار کے قابل نہیں ہو۔"

"تم نے اس وقت فون کیا ہے۔ میرے آدمی ایک ہفتے پہلے تمہاری تلاش میں نکلے تھے ن میں میری منافقت کہاں سے آگئی۔ ویسے بھی کسی محاذ پر کمانڈر امن مذاکرات کرتے ہیں تو فوجیں فائر بندی نہیں کرلیتیں، جنگ میں اور زیادہ تیزی آجاتی ہے۔ ہر فریق کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ جنگ بندی کا معاہدہ ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کر کے اپنی پوزیشن مستحکم بنا لے۔"

"تمہارے یہ فلسفے تم ہی کو مبارک ہوں۔ میں تمہاری باتوں پر اعتماد نہیں کر سکتا۔" خواہش کے باوجود میں نے اس کے لیے سخت اور توہین آمیز کلمات استعمال

نہیں کئے۔

سلطان شاہ کے اسی کے قبضے میں ہونے کی تصدیق کے بعد اسے میرے اوپر نفسیاتی برتری حاصل ہو چکی تھی۔ اس نے کہا ”تو پھر میں قیدی کو کس امید پر زندہ رکھوں۔ اس کا مار دیا جانا ہی بہتر ہوگا۔“

”اس کا انجام تمہاری صوابدید پر ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔

اسی لمحے لائن پر ہلکی سی کوئی آواز ابھری۔ مجھے شبہ ہوا کہ میری کال کا منبع ٹریس کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی میں نے پھرتی سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے ابتدا سے ہی اسے یہ تاثر دیا تھا کہ میں کراچی سے اس سے بات کر رہا تھا۔ اگر اسے یہ علم ہو جاتا کہ کال کراچی کے بجائے لندن سے کی جا رہی ہے اور میں بدری کے ساتھ لندن میں موجود ہوں تو حالات ایک خطرناک کروٹ لے سکتے تھے۔

باہر بارش تیز ہو چکی تھی۔ قریب ترین سایہ بھی ہم سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ہم ٹیلی فون بوتھ ہی میں رک کر بارش تھمنے یا ہلکی ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

”سلطان شاہ کے بارے میں وہ کیا کہہ رہا تھا؟“ دیرا نے وہیں اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

”اسے آئزک بنیل کے آدمیوں نے ہی اغوا کیا ہے اور اب اسے ایک تابوت میں شاید مردہ ظاہر کر کے امریکا پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“ میں نے اداس لہجے میں کہا۔

”یہ اسرائیلی اور یہودی دہشت گردوں کا مخصوص طریقہ واردات ہے۔ وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں چوری چھپے وارد ہوتے ہیں اور اپنے مطلوبہ ملزم کو اغوا کر کے غیر قانونی طریقے سے اپنی سرزمین پر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بہت اندوہناک خبر ہے۔ پتا نہیں کراچی میں کیا ہو رہا ہے۔“

”اب سارا دارومدار اول خان اور اس کی ایس ٹی ایف پر ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا ”ان لوگوں کو غیر قانونی طریقے سے نکلنا ہوتا تو انہیں تابوت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لانچ وغیرہ کے ذریعے وہ کراچی سے فرار ہو کر قرب و جوار کے کسی امریکی بحری اڈے یا بیڑے تک پہنچ سکتے تھے۔ تابوت کا مطلب ہے کہ کراچی سے وہ فضائی سفر کریں گے تاکہ جلد از جلد امریکا پہنچ سکیں۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی لازمی ضرورت کی وجہ سے رمیش کی لاش کو یہاں سے نکال لے جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا گیا تھا۔ کیا پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے؟“

”ضرور ہوگا مگر میں اس کی فنی باریکیوں سے بے خبر ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”پھر وہ ایک زندہ آدمی کے تابوت کا قانونی جواز کہاں سے لائیں گے؟“

میرا ذہن الجھ گیا۔ دیرا کا اعتراض بہت معقول تھا۔ لاش کے کاغذات کے بغیر کوئی بھی ائر لائن ایک مشتبہ تابوت قبول..... کر کے خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی اور اگر وہ چوروں کی طرح نکلنا چاہ رہے تھے تو لمبے چوڑے تابوت کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ آئزک بنیل نے تم پر دباؤ ڈالنے کے لیے الجھا دینے والی ڈرامائی باتیں کی ہوں۔ وہ راس المیڈا کا جانشین ہے اور تم سے بات کر رہا تھا۔ ضروری نہیں کہ وہ شروع سے آخر تک سچ ہی بولتا رہا ہو۔ ہمیں اس کی باتوں پر زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔“

آئزک بنیل سے بات کرتے ہوئے ریسیور میں اس کی آواز اتنی واضح اور تیز آ رہی تھی کہ دیرا نے اپنا کان ریسیور کے قریب لا کر پوری باتیں سنی تھیں اس وجہ سے مجھے اس کو زیادہ بتانا نہیں پڑا۔

”تم نے اول خان کو ٹھٹھہ دوڑایا ہوا ہے ورنہ وقت برباد کرنے کے بجائے اسی وقت اس سے بات کی جا سکتی تھی۔“

تھوڑی دیر بعد دیرا نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ لوٹ آیا ہو۔“ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر کہا ”میں ابھی دیکھے لیتا ہوں۔ اب اسے بہت تیزی سے کام کرنا ہوگا۔“

میں نے بوتھ کے شیشے میں سے باہر نظر ڈالی۔ بارش بدستور تیز تھی مگر کاروبار زندگی قدرے سست رفتار کے ساتھ بدستور جاری تھا۔

میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے نیا فون کارڈ خرید لیا تھا۔ پرانے کارڈ سے نمبر ملانے پر یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ اول خان اسی وقت لوٹا تھا اور باتھ روم میں تھا۔

میں لائن ہولڈ کیے رہا۔ اسکرین پر یونٹ گھٹتے گھٹتے کارڈ بدلنے کی وارننگ بیپ کے ساتھ صفر نمودار ہوا۔ میں نے کارڈ تبدیل نہیں کیا۔ لائن منقطع ہو گئی۔

میں نے ناکارہ کارڈ چوبی ڈیسک پر ڈال کر نئے کارڈ کی مدد سے دوبارہ اول خان کے دفتر کا نمبر ملایا تو وہ موجود تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ پر جوش آواز میں اپنی کہانی سنانے لگا۔

”تم نے صحیح ٹھکانے کی نشان دہی کی تھی۔ اب سے دو گھنٹے پہلے تک سلطان شاہ اپنے اغوا کنندگان سمیت کھیتوں کے پیچھے ویرانے میں بنے ہوئے کریم ملاح کے اوطاق میں موجود تھا پھر دونوں گورے اپنے ٹرانسمیٹر پر کسی سے بات کرنے کے بعد سلطان شاہ کو لے کر اپنی لینڈ روور میں کسی نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے۔“

”گوروں کا ساتھ کس نے دیا تھا؟“ میں نے قہربار لہجے میں سوال کیا۔

”جمن اور کریم ملاح نے اعتراف کرنے کے ساتھ جعلی وردیاں بھی ہمارے حوالے کر دیں۔“

”ان کی کھالیں ادھیڑ ڈالو۔ یہ ان دونوں کا فن ہے۔ وہ پولیس کا کبھی مقابلہ نہیں کرتے۔ لے دے کر کام چلاتے ہیں۔ رنگے ہاتھوں دھر لیے جائیں تو ہر جرم تسلیم کر لیتے ہیں۔ انہوں نے تمہارے ساتھ بھی یہی چال چلی ہے۔ دونوں غدار اور نمک حرام ہیں۔ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جانا چاہیے۔“

”میں انہیں اوطاق سے اٹھا لایا ہوں۔ وہ قسمیں کھا رہے ہیں کہ انہیں گوروں کی نئی منزل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں وہ گورے جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے جا چکے ہیں۔“

”اگر وہ قسمیں کھا رہے ہیں تو پھر وہ لاعلم ہوں گے۔ یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ وہ گورے آئزک بنیل کے آدمی ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میری اس سے بات ہوئی تھی......“

”وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔“ وہ میری بات کاٹ کر بول پڑا ”اب جمن اور کریم کی خیر نہیں۔ وہ دونوں ساتھ نہ دیتے تو غیر ملکیوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود تمہارے فلیٹ کا رخ کرتے۔“

”اس سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ سلطان شاہ کو یہاں رکنے کے بجائے امریکا لے جایا جا رہا ہے تاکہ ہماری طرف سے مداخلت کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔“

”اس خبر کا ذریعہ کیا ہے؟“

”یہ سب باتیں آئزک بنیل سے ہوئی ہیں۔ وہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت سلطان شاہ کا روکا جانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک بار وہ اسے یہاں سے نکال لے گئے تو ہمیں اس کو چھڑانے میں دانتوں پسینہ آ جائے گا۔“

”میں امیگریشن حکام کو ہدایات جاری کرائے دیتا ہوں۔ غزالہ سے سلطان شاہ کی تصویریں مل جائیں گی۔ وہ اسے کسی بھی نام سے سفر پر نہیں لے جا سکیں گے۔“

”وہ اسے تابوت میں بند کر کے لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تابوت!“ اس کی تحیر زدہ آواز ہلکی سی چیخ سے مشابہ تھی ”زندہ آدمی کا تابوت؟“

”اس نے مجھے یہی بتایا ہے۔ باتیں بہت الجھی ہوئی ہیں مگر ان سے ہی کوئی راہ مل سکتی ہے۔“

”تم ایک ناممکن سی بات بتا رہے ہو۔ قانونی دستاویزات اگر گھپلے کے ذریعے بنوا بھی لی جائیں تو تابوت جہاز پر جانے سے قبل ڈاکٹر تصدیق کرتا ہے کہ تابوت میں صرف لاش ہے اور وہ بھی اسی شخص کی ہے جس کی تمام دستاویزات جمع کرائی گئی ہیں۔ پاکستان میں اب اتنا بھی اندھیرا نہیں ہے۔ کم از کم تابوت کے ذریعے وہ سلطان شاہ کو یہاں سے نہیں لے جا سکیں گے۔ یہ میری گارنٹی ہے۔“

”میں تمہیں صرف معلومات فراہم کر سکتا ہوں۔ فیصلہ تم خود کرو گے۔ یہ میری تازہ ترین معلومات کا نچوڑ

ہے جو میں نے تم تک پہنچا دیا ہے۔"

"اسے غائب ہوئے چالیس گھنٹے پورے ہونے والے ہیں۔ اگرچہ گھنٹے پہلے تک وہ ٹھٹھہ میں موجود تھا تو اب تک لے جایا جا چکا ہوگا یا سفر کی آخری تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ آج کا دن بہت اہم ہے۔ یہ گزر گیا تو پھر ہمیں امریکا میں ہی اسے تلاش کرنا پڑے گا۔"

"دن کی بات تم اپنے حساب سے کر رہے ہو۔ یہاں دن گزر چکا ہے۔ شام کے سات بجنے والے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہوں۔"

"اب میں فون بند کر رہا ہوں تاکہ تم ان اطلاعات پر اچھی طرح غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔ جو امکان ذہن میں آئے اس پر عمل کر گزرنا کیونکہ اب ساری اہمیت صرف وقت کی ہے۔"

"گڈ...... میں اسے بھی دیکھتا ہوں۔" اس کا وہ پُر جوش لہجہ خود کلامی کا سا تھا۔ فوراً ہی وہ تیز آواز میں بولا "ابھی ابھی مجھے ایک بات یاد آئی ہے۔ سہراب گوٹھ سے آگے ہیلی کاپٹر کے حادثے میں مرنے والے کچھ امریکی کمانڈوز کی لاشیں ضابطوں کی تکمیل کے لیے ابھی تک کراچی کے مردہ گھروں میں تھیں۔ انہیں لے جانے کے لیے امریکا کا ایک بڑا مال بردار طیارہ کل یا پرسوں کراچی آیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کی روانگی کا کیا شیڈول ہے۔ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ہوسکتا کہ ان اصلی تابوتوں کے ساتھ ہی وہ سلطان شاہ کا جعلی تابوت بھی نکال لے جانے کی کوشش کریں۔"

اول خان کی وہ آخری بات بہت زیادہ قرین قیاس تھی۔ میں نے کہا "بس یہی سب سے مضبوط اور محفوظ راستہ ہے۔ ساری توجہ اسی پر مرکوز کردو۔ وہ ٹرانسپورٹ طیارہ کسی فوجی ایئرپورٹ پر ہے یا کراچی ایئرپورٹ پر اتارا گیا ہے؟"

"مجھے تفصیلات کا بالکل علم نہیں۔ میں نے کہیں یہ ذکر سنا تھا۔ میں فوراً کام شروع کر رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے عجلت میں فون بند کردیا۔

امید اور نا امیدی کے سمندر میں بار بار ڈوبنے اور ابھرنے کے بعد آخر کار روشنی کی ایک کرن نظر آہی گئی تھی۔ اگر سلطان شاہ کے ستارے یاور تھے تو اسے پاکستان کی سرزمین پر روکنے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ باہر ہونے والی برسات ختم چکی تھی۔ میں بوتھ کا دروازہ کھول کر ویرا کے ساتھ باہر آگیا۔

"اول خان کیا کہہ رہا تھا؟" بوتھ سے باہر نکلتے ہی ویرا نے متجسسانہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور قدرے غصیلی آواز میں کہا "ماؤتھ پیس پر آنے والی آواز کافی تیز تھی۔ تم نے فون پر ہونے والی گفتگو سن لی ہوگی۔"

"لاشوں کی بین الاقوامی منتقلی کے لیے پاکستان میں بھی وہی قانون ہے جو برطانیہ میں نافذ ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سلطان شاہ کو بے ہوش کر کے کسی تابوت میں بند کردیں اور اسے پاکستان سے نکال لے جائیں!"

ویرا نے میرے لہجے پر کوئی اعتراض کیے بغیر فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"آدمی جرم کے ارتکاب پر کمربستہ ہوجائے تو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اپنے منصوبے پر عمل کر گزرتا ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے منصوبے کی کمزوریاں ظاہر ہوتی چلی جاتی ہے اور مکافاتِ عمل کے قانون کے تحت وہ کہیں نہ کہیں گرفت میں آجاتا ہے......"

ویرا نے میری بات اچک لی "مگر یہاں تو ساری اہمیت ہی وقت کی ہے۔ یہ وقت گزر گیا اور وہ لوگ سلطان شاہ کو کراچی سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوگئے تو امریکا کی سرزمین پر مکافاتِ عمل کا قانون ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہاں لے جانے کے بعد وہ اس کا حلیہ بگاڑ دیں گے۔"

ویرا کی حلیہ بگاڑنے والی بات پر مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے لیے سلطان شاہ کی ذرا بھی اہمیت نہیں تھی۔ انہوں نے اسے اغوا کرنے میں کامیابی حاصل کرہی لی تھی تو وہ اس کے ذریعے صرف اور صرف میرا کھوج نکالنا چاہتے تھے۔ وہ اس تازہ المیے کا تاریک ترین پہلو تھا۔

وقتی ضروریات اور مصلحتوں کے تحت میں سلطان شاہ اور غزالہ کو کراچی میں چھوڑ کر ایک طویل اور خطرناک سفر پر ضرور نکل کھڑا ہوا تھا مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں صورت حال کی نزاکت سے بے خبر رہے ہوں۔ ان دونوں کو اس مہم میں درپیش خطرات کا مکمل ترین ادراک تھا۔ سلطان شاہ ہوش وحواس کے عالم میں بھول کر بھی ایسا کوئی لفظ اپنی زبان سے ادا نہیں کرسکتا تھا جس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑتا۔

اسے اغوا کرنے والے میرے متلاشی تھے اور وہ میری نشان وہی سے گریزاں ہوتا تو اس کا نتیجہ صرف ایک ہی نکل سکتا تھا کہ سلطان شاہ اپنے اعصاب کی مکمل شکست وریخت تک اپنے اغوا کنندگان کے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنتا رہتا اور جب وہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا تو سچ بولنے پر مجبور ہوجاتا۔

اسے اغوا کرنے والوں کو اس سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ وہ اس کے ذریعے میرا سراغ لگانے کے خواہاں تھے۔ ان کے عزائم کی تکمیل کے لیے سلطان شاہ کا زندہ رہنا اور بے بسی کی آخری حدود تک پہنچنا ازبس ضروری تھا۔ اندر سے مجھے ایک اطمینان سا تھا کہ جو لوگ اسے زندہ رکھ کر ایک تابوت کے ذریعے پاکستان سے نکال لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھے، اسے مطلوبہ معلومات کی فراہمی تک ہلاک کرنے کی حماقت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ پاکستان میں رہتا یا وہاں سے نکال لیا جاتا، دونوں صورتوں میں اس کی زندگی کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا تھا اور میرے لیے امید کی وہی اکلوتی کرن تھی۔

"وہ سلطان شاہ کے ساتھ جو سلوک چاہیں کرلیں لیکن وہ کوئی بات نہیں اگلے گا۔" میں نے ویرا کی بات سن کر پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ آہنی اعصاب کا مالک ہے۔"

"میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔" ویرا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تشدد اور مار دھاڑ کے مقابلے میں شاید وہ چٹان ثابت ہو مگر صنف نازک کے مقابلے میں وہ بری طرح بکھر کر رہ جاتا ہے..."

"یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اور اس قدر ذاتی ہے کہ سلطان شاہ کے اغوا کنندگان کو اس کی بھنک بھی نہیں مل سکتی۔ کون سوچے گا کہ قیدی کی زبان کھلوانے کے لیے ٹارچر کے بجائے عورت کی منافقت زیادہ کارگر رہے گی۔"

"منافقت!" ویرا ایک دم بھڑک گئی "تمہاری دانست میں عورت بس منافقت ہی کرسکتی ہے۔ کیا تم اس فعل کے لیے شفقت کا لفظ استعمال نہیں کرسکتے تھے۔"

"اگر اس فعل کے مطلوبہ لوازم میری نظروں میں نہ ہوتے تو میں منافقت کے بجائے شفقت ہی نہیں، محبت کا لفظ بھی استعمال کرلیتا۔ اگر تم پوری بات پر غور کرو تو تمہیں یہ پورا فعل ہی بدفعلی محسوس ہوگا اور تم اپنا سر پیٹنے پر مجبور ہوجاؤ گی۔"

"تمہارے الفاظ اور لہجے کی تازگی سے محسوس ہو رہا ہے کہ تم نے سلطان شاہ کے اغوا کو معمول کا ایک واقعہ سمجھ لیا ہے۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم جل کر جو چاہو کہہ سکتی ہو مگر اس حادثے کی اہمیت کو کم نہیں کرسکتیں۔ سلطان شاہ مجھے تم سے زیادہ عزیز ہے اور میں اس کے لیے فکرمند ہوں۔"

"یعنی تمہیں میری ذرا بھی پروا نہیں ہے۔" اس نے آنکھیں نکال کر تیزی سے کہا۔ "صرف سلطان شاہ ہی تمہارا منظور نظر اور چہیتا ہے؟"

میں بے بسی سے ہنس پڑا "تم بہت عجیب اور پیچ دار مزاج کی مالک ہو۔ لمحہ بھر پہلے اس کے لیے مری جا رہی تھیں اور موازنے کا شبہ ہوتے ہی تمہارا دماغ پٹڑی سے اتر گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سلطان شاہ جتنا تمہارا چہیتا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ مجھے عزیز ہے۔ میں نے اسے تمہارے اوپر فوقیت نہیں دی تھی۔"

"مجھ سے ایسی گول مول باتیں مت کیا کرو جن کے دو معنی نکلتے ہوں۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں تمہاری طرح اہلِ زبان نہیں ہوں جو ان باریکیوں کو سمجھ سکوں۔"

وہ بلا کی مکار تھی۔ اردو بولنے اور سمجھنے کے معاملے میں وہ بڑے بڑوں کے کان کترتی تھی لیکن اس کی کج فہمی کا مسئلہ سامنے آیا تو ندامت کے اظہار کے بجائے اس نے جھٹ سے ایک نکتے کی آڑ لے لی۔ میں اسے کوئی تلخ جواب دیتا تو بحث طول پکڑ جاتی جبکہ اس وقت میں کسی بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔

میرے ذہن میں اس وقت صرف اور صرف سلطان شاہ کی فکر سوار تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اسے اغوا کر کے لے جانے والے مجھ تک پہنچنے سے پہلے اسے ہلاک نہیں کریں گے لیکن انسان کے لیے زندگی ہی سب کچھ نہیں۔ زندگی کے ساتھ صحت، عافیت اور جسمانی سلامتی بھی ضروری ہوتی ہے۔ ان کے تشدد کے نتیجے میں وہ عمر بھر کی کسی معذوری سے بھی دوچار ہوسکتا تھا۔

اس وقت یہی دعا اور امید کی جاسکتی تھی کہ سلطان شاہ کو اغوا کرنے والوں کی بو پر لگے ہوئے اول خان کو کامیابی حاصل ہو جائے اور... پاکستان کی سرزمین پر ہی اسے دشمنوں کی تحویل سے چھڑا لینے میں کامیاب ہو جائے۔

"کیا بات ہے؟ اچانک تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟" چلتے چلتے ویرا نے مجھے چھیڑا۔

"تم کٹ حجت ہو اس لیے خاموشی ہی زیادہ بہتر ہے۔" میں نے روکھا سا جواب دیا۔

"میں تمہاری یادداشت کے بارے میں سوچ رہی تھی!" اس نے پرخیال آواز میں کہا۔

"کیوں، کیا اب اس میں بھی کوئی نقص نکالنے کا ارادہ ہے؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

وہ دھیرے سے کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر بولی "یہ کام بعد میں کروں گی۔ فی الحال تو میں تمہاری یادداشت کی ایک خوبی پر غور کر رہی تھی۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہے کہ کسی کسی وقت تم میرے بارے میں اچھی باتیں بھی سوچ لیتی ہو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ایسی مبارک گھڑیاں کبھی کبھی ہی آتی ہیں۔"

"تمہیں شی اور منشیات کے دھندے کو خیرباد کہے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ اس دور میں تم ان گنت لوگوں سے کام لیتے تھے۔ حیرت ہے کہ تمہیں ان میں سے محسن کا نام کیسے یاد رہا؟"

"کچھ لوگوں کے ذہن دباؤ سے ماؤف ہو جاتے ہیں، بعض افراد دباؤ کے عالم میں بہترین ذہنی کارکردگی دکھاتے ہیں۔ میرا معاملہ بھی ایسا ہی سمجھ لو۔ مجھے اس کا نام سنتے ہی سب کچھ یاد نہیں آگیا تھا۔ بس ذہن میں تحریک چلی اور پھر اس کا شجرہ یاد آتا چلا گیا۔"

"اول خان کراچی میں بیٹھ کر اس کے بارے میں بے خبر تھا اور اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ یہ واقعی بڑی بات تھی کہ تمہیں یہاں تک یاد رہا کہ کریم ملاح سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر سے غائب تھا تو پھر اس کے ٹھکانے پر ہوسکتا ہے۔"

"سب کچھ رائگاں ہی گیا۔ سلطان شاہ ہاتھ آجاتا تو شاید میں بھی اپنی قلابازیوں پر فخر محسوس کرتا لیکن افسوس کے وقت ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یہی سب پانچ چھ گھنٹے پہلے رونما ہوا ہوتا تو بازی ہمارے ہاتھ میں ہوتی اور ہم اس وقت مایوسی اور بے بسی کا شکار نہ ہوئے ہوتے"

"مجھے ابھی بھی کامیابی کی امید ہے۔ اول خان ٹھٹھہ میں ان کی کمین گاہ تک پہنچ کر ان کا سراغ نکال لایا تو کراچی اس کا دیکھا بھالا شہر ہے۔ وہ ان تک پہنچ جائے گا۔"

"چالیس گھنٹے۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "چھ گھنٹے پہلے وہ ٹھٹھہ سے نکلے اس کا مطلب ہے کہ پورے ڈیڑھ دن تک سلطان شاہ کے ساتھ وہ دونوں گورے بھی اس پسماندہ مگر محفوظ علاقے میں روپوش رہے۔

وہ ایریئس پر کسی سے بات کرنے کے بعد وہاں سے نکلے...... یہ دل کو دہلا دینے والی حقیقت ہے ان کا آگے کا کوئی پروگرام طے ہو چکا تھا۔ اسی کے بعد وہ وہاں سے نکلے......"

ویرا نے میری بات کاٹ دی۔ "تمہارا یہ حساب کتاب میرا دوران خون تیز کر رہا ہے۔ شاید تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ان کے لیے کراچی میں کوئی محفوظ ٹھکانا ہوتا تو وہ ٹھٹھہ کی طرف دوڑ نہ لگاتے ...۔ کراچی میں ہم لوگوں کی

طرف سے کسی وار کے امکان نے انہیں خوف زدہ کیا ہوا تھا۔"

"یہ کھلے کھلے زمینی حقائق ہیں۔ ان کی طرف سے شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ وہ چھ گھنٹے پہلے لینڈ روور جیسی مضبوط گاڑی میں ٹھٹھہ سے نکلے تھے۔ وہاں سے کراچی تک کا سفر ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں ہے۔ کراچی میں انہیں ساڑھے چار گھنٹے مل چکے ہیں...... خدا کرے کہ اول خان کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ میرے دل میں انجانے وسوسے سر ابھار رہے ہیں۔"

"تمہاری طرح سوچا جائے تو مایوسی ہی نظر آتی ہے لیکن میں اب بھی پرامید ہوں۔ وہ درندے سلطان شاہ کو کراچی سے نہیں لے جاسکیں گے۔" اس کے الفاظ پر اعتماد تھے لیکن اس کے لب و لہجے میں بے یقینی کا عنصر نمودار ہو چکا تھا۔

اسی بارے میں اپنی مشترکہ الجھنوں پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

لندن میں آسمان پر اکثر و بیشتر گہرے بادل چھائے رہنے کی وجہ سے اجالے میں کمی بیشی کی بنا پر صبح اور شام کا تعین ممکن نہیں ہوتا۔ بس گھڑی دیکھ کر ہی ان اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں بھی ایسے دن خال خال ہی ہوتے ہیں جب سورج چمکتا ہوا نظر آتا ہے اور سدا اداس رہنے والے مقامیوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ دن بھی لندن کا روایتی دن تھا۔ ہم بوندا باندی کے دوران میں فون بوتھ میں پناہ لے کر اور آئزک بیل سے مذاکرات کا ایک دور مکمل کر کے واپس لوٹے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں شام کی طرف سفر کر رہی تھیں۔ میں نے راستے میں ہی سوچ لیا تھا کہ ویرا نے لندن کے بے مہار ماحول میں حسب معمول وہ شام مدہوشی میں گزارنے کا ارادہ کیا تو میں کسی بھی صورت میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب ویرا نے کاؤنٹر سے کمرے کی چابی لیتے ہوئے روم سروس کے ذریعے چائے کمرے میں بھجوانے کی فرمائش کی۔ وہ ایک بہت معمولی سی بات تھی لیکن ہم دونوں کی ذہنی حالت میں حیران کن یکسانیت کی نشاندہی کر رہی تھی۔

سلطان شاہ کے بارے میں ذہنی طور پر پوری طرح چاق و چوبند رہنے کے لیے ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی مشورہ کیے بغیر اپنے اپنے طور پر الکحل سے دور رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آج تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" راہداری میں، میں نے ویرا سے پوچھا۔

"تم کو میری طبیعت کی اتنی فکر کب سے لاحق ہو گئی؟" میری سنجیدگی پر وہ چونک پڑی۔

"شام ہو رہی ہے اور تم صرف چائے پینے کا ارادہ رکھتی ہو، یہ غیر معمولی بات ہے۔"

"میں بھی تمہاری طرح سلطان شاہ کے مسئلے پر دماغ لڑانا چاہتی ہوں۔" اس نے کمرے کے قفل کھولتے ہوئے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "ذہن کا صاف رہنا بہتر ہوگا۔"

میں جوتے اتار کر بستر پر دراز ہوا۔ ویرا نے ٹیلی وژن کھول دیا۔

حالات نے جس تیزی سے اچانک پلٹا کھایا تھا اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ کراچی سے لندن کی طرف پرواز کے آغاز میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لندن میں ہمارے چند روز تفکرات سے دور اور سیر و تفریح میں گزریں گے لیکن طیارے میں ہی سلیم اکبر خان نے اپنی مشکوک گفتگو سے میرے کان کھڑے کر دیے۔

غنیمت ہوا کہ اس کا قصہ بخیر و خوبی تمام ہوا اور وہ پاکستان میں اپنے انجام کو پہنچا۔ اسی طرح گیتا اور جیمز پنڈت کے دہرے قتل کا معاملہ جو ہماری تمام تر احتیاط اور پیچیدگی کے باوجود ہمارے گلے پڑتا نظر آرہا تھا، تیزی سے پس منظر میں چلا گیا تھا۔ رمیش کے قتل کو راوالوں نے اپنے گناہوں کی پردہ پوشی کے لیے خود ہی کڑی رازداری سے دبا دیا تھا۔

وہ کشت و خون کے سنگین ترین معاملات تھے جو قوانین اور ضابطوں کی بالادستی میں مکمل یقین رکھنے والی انگریز قوم کی سرزمین پر پیش آئے تھے۔ اگر قانون کے محافظوں کو ان وارداتوں کے بارے میں ذرا سا بھی سراغ

مل جاتا تو وہ اپنی ذہانت اور جفاکشی سے کام لے کر ہماری گردنیں ناپ سکتے تھے۔ اہم ترین اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ شہر کی انتظامیہ کی وسیع تشہیر اور ترغیب کے باوجود ہمیں پہچان لینے والے دونوں ٹیکسی ڈرائیوروں میں سے کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔

روایتی انگریز قانون اور اصولوں کا کٹر پابند ہی نہیں، ان کا محافظ بھی ہوتا ہے۔ رسمی تعارف کے بغیر کسی سے مخاطب ہونا خلاف تہذیب سمجھتا ہے۔ رات کے تین بجے وہ کسی ویران سڑک پر تنہا کار چلا رہا ہو تو سگنل کی سرخ بتی دیکھتے ہی خود کار انداز میں بریک لگا دیتا ہے۔ سڑک سنسان دیکھ کر نکلا چلا جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایسے ملک اور ماحول میں پے در پے جرائم کے ارتکاب کے بعد ہمارا بچ رہنا اس بات کی دلیل تھا کہ ستارے ہماری یاوری کر رہے تھے۔

دوسرے محاذ پر بدری ناتھ کو اپنے پیشہ ورانہ رقیب کی سازشوں سے اتنے ستھرے انداز میں نجات ملی تھی کہ وہ بے خوف و خطر ہو کر مجھ سے ملاقات کے لیے ہلٹن ہوٹل پہنچ گیا تھا اور اس سے حاصل کیے ہوئے فون نمبر کے ذریعے میں آئزک بیل سے براہ راست گفتگو کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

میری نگاہ میں یہ سب چھوٹی بڑی کامیابیاں تھیں جو ہم نے ایک اجنبی سرزمین پر صرف اور صرف اپنے زور بازو سے حاصل کی تھیں۔

صرف ایک بری خبر نے ہماری ان تمام کامیابیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ مجھے آئزک بیل کی وہ دھمکی اچھی طرح یاد تھی جو اس نے راس المیڈا کی موت کی خبر ملنے کے بعد مجھے ہذیان کے عالم میں دی تھی۔ اس نے راس المیڈا کو ایک مقدس ہستی قرار دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ہم نے اسے تو مار دیا تھا لیکن اس کے زرخرید مخبروں اور کارندوں کا جال پاکستان کی بنیادوں میں دیمک بن کر جم چکا تھا۔ اپنی اسی دھمکی کا وزن ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے مقرر کیے ہوئے دن پر کوٹ ادو کے تھرمل پاور اسٹیشن پر دھماکا کرایا تھا۔

اس وقت اول خان نے اپنی کاوشوں سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ عالمی ذرائع ابلاغ میں فوری جگہ پانے والے اس معمولی دھماکے کے پیچھے کسی منظم گروہ کا ہاتھ نہیں تھا۔ وہ ایک عیسائی راہب کے ایسے بیٹے کی انفرادی حرکت تھی جو نیویارک میں ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہونے کے بعد شی کے ہرکاروں کی مدد سے پاکستان واپس پہنچا تھا۔ اسے دھمکی دی گئی تھی کہ مذکورہ دھماکہ نہ ہونے کی صورت میں امریکی اداروں میں اس کی مخبری کر دی جائے گی اور پھر اسے تحویل مجرمین کے معاہدے کے تحت امریکا لا کر سنگین سزا سنا دی جائے گی۔

اس دھماکے کے پیچھے کارفرما عوامل سامنے آنے کے بعد میں نے آئزک بیل کی دھمکی کو نظر انداز کر دیا تھا مگر اب سلطان شاہ کے اغوا کے واقعے نے میری تشویش میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

راس المیڈا اور جمی لائیڈ کی خون آشام دشمنی میرے سامنے تھی۔ راس المیڈا ارب پتی اور ڈیوڈا اسٹار کا بانی سربراہ ہونے کے باوجود امریکا میں ہیروئن کی غیر قانونی تجارت پر شی کے ذریعے قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس طرح وہ ہیروئن کی تجارت سے حاصل ہونے والی بے اندازہ رقوم کے ساتھ امریکی حکومت سے شی کو ہیروئن کے انسداد کے لیے ملنے والی دولت بھی ڈیوڈا اسٹارز کی عالمی طاقت میں اضافے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔

اس نے امریکی انتخابات میں یہودی ووٹوں کی اہمیت کے بل پر صدر اور صدارتی امیدوار کو اپنی حمایت پر مجبور کر دیا۔ جمی لائیڈ ایک نادیدہ قاتل کی گولی کا نشانہ بن گیا اور یوں راس المیڈا نے اپنے ایک آدمی کو شی کی سربراہی پر مامور کر دیا۔ وہ راس المیڈا کا ایک خواب تھا۔ ڈیوڈا اسٹارز اور شی کی سربراہی کے بعد وہ تنظیموں کے جملہ وسائل پر قابض تھا۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں اس کے سر پر مجھے زیر کرنے اور پاکستان کے اردگرد کی ہیروئن کی پیداواری منڈیوں پر قبضہ جمانے کا ایسا جنون سوار ہوا کہ وہ دوسرے کاموں پر شاید... بھرپور توجہ نہ دے سکا اور آخرکار کراچی کے ایک ویرانے میں بے بسی کی موت مارا گیا۔

وہ ذہنی فوبیا کے نفسیاتی مرض کا شکار تھا مگر اس کا جانشین اپنے پیش رو سے کہیں زیادہ چالاک اور مکار تھا۔ اس نے براہ راست مجھ سے ٹکرانے کے بجائے شی سے تعلق رکھنے والوں کو قابو میں رکھنے کا مشن شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں پہلے اس نے عیسائی راہب کے بیٹے کو اپنا آلہ کار بنا کر کوٹ ادو کے تھرمل بجلی گھر میں دھماکا کروایا اور اب جمن کے ذریعے سلطان شاہ کو اغوا کرالیا تھا۔

مشرقی اور ترقی پذیر ملکوں میں کمپیوٹر اس وقت تک بہت عام نہیں ہوا تھا مگر مغرب میں زندگی کا ہر شعبہ اس ٹیکنالوجی سے استفادہ کر رہا تھا۔ ان میں مجرموں کے منظم گروہ بھی شامل تھے شاید جمی لائیڈ نے بھی اپنے لیے کام کرنے والے لوگوں کے کوائف ایسے ہی کسی نظام پر محفوظ کر لیے تھے۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں رہا ہوگا کہ اس کے ذلت آمیز قتل کے بعد وہ سارا مواد اس کے خون کے پیاسوں کے کام آئے گا۔

راس المیڈا اپنے دشمن کے چھوڑے ہوئے ورثے پر دھیان نہیں دے سکا مگر آئزک بیل نے اپنے کام کی ابتدا ہی اس اثاثے سے کی تھی اور شاید پاکستان میں مقیم ہر اس چھوٹے اور بڑے آدمی کے کوائف سے واقف ہو چکا تھا۔ جس نے کبھی بھی جمی لائیڈ کی شی کے لیے کوئی قابل ذکر کام کیا تھا۔

یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ میرے بارے میں خود جمی لائیڈ کو بھی کبھی بھرپور معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ اس کا سہرا ویرا کے سر تھا جو اپنے خود ساختہ باپ کی جانب سے اس علاقے کی بلیک کوئن اور میری باس تھی۔ میں اپنی جملہ کارگزاریوں کی رپورٹ اسے دیتا تھا اور وہ اس سمیت میرے درجے کے لوگوں کے بارے میں اپنی رپورٹ سپر آئی مین یعنی جمی لائیڈ کو بھیجتی تھی۔

میں ابتدا ہی سے اپنی کارکردگی کی بنا پر اس کی نظر کرم کا مستحق قرار پا چکا تھا۔ اس وجہ سے شاید وہ میرے بارے میں ہمیشہ تشنہ اور ادھوری معلومات آگے بڑھاتی تھی اور اس کمی کو میری کارکردگی کی داد و تحسین سے پورا کر لیتی تھی۔

جمن اور کریم ملاح کے نام سامنے آجانے کے بعد ماضی کے حوالے سے وہ سب میرے ذہن کے ہولناک اندیشے تھے جو غلط بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ اگر وہ درست تھے تو پاکستان میں آئزک بیل واقعی ایک تشویش ناک صورت حال پیدا کرنے کی پوزیشن میں آچکا تھا۔

جمی لائیڈ کے زمانے کی شی کے آزمودہ کارکنوں کی ایک قابل ذکر تعداد کو اپنا مطیع بنا لینے کے بعد وہ کوئی بھی تباہی پھیلا سکتا تھا۔ جس میں ہم لوگوں کے لیے ذاتی خطرات بھی پنہاں ہوتے۔ آئزک بیل کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سلطان شاہ کے اغوا کے لیے کراچی کے امریکی قونصل خانے میں بیٹھے ہوئے سی آئی اے ایجنٹ نک موڈی پر ذرا بھی انحصار نہیں کیا تھا جبکہ نک موڈی... شاید اسی کے عزائم کی تکمیل کے لیے را کے ایجنٹوں کو بھارت سے غیر قانونی طور پر آنے کے بعد امریکا بھیجنے کی کارروائی میں پورے خلوص نیت سے منہمک تھا۔

نک موڈی کو بری طرح نظر انداز کر کے اس نے بالا ہی بالا اپنے اعتماد کے دو خاص آدمیوں کو کراچی بھیجا، ان اجنبیوں نے جمن جیسے چھوٹے اور مقامی منشیات فروش سے رابطہ کیا اور پھر کریم ملاح کی مدد سے سلطان شاہ کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ان قیاسات میں ایک بنیادی جھول تھا۔ جمن کوئی سکہ بند اور بڑا منشیات فروش نہیں تھا جس کے بارے میں زیر زمین دنیا کا ہر کس و ناکس پوری طرح باخبر رہنے کی کوشش کرتا ہو۔ اس دھندے میں اس نے جو کچھ کمایا، بے دردی سے خرچ کرتا رہا اور جب شی پاکستان سے بستر بوریا سمیٹنے پر مجبور ہوئی تو وہ متمول حیثیت کا مالک نہیں تھا۔ بعد میں وہ خود بھی ہیروئن کی لت میں مبتلا ہو کر برے حال کو پہنچ گیا۔ علاج معالجے سے اس کی بدعادت تو چھوٹ گئی مگر مالی طور پر وہ نہ پنپ سکا۔

اگر جمی لائیڈ کسی کمپیوٹر ڈیٹا بیس پر اپنے عالمگیر کارندوں کے کوائف جمع کرتا تھا تو اس میں جمن کا برسوں پرانا پتا ہی ہوتا۔ نہ جانے اس نے کتنے ٹھکانے بدلے ہوں گے۔ کراچی جیسے بھرے پرے شہر میں امریکا سے آئے ہوئے دو افراد کا ایسے گمنام اور قدرے بے وقعت

شخص تک پہنچ جانا تعجب انگیز تھا۔

میں ہمیشہ سے خود تنقیدی کا عادی تھا۔ دوسروں کو کسی بھی بحث میں مات دینے کے بعد بھی اپنی کہی ہوئی باتوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ اسی عادت کی وجہ سے وہ جھول میرے ذہن میں کھٹکتا رہا پھر میں نے خود ہی اس کا ایک جواز بھی تلاش کرلیا۔

آئزک بنل نے فون پر مجھے خود بتایا تھا کہ اس کے آدمی ایک ہفتے پہلے امریکا سے میری تلاش میں نکلے تھے۔ نیویارک سے کراچی تک کا سفر وقت کے خسارے سمیت آسانی سے ڈیڑھ دو دن میں مکمل کیا جاسکتا تھا، اس میں کسی پڑاؤ پر مختصر سا قیام بھی شامل تھا۔ اس طرح ان کے پاس سلطان شاہ تک رسائی کے لیے جمن کو تلاش کرنے کا کافی وقت تھا۔

معاً مجھے ایک پرہول خیال آیا اور میں مضطرب ہوکر بستر سے اٹھ گیا۔

ویرا ٹیلی وژن دیکھنے کے ساتھ کن انکھوں سے مجھے بھی دیکھ رہی تھی اور میں اس کی اس حرکت سے بے خبر نہیں تھا۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی چائے کی پیالی اٹھا کر اضطراری انداز میں ہونٹوں سے لگائی تو وہ بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ باقاعدہ میری طرف متوجہ ہوگئی۔

''اس قدر بوکھلا کر اور اچانک بستر سے اٹھے ہو جیسے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے ہوں۔'' اس نے میری کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے لطیف لہجے میں کہا۔

''مجھے اچانک جہانگیر کا خیال آگیا ہے۔'' میں نے اس کے تبصرے کی تردید کیے بغیر کہا۔

''اس وقت اس کا خیال آنے کی کیا تک ہے۔ غزالہ کا خیال آتا تو کوئی بات تھی۔''

''اگر وہ لوگ جمن جیسے گوشہ نشین آدمی تک پہنچ سکتے ہیں تو جہانگیر ہر وقت ان کی دسترس میں ہے۔ وہ اس قدر احمق ہے کہ ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بچ نہیں سکے گا۔''

''تم نے جمن سے اچانک جہانگیر پر کیوں چھلانگ لگادی؟ کیا صرف اس لیے کہ ان دونوں کے نام ج سے شروع ہوتے ہیں؟'' اس نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میرا ذہن اس حد تک بھی نہیں پڑھ سکتی تھی کہ میرے دل کا ہر وسوسہ بھانپ لے۔ میں نے اختصار کے ساتھ اسے اپنے تازہ ترین خدشات سے آگاہ کرڈالا۔

وہ خاموشی اور تحمل سے میری باتیں سنتی رہی پھر میرے خاموش ہونے پر کہنے لگی۔ ''امریکا میں واقعی ہر طرف کمپیوٹر کا جنون پھیلا ہوا ہے۔ بڑے اور معزز مجرم اپنی غیر قانونی آمدنیوں کا حساب رکھنے کے لیے صرف کمپیوٹر پر بھروسا کرتے ہیں مگر تمہاری یہ باتیں جمی لائیڈ کی شی پر صادق نہیں آتیں۔''

اسے خاموش پاکر مجھے سوال کرنا پڑا ''کیوں؟ اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔''

''سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جمی لائیڈ کی بچی ہوں اور اپنے باپ کی فطرت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ ایسے معاملات میں مشینوں سے زیادہ اپنے دماغ پر انحصار کرنے والا آدمی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ڈیوڈ اسٹارز یہ سب کرتے ہوں اور شی پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں بھی یہ طریقہ رائج کردیں۔''

''پھر اس مہم کی تکمیل کے لیے جمن اور کریم ملاح کا ہی انتخاب کیوں کیا گیا؟''

''اتفاق!'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''جمن کام سے ٹوٹا ہوا ایک ننگا بھوکا مجرم ہے اور انہیں ایسے کام ہی کے آدمی کی ضرورت تھی۔ اڈوں پر محفلیں جمانے والے ایسی باتوں سے باخبر رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے دونوں فریق یکجا ہوگئے۔ یہ اعتراض تو تم ہر نام پر کرسکتے تھے۔''

''ہر نام اور ان ناموں میں بڑا فرق ہے۔ کوٹ ادو کے بجلی گھر میں دھماکا کرنے اور سلطان شاہ کے اغوا میں مدد دینے والوں میں تین چیزیں مشترک ہیں۔ ہیروئن فروشی، شی سے پرانا تعلق اور آئزک بنل سے حالیہ رابطہ...... میں انہیں اتفاق نہیں مان سکتا۔ یہ مشترک خصوصیات ایک بڑے خطرے کی نشان دہی کررہی ہیں۔ پاکستان میں تم کو صرف میں جواب دہ تھا یا میرے تین ساتھی۔ ان میں سے نادر اور داؤد مارے گئے۔ اب صرف جہانگیر زندہ ہے۔ سلطان شاہ کے بعد اس کی باری بھی

سکتی ہے۔''

''اس کی بیوی بہت چالاک اور سمجھ دار عورت ہے۔'' ویرا نے بے ساختہ کہا۔ ''اگر وہ بیوی کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھے تو سلمیٰ کے مشورے اسے بہت سی پریشانیوں سے بچالیں گے۔''

ٹیلی وژن اناؤنسر کی زبان سے ساؤتھ آل کے دہرے قتل کا ذکر سنتے ہی میں پلٹ کر اسکرین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوگیا اور سلمیٰ کا ذکر شروع ہوتے ہی ختم ہوگیا۔

پتا چلا کہ اسکرین پر خبریں آرہی تھیں۔ ان لوگوں نے ابلاغ کے ذرائع کو حقیقی معنوں میں استعمال کرنا سیکھا تھا۔ کھیل کود...، تفریحات..... فلموں اور دیگر پروگراموں کے درمیان خصوصی دورانیے کے مستقل خبر نامے ہر شخص کو پل پل کی بدلتی ہوئی صورت حال سے باخبر رکھتے تھے۔

گیتا اور جیمز پنڈت کے دہرے قتل کے بارے میں سراغ رساں خود کو ایک بند گلی میں محسوس کررہے تھے جس کے پیچھے گیتا اور اس کے ساتھی کو اومیز ریستوران میں وہاں سے گھر لے جانے والا ٹیکسی ڈرائیور موجود تھا۔ شہر میں صرف وہی قاتل کی نشان دہی کرسکتا تھا اور وہ خود غائب تھا۔

ان لوگوں کو اس ٹیکسی ڈرائیور کی ہوا بھی نہیں لگ سکی تھی جس کی ٹیکسی میں ویرا نے ہم دونوں کا پیچھا کیا تھا اور وہ اپنے محاسبے کے خوف سے دبکا ہوا تھا۔

خبر کے درمیان میں تبصرے کے لیے ایک افسر کو پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ وقت کے ساتھ انگلینڈ میں نسلی اور معاشرتی جرائم کی رفتار ضرور بڑھ رہی ہے مگر مجموعی طور پر اس ملک کے قدیم باشندے قانون کی بھرپور پاسداری کرتے ہیں البتہ دنیا بھر کے مختلف معاشروں سے بہتر مستقبل کے لیے ہجرت کرکے آنے والوں کے رویے کا بیشتر انحصار ان کے متروک معاشروں کی اقدار سے ہوتا ہے۔

اس کا تبصرہ طویل اور تعصب آمیز تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ باہر سے آئے ہوئے مرد و زن جب مقامیوں سے شادی کرتے ہیں تو مخلوط نسل کے ایسے بچے جنم لیتے ہیں جن کی بنیادیں بہت مضبوط نہیں ہوتیں۔ مقامیوں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں، ہم نسلوں میں برتری منوانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور یہ تضاد انہیں قانون کی مکمل پاسداری سے قدرے دور لے جاتا ہے۔

غالباً دہرے قتل کا واحد گواہ بھی جیمز پنڈت کی طرح کا کوئی اینگلو انڈین رہا ہوگا جو مخبری کو ہتک آمیز تصور کرتا ہے۔ اسی لیے سامنے آنے سے گریزاں ہے۔

وہ تبصرہ سن کر میرا دل خوش ہوگیا۔ ایسے معاملات میں قوموں کی تضحیک کا مقصد صرف حکومتوں کی تضحیک ہوتا ہے اور تبصرے میں اینگلو انڈین طبقے پر تنقید کرکے بھارتی حکومت کو لتاڑا گیا تھا جو لندن میں میسر سفارتی مراعات کی آڑ میں را کی ایجنسی چلارہی تھی۔

اس تبصرے کی دوسری خوبی یہ تھی کہ اس کے لفظ لفظ سے کیس کے تفتیشی حکام کی ناکامی اور مایوسی کا اظہار ہورہا تھا۔ ان کی .... سرگرمیوں کا جو نچوڑ پیش کیا جاتا رہا تھا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کسی مناسب شہادت کی دستیابی تک وہ کیس عارضی طور پر داخل دفتر کردیا جائے گا۔

مجھے ٹیلی وژن کی طرف متوجہ پاکر ویرا نے صرف اتنی دیر صبر کیا کہ ساؤتھ آل والے واقعے کا ذکر مکمل ہوجائے۔ دوسری خبر شروع ہوتے ہی اس نے ٹیلی وژن بند کردیا۔

''خود اتنی دیر سے پروگرام دیکھنے میں منہمک تھیں۔ میں نے ذرا سی دلچسپی لی تو فوراً ٹیلی وژن بند کردیا۔'' میں نے چائے کی پیالی خالی کرکے احتجاج کیا۔

''مجھ سے باتیں کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب ہمیں سلطان شاہ کے لیے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے اپنے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

''یہاں بیٹھ کر ہم بے بسی سے انتظار کرنے اور اپنے ذہنوں کو تھکانے کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ جو کچھ کرسکتا ہے، وہ پہلے ہی اپنے ہر آرام کو تج کر سایوں کے پیچھے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔''

''پتا نہیں اب اس کا فون کس وقت آئے گا۔'' وہ بڑبڑائی......'' اس کی اہم رپورٹ کے انتظار میں ہمیں یہیں جم کر بیٹھنا پڑے گا۔''

''اگر تم کو سیر وتفریح کے لیے کہیں جانا ہو تو تم بے فکر ہو کر نکل جاؤ۔ انتظار کا کارِ خیر میں سرانجام دے لوں گا۔'' میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''اس وقت کسی کو بھی سیر وتفریح کی سوجھ سکتی ہے؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''بقول تمہارے تم دیرا ہو۔ تمہارے بارے میں کسی بھی وقت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ تم پر قنوطیت طاری ہو تو تم کسی بے گناہ چوزے کے روندے جانے پر پورے خلوص اور انہماک سے آنسو بہا سکتی ہو۔ طبیعت پر خوں ریزی سوار ہو تو ایک جیتے جاگتے انسان کی گردن توڑ کر بھی جشن منا سکتی ہو۔''

''تم مجھ پر طنز کررہے ہو یا میں تمہارے ان الفاظ کو اپنی تعریف سمجھوں؟''

''آدمی اپنے بارے میں خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں...... سے کام لیتا رہے تو سدا سکھی رہتا ہے۔ ماسٹر رابرٹ ہوٹل میں قیام کے دوران میں تمہارے ارادے خطرناک تھے۔ کیا پتا تم نے وہاں رہتے ہوئے کسی سے دوستی استوار کرہی لی ہو۔''

وہ خوش ہو کر ہنس پڑی ''اس کا مطلب ہے کہ دوسرے مردوں سے دوستی کے بارے میں میری باتیں تمہاری کھوپڑی میں ابھی تک جمی ہوئی ہیں اور تم ان کے بارے میں سوچ سوچ کر جل رہے ہو۔''

''مجھے جلنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم ایک آزاد اور خود مختار لڑکی ہو، جو چاہو کرسکتی ہو۔ اس سرزمین پر تو والدین بھی اپنی بالغ اولاد کی ناشائستہ سرگرمیوں پر کوئی جبری قدغن عاید کرنے کے قانونی حق سے محروم ہیں۔ میں تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔''

اسے فوراً ہی ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا۔ ''ایک زمانے میں ایسی مہم جوئیوں میں مجھے لطف آتا تھا مگر اب ان سب کاموں سے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ ویسے یہاں بیٹھ کر تم نے بہت نازک مسئلہ اٹھایا ہے۔ کم وبیش پورے ایشیا میں ہی اخلاقی اور قانونی پابندیاں ہونے کے باوجود مرد کی بے راہ روی کو نظر انداز ہی نہیں بلکہ قبول بھی کرلیا جاتا ہے لیکن عورت کی کج روی کو عزت وغیرت کا معاملہ تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تمہارے سندھ میں ہی کاروکاری کے سفاکانہ قبائلی قانون کے تحت ہر سال سیکڑوں خون ہوجاتے ہیں اور کسی بھی مجرم کو آج تک شاید قابلِ ذکر سزا نہیں سنائی جاسکی......''

''ہم برطانیہ میں بیٹھے ہیں۔'' میں نے پہلو بدل کر اس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو یہ سرزمین بے آئین ہے۔ یہاں ہر رسم ورواج کو آئینی تقدس حاصل ہے اور سارے قوانین ان ہی قدیم روایات کی روشنی میں بنائے گئے ہیں۔ اگر بعض علاقوں میں ایسی ہی کچھ سخت رسوم پائی جاتی ہیں تو تم ان پر حرف گیری نہیں کرسکتیں۔ ہر خطے کو اپنی روایات کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ کاروکاری، جبری مشقت کے بیگار کیمپ، نجی جیل خانے، ذاتی لشکر، منشیات نوشی سے... بدترین پرہیز مگر منشیات سازی اور منشیات فروشی میں بھرپور.... دلچسپی لینا تمہارے بعض علاقوں کے ماضی کا قابلِ احترام ورثہ ہوں۔ میں ان میں سے کسی رسم ورواج پر معترض نہیں ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ایسے علاقوں سے یورپ اور برطانیہ میں آباد ہونے والے جوڑے جب اپنی جوان لڑکیوں کو اجنبی بوائے فرینڈ کے ساتھ شیر وشکر ہوتے دیکھتے ہوں تو ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟''

''گرم خون اور پیش بین نظریں رکھنے والے اس برے وقت سے بچنے کے لیے بلوغت سے پہلے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کردیتے ہیں یا پھر انہیں واپس اپنے موروثی حصار میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ سنگین مرحلہ ان لوگوں کو پیش آتا ہے جو آزاد خیالی اور اولاد کی فرماں برداری کے زعم میں اپنے لیے چیلنج پیدا کرلیتے ہیں یا وطن میں ہر رشتے سے اپنا تعلق توڑ چکے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی۔ انہیں بس ایک فائدہ ہوتا ہے کہ ان کی لڑکیوں کے کرتوت اپنے رشتے داروں کی نظروں سے چھپے رہتے ہیں۔ پردیس کی روسیاہی کو مالی آسودگی کا نقاب پوری طرح چھپا لیتا ہے۔''

''کیا یہ ایک اہم مسئلہ نہیں ہے؟ اس کے حل کی ضرورت نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں تلخی سے ہنس پڑا۔ ''ہجرت معاشی ہو یا سیاسی اور نسلی...... اپنی کوکھ میں ہمیشہ سنگین انسانی المیے اور دردناک مسائل لے کر وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ دانش مندی سے کام لیا جائے تو یہ مسائل جلد حل ہوجاتے ہیں ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ مسائل حل ہو ہی جاتے ہیں۔''

''حل ہوجاتے ہیں یا دب جاتے ہیں؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''تم یہ بھی پوچھ سکتی تھیں کہ کیا دبا دیے جاتے ہیں۔ بات سیدھی سی ہے۔ دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں تو ان کی بپھری ہوئی، جھاگ اڑاتی موجیں پتھروں اور چٹانوں کو اپنے ساتھ خس وخاشاک کی طرح بہا لے جاتی ہیں۔ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو تہس نہس کر دیتی ہیں۔ بلندیوں پر بند باندھ لیا جائے تو ان کی سرکش موجوں کو بلندیوں پر ہی کسی جھیل کے سکون میں ڈبویا جاسکتا ہے ورنہ میدانی ڈیلٹا میں پہنچنے تک ہر دریا کو آخرکار قرار ہی آجاتا ہے۔ اس کی لہریں چٹان تو کیا، ساتھ آئی ہوئی ریت اور مٹی کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جانے کی قوت نہیں رکھتیں۔ یہ سفر کی منزلوں کا ایک فطری اصول ہے۔''

''شاید تم کوئی بہت اونچا فلسفہ بگھارنے کی کوشش کررہے ہو جو میرے پلے نہیں پڑسکا۔''

''ہجرت کرنے والی پہلی نسل کی زندگی ہمیشہ بہت کڑی، دردناک اور عبرت انگیز ہوتی ہے جہاں ہر گام پر بے اندازہ جدوجہد، قربانیوں اور سمجھوتوں کے نشان ملتے ہیں۔ آبائی زمین اور رشتوں کو ٹھکرا کر مغرب میں آبسنے والوں پر بھی یہی کلیہ صادق آتا ہے۔ ان کی دوسری نسل اسی ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ جب وہ اپنے بڑوں کی جگہ لے لے گی تو تیسری نسل کے بارے میں اس کا رویہ بہت کھلا اور مقامی ماحول سے قریب تر ہوگا اور اگر وہ یہیں رہتے رہے تو میرا اندازہ ہے کہ ان کی تیسری اور چوتھی نسل میں یہ تضاد برائے نام رہ جائے گا۔ یہ اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے اور یوں ہی ہوگا۔''

''گڈ!'' دیرا تحسین آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی ''تمہاری اس مختصر سی گفتگو میں کام کی بہت سی باتیں ملی ہیں۔ اب میں اس موضوع پر ایک بھرپور مقالہ لکھ سکتی ہوں۔''

''ہوسکتا ہے کہ نیویارک میں اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے مہاجرین میں تمہیں صرف اسی مقالے کی بنا پر کوئی اعلیٰ ملازمت مل جائے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں اتنی آسانی سے تمہاری جان چھوڑ دوں گی۔ ملازمت کی پیشکش کی گئی تو میں بلا تردد اسے ٹھکرا دوں گی۔ پاکستان [illegible] غریب اور پس ماندہ ملک ہے مگر مجھے پسند ہے۔ یہ بات میں پہلے بھی تمہیں کھل کر بتا چکی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں بائیں ہاتھ سے اپنا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''ماضی میں جو گناہ کیے ہیں ان کی یہ سزا ابھی جھیلنی ہی ہوگی۔ شاید یہ بھی مکافاتِ عمل کا ایک حصہ ہے۔''

''تم سفاک اور بے مہر ہو۔'' وہ منہ بنا کر بولی ''میری رفاقت کو سزا قرار دے رہے ہو۔ یہ نہ بھولو کہ تمہارے اردگرد ہی جہانگیر جیسا قدردان بھی موجود ہے جو اس سزا کو اپنے لیے سب سے بڑا اعزاز سمجھے گا۔''

''جہانگیر!'' بے اختیار میری نظریں اپنی رسٹ واچ پر چلی گئیں۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ مجھے اول خان سے بات کیے دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہوگیا تھا۔ اتنی دیر میں اسے کچھ نہ کچھ کر گزرنا چاہیے تھا۔ اس کی طرف سے کوئی خیر خبر ملنے تک میں اپنے کمرے سے نہیں ہل سکتا تھا اور کمرے سے جہانگیر کو فون کرنا مناسب نہیں تھا۔ میری طبیعت پر ایک بار پھر اضطراب طاری ہونے لگا۔

''بہت دیر ہوگئی۔اب تک اول خان کی طرف سے کوئی اطلاع مل جانی چاہیے تھی۔'' چند ثانیوں کے توقف کے بعد ویرانے میری بے چینی بھانپ کر کہا۔

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔اول خان کو فون پر مشورے دیتے ہوئے میں نے یہ بات زور دے کر کہی تھی کہ سلطان شاہ کی بازیابی کے لیے وقت سب سے زیادہ اہم ہے کوئی بھی اطلاع ملتے ہی وہ اپنے طور پر سوچ اور فیصلہ کر کے اس پر عمل کر گزرے۔

اس پوری گفتگو میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں آیا تھا کہ وہ ہمیں حالات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر کرتا رہے۔وہ ایک تکنیکی نکتہ تھا ورنہ اول خان کو سلطان شاہ کے بارے میں ہماری سنگین تشویش کا پوری طرح احساس تھا۔

وہ اس کی بازیابی میں کامیاب ہو جاتا تو اپنی سرخ روئی کے اظہار کے لیے وفور مسرت کے عالم میں سب سے پہلے فون کرتا اور سلطان شاہ سے ہماری بات کرا دیتا۔

اس کی طرف سے فون نہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ اپنی کوششوں میں الجھا ہوا تھا یا پھر بازی ہاتھ سے نکل جانے پر سوگ کے عالم میں کہیں منہ چھپائے بیٹھا ہوا تھا' اس کی خاموشی بہرصورت تشویش انگیز تھی۔

میں نے اضطراری طور پر سگریٹ سلگائی اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ویرا میرے وجود میں انگڑائیاں لینے والے طوفان کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ کرنے کے بجائے مجھے تنہا چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور قد آدم آئینے پر اپنے سراپا پر ایک ناقدانہ نظر ڈال کر ہوٹل کے بار کے لیے چل دی۔

کچھ دیر پہلے چائے کی ایک پیالی پینے کے باوجود وہ اپنے مضطرب اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے شاید الکحل کی شدید ضرورت محسوس کر رہی تھی۔

وہ دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔وہ جاتے جاتے کمرے میں لوٹ آئی۔میں نے لپک کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

''سر،کسی راج کشور کا فون ہے۔'' میرے کانوں میں مترنم سی نسوانی آواز آئی۔

میں اس نامانوس نام کے بارے میں سوچتا ہی رہ گیا۔ہوٹل کی آپریٹر نے میرے کسی رسمی جواب کا انتظار کیے بغیر کال مجھے منتقل کر دی۔

''ہیلو!میرے پاس تمہارے لیے ایک بڑی خوش خبری ہے۔''

میرے کانوں میں بدری ناتھ کی مسرت آمیز آواز آئی۔آپریٹر کو اپنا اصل نام نہ بتا کر اس نے اپنی پیشہ ورانہ بیدار مغزی کا ثبوت دیا تھا۔

''کب روانگی کا ارادہ ہے؟'' میں کوشش کے باوجود اس کی خوشی کا ساتھ نہ دے سکا۔

''جلد از جلد ......کل کی سیٹ کے لیے کوششیں جاری ہیں۔میں پبلک بوتھ سے بول رہا ہوں مگر تم ہوٹل میں ہو۔پوری تفصیل تمہارے لیے دلچسپ ثابت ہوگی۔''اس نے کہانی شروع کرنے سے پہلے میری اجازت چاہی۔

''تھوڑی دیر بعد کہیں فون پر ملاقات کا وقت طے کرلیں گے۔''میں نے کہا۔''میں یہ باتیں رو برو سن کر ہی پوری طرح محظوظ ہو سکوں گا۔''

''میری حفاظت کا سلسلہ چل پڑا ہے۔اب اگلے پڑاؤ پر ہی ملاقات ہوگی۔کہیں سے مجھے سری کے نمبر پر فون کرلینا۔پندرہ منٹ بعد سے لے کر کم از کم صبح تک میں گھر پر ہی رہوں گا۔''اس بار اس نے سری نواسن کا بھی پورا نام نہیں لیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔میں فون کرلوں گا۔'' جواب دے کر میں نے فون بند کر دیا۔

''بدری کو جلد از جلد امریکا روانہ ہونے کا حکم ملا ہے۔''

ریسیور رکھ کر میں نے ویرا کو مطلع کیا۔

''......اس کے ساتھ ہم کو بھی اپنا رخت سفر سمیٹنا ہوگا؟'' ویرا پر تشویش لہجے میں بولی۔

''اس کمرے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ہم اسی سفر کے ارادے سے نکلے تھے۔روانگی میں تمہیں کیا تشویش ہے؟''

''پھر سلطان شاہ کا کیا بنے گا؟اگر پاکستان میں ہماری ضرورت ہوئی تو......''

''ہم اسی وقت نہیں جا رہے۔پتا نہیں یہ اول خان کہاں مر گیا ہے......؟وہ کہیں بھی الجھا ہوا ہو،صبح سے پہلے اس کا فون ضرور آئے گا یا پھر میں باہر سے اسے فون کرلوں گا۔ہمیں پتا چل جائے گا کہ اب ہماری ترجیح کیا ہونی چاہیے۔ضرورت ہوئی تو ہم نیو یارک کے بجائے کراچی چل دیں گے۔''

''بدری کے بارے میں اچانک ہی فیصلہ کیوں کر لیا گیا؟'' ویرا نے پوچھا۔

''سننے والوں کو ہر فیصلہ اچانک ہی محسوس ہوتا ہے مگر فیصلہ کرنے والے بہت سوچ بچار کے بعد کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔وہ خوش تھا اور بہت کچھ بتانا چاہ رہا تھا مگر میں نے اسے .... روک دیا۔اول خان سے بات ہو جائے تو پھر میں باہر جا کر اس سے رابطہ کروں گا۔''

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم ایک ہی وقت میں کئی متضاد الجھنوں سے دوچار ہو گئے ہوں۔'' ویرا تفکر آمیز لہجے میں بولی۔

''ایک وقت میں ہم ایک ہی طرف دھیان دے سکیں گے۔''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔یہ سب کڑیاں ایک ہی لڑی کا حصہ ہیں اور اس کے آخری سرے پر آئزک بیل موجود ہے۔وہ مجھے راس المیڈا سے زیادہ مکار اور منصوبہ ساز نظر آنے لگا ہے۔خود خم ٹھونک کر میدان میں اترنے کے بجائے اپنے ٹھکانے پر بیٹھ کر اپنے مہروں کو ادھر ادھر ہلایا جا رہا ہے اور مجھ سے رابطہ ہونے پر مصالحت کی پیشکش تک کر بیٹھا ہے۔''

''ہم دونوں میں سے کون صحیح ہے،اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔غالباً اسے ہوٹل کا بھولا ہوا بار یاد آ گیا تھا۔

ویرا چلی گئی اور میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا انتظار کے عالم میں اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔

سوا چھ بجے کمرے کے سکوت میں فون کی گھنٹی کی آہنی آواز گونجی۔

"لانگ ڈسٹنس کال۔" آپریٹر نے ضرورت سے ایک لفظ بھی زیادہ کہے بغیر کال مجھے دے دی۔ وہ جانتی تھی کہ بیرونِ ملک سے آنے اور وہاں جانے والی ہر کال کتنی قیمتی ہوتی ہے۔ وہ وقت غیر ضروری باتوں یا سوال و جواب میں گنوانا اس کے نزدیک شاید واقعی جرم تھا۔

اپنی ہیلو کے جواب میں مجھے ریسیور میں اول خان کی مضمحل اور پژمردہ آواز سنائی دی۔

"اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔" اس نے ایک ہی فقرے میں پوری کہانی سمیٹ دی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے مقام پر زور سے گھونسا رسید کر دیا ہو۔ میں نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا "اور جہاز کا کیا ہوا؟"

"وہ ہمارے پہنچنے سے تین گھنٹے پہلے پرواز کر چکا تھا۔ اس پر صرف چھ تابوت تھے۔"

"تم اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"میں دفتر میں ہی ہوں، تم فکر مند نہ ہو۔ میرے آدمی ابھی بھی اس کی تلاش......"

میں نے اسے بات پوری کرنے کا موقع دیے بغیر سرد لہجے میں کہا۔ "یہ فون ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ دفتر میں رہ کر میری کال کا انتظار کرو۔"

مزید کچھ کہے یا سنے بغیر میں نے یک لخت فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اول خان کے جواب نے میرے اندیشوں کی تائید کر دی تھی۔ پہاڑ جیسا طویل وقت گزر چکا تھا۔ مزید وقت تیزی کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا جو سلطان شاہ کے لیے خطرناک تھا۔

اول خان نے اپنی دانست میں جہاز کے بارے میں تحقیقات کر کے یہ یقین کر لیا تھا کہ کراچی سے امریکا کے میرین کمانڈوز کی چھ لاشیں لے جانے والے جہاز پر سلطان شاہ کو نہیں لے جایا گیا تھا۔ مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر امریکا کے مقتدر اور طاقت ور حلقے اپنی رضامندی سے یا بلیک میلنگ کے ذریعے ڈیوڈ اسٹارز کی پشت پناہی کر رہے تھے تو وہ ٹرانسپورٹ طیارہ سلطان شاہ کے رازدارانہ اغوا کے لیے بہترین سفری ذریعہ ثابت ہو سکتا تھا۔

اگر کا مسئلہ صرف اس لیے پیدا ہوتا تھا کہ میرے پاس اس یقین کے حق میں کوئی ثبوت نہیں تھا ورنہ ہر ظاہری دلیل مجھے اسی ایک نظریے پر راسخ کر رہی تھی۔

اس اطلاع پر میرا دورانِ خون تیز ہو گیا تھا اور میرے وجود میں سویا ہوا انتقامی درندہ بیدار ہو گیا تھا۔ اگر سلطان شاہ کراچی میں بازیاب نہ ہو سکا تو پھر کیا ہوگا؟ اس بارے میں مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں تھی۔ پورا نقشہ میرے ذہن میں واضح تھا۔

دشمن کے حیوانی تشدد سے کراہتے اور بلبلاتے ہوئے زخمی سلطان شاہ کا تصور ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنا کمرا چھوڑ دیا۔

میرا ذہن مسلسل امریکا کے ٹرانسپورٹ طیارے میں الجھا ہوا تھا جو میرین کمانڈوز کی لاشیں لے جانے کے لیے کراچی پہنچا اور چند روز بعد واپس چلا گیا۔

آخر وہ کون سے نکات تھے جنہیں چیک کر لینے کے بعد اول خان نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس طیارے کا سلطان شاہ کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ نکات طے ہو جانے کے بعد یہ دیکھنا تھا کہ کون کون سے پہلو اس کی نظروں سے بچے رہ گئے تھے۔ اس مشق سے گزرے بغیر میں اول خان کی ایماندارانہ رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے تین مزید فون کارڈز خریدے اور پھر ویرا کی تلاش میں بار کی طرف چل دیا۔

شام ہو چلی تھی بلکہ ہو ہی گئی تھی۔ بار میں تقریباً ساری میزیں آباد تھیں اور گھوڑے کی نعل کی شکل میں بنے ہوئے خوب صورت آبنوسی کاؤنٹر کے گرد بھی سارے اسٹول آباد تھے بلکہ بعض شوقین جوڑے ان کے درمیان بھی کاؤنٹر سے لگے چہلیں کر رہے تھے۔

یہ سب بعد کی باتیں ہیں کہ مجھے بار کی وہ جزئیات یاد آئیں اور خوشگوار یادوں کے کسی ذہنی خانے میں جم کر رہ گئیں۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ غصے اور بے بسی کے جذبات نے مل کر میری طبیعت پر ایسی متشددانہ کیفیت طاری کر دی تھی کہ سامنے آ جانے والی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دینے کو دل چاہ رہا تھا۔

میں نے اس وسیع بار کا طواف کیا۔ بھانت بھانت کے تمباکوؤں اور مختلف شرابوں کی ملی جلی مخصوص بو سے بوجھل اس فضا میں ویرا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

"وہ کہاں گئی؟ وہ تو مجھ سے بار کے لیے کہہ کر آئی تھی!" میرے ذہن میں ایک تخریبی سوال ابھرا۔

"گئی ہوگی جہنم میں!" میں شانے اچکا کر نکاس کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت، میرا موڈ کچھ ایسا جارحانہ تھا کہ میں اپنی سیدھی راہ سے ہٹے بغیر، بدن اکڑائے چلتا رہا، سامنے سے آنے والے کئی مرد اور عورتیں تصادم کے آخری لمحات پر مجھ سے صرف شانے لڑاتے ہوئے گزر گئے۔

مجھے ویرا پر غصہ آنے لگا، وہ ایسی نہیں تھی کہ محض شانے اچکا کر میں اسے اپنے سر سے اتار پھینکنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اس ہوٹل کے داخلی دروازے کے قریب ہی شیشے کی ایک دیوار میں ریستوران کی روشن تختی کے نیچے ذیلی دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ جو شاید ہوٹل کے مقیم مہمانوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ میرے قدم بے اختیار اسی طرف مڑ گئے۔ اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

اندر گھستے ہی مجھ پر بیک وقت دو حقیقتیں منکشف ہوئیں۔ ریستوران کا صدر دروازہ سڑک کے رخ پر واقع تھا اور ویرا اس طرف شیشے کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی میز پر بیٹھی اپنے گلاس سے چسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی ساری توجہ باہر کے منظر پر مرکوز تھی۔

میں اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ متفکرانہ انداز میں شیمپین پی رہی تھی۔ اس کے سامنے رکھی ہوئی بوتل میں بس آخری چند گھونٹ باقی تھے۔

میں اس کی مکمل بے خبری میں اس میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اپنے قریب کسی کی موجودگی کا لاشعوری احساس ہوتے ہی وہ چونک کر مڑی اور مجھے دیکھتے ہی اپنی کرسی چھوڑ کر ہڑبڑاتے ہوئے، معذرت خواہانہ انداز میں کھڑی ہوگئی۔

میری آنکھوں سے جھلکتی ہوئی جارحیت نے اسے مشینی انداز میں بولنے.... پر مجبور کردیا۔ ''مم.... بب.... بار میں بالکل جگہ نہیں تھی، میں تھوڑی دیر کے لیے تمہیں اکیلا چھوڑنا چاہتی تھی اس لیے واپسی کے بجائے ریسٹوران میں آبیٹھی.... مگر تم یہاں کیسے آگئے؟''

''آیا.... نہیں ہوں، دروازے سے باہر جارہا ہوں۔ گلاس کے نیچے دس پاؤنڈ کا نوٹ چھوڑ دو اور چلو، پڑو۔ معاملات بگڑ رہے ہیں۔'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور ریسٹوران کے صدر دروازے کی طرف چل دیا۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ویرا نے اپنے گلاس اور بوتل میں باقی شیمپین کو بھول کر اپنے پرس میں سے مطلوبہ مالیت کا نوٹ نکالنا شروع کردیا تھا۔

دروازے سے نکلنے تک وہ تقریباً دوڑتی ہوئی میرے ساتھ آگئی۔

لیڈیز فرسٹ والے معاشرے میں میری وہ حرکت نازیبا تھی۔ اصولاً مجھے اس کی میز کے پاس رک کر اس کے روانہ ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ شرفا کا ہوٹل تھا۔ اگر اس وقت وہ ہال تقریباً خالی نہ ہوتا تو میری ذات متعدد تحیر زدہ نگاہوں کا مرکز بن گئی ہوتی۔

ویرا کے قدم ملا لینے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس وقت میرا دماغ بالکل ہی الٹ کررہ گیا تھا اور میں مسلسل ایسی حرکات کا مرتکب ہو رہا تھا جن کی وجہ سے میں لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا جب کہ میں اندرون اور بیرون ملک ہر عام مقام پر اشد ضرورت کے بغیر لوگوں کی نظروں میں آنے سے گریز کرتا تھا۔ شی سے وابستگی کی ابتدا سے ہی وہ عادت میری فطرت ثانیہ بنی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟ کون سے معاملات بگڑ رہے ہیں؟ او.... کہاں جارہے ہو؟''

''اول خان کا فون آیا تھا۔ سلطان شاہ کا کو.... سراغ نہیں ملا۔ اس کا خیال ہے کہ لاش بردار طیارے.... سلطان شاہ کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں او.... سے بات کرنے جارہا ہوں۔''

''اوہ، ڈارلنگ! تم کتنے اچھے ہو!'' وہ چلتے چلتے والہانہ انداز میں میرے بازو سے لپٹ گئی۔ ''میں با.... میں نہیں تھی۔ تم چاہتے تو مجھے چھوڑ کر بھی فون کرسکتے تھے مگر تم نے مجھے تلاش کر ہی لیا۔ میں نری احمق اور جا.... ہوں، تم بہت عظیم ہو۔''

میں اس وقت جارحیت کے موڈ میں تھا۔ اپ.... بازو پر ویرا کے بھرپور سراپا کا گداز لمس محسوس کرتے.... میرے اشتعال کی رو میں یکایک تبدیلی آئی اور میں.... دھکیل کر اسے اپنے بازو سے الگ کردیا۔

''تم بہت زیادہ بھڑکے ہوئے ہو۔ یہ تو بتاؤ.... اول خان اور کیا کہہ رہا تھا؟''

''جو بات ہوئی، وہ میں نے بتا دی۔ باقی باتیں.... اپنے کانوں سے سن لینا۔''

''پھر اب تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ خبر تو تشویش.... ناک ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''میرا دماغ مت چاٹو اور چپ چاپ.... رہو۔'' میں نے تنک کر کہا۔ ''اس وقت میں کچھ سوچ.... اور اپنا ذہن بنانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

وہ سہم کر خاموش ہوگئی۔ اس کی زبان بندی کے.... لیے میں نے اپنا ذہن بنانے کی کوشش کا بلاوجہ ذکر کردیا.... تھا۔ میں اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا.... میں کچھ سوچنا ممکن ہی نہیں تھا۔

فون بوتھ میں ایک نوعمر سفید فام لڑکی ہنس ہنس کر.... کسی سے باتیں کررہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بال پوائنٹ.... تھا جس سے وہ مختصر سے شیلف پر ٹکے ہوئے کاغذ.... دھیرے دھیرے کچھ لکھ رہی تھی۔

وہ پلاسٹک کا بند بوتھ تھا جس کے اوپر نصف.... دروازے پر شفاف پلاسٹک شیٹ تھی۔ ہم انتظار.... ہی رکے رہے۔ لڑکی نے ہمیں دیکھ لیا تھا مگر اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔

لڑکی کبھی بال پین کا پچھلا سرا دانتوں میں چبانے لگتی، کبھی رخ اور پہلو بدل بدل کر قہقہے لگانے لگتی۔ وہ شکل سے چودہ پندرہ سال کی کوئی اسکول طالبہ رہی ہوگی مگر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بے حجاب اور باتونی نظر آرہی تھی۔ اس کی حرکات میں معصومیت کے بجائے چھچھلی نظر آرہی تھی۔

''بندر کی اولاد.... فون سے چپک کررہ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک کال میں اس نے پورا بوتھ خرید لیا ہے۔ جی چاہ رہا ہے کہ لات مار کر دروازہ توڑ دوں۔'' گفتگو کا سلسلہ ختم نہ ہوتے دیکھ کر میں غصے میں بڑبڑانے لگا مگر ویرا نے میرا بازو تھام لیا۔

''تم اسے کال مختصر کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ آؤ، آگے کوئی دوسرا بوتھ خالی مل جائے گا۔ یہ شاید اپنے کسی بوائے فرینڈ سے بات کررہی ہے اور فون پر ہی دل کے سب ارمان نکالے گی۔''

میں نے غصے سے گھور کر بوتھ کی طرف دیکھا۔ اسی وقت لڑکی نے ماؤتھ پیس کو چوما، ریسیور کو ہک پر لٹکا دیا اور مختصر سا پرس فضا میں لہراتی ہوئی مستانہ انداز میں باہر آگئی۔

''ہیلو!'' ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہم پر طنز کر گئی ہو۔

بوتھ میں گھستے ہی ہم دونوں نے بیک وقت شیلف پر پڑا ہوا وہ کاغذ دیکھا جس پر وہ لڑکی نقاشی کرتی رہی تھی۔ جانے وہ کاغذ اس نے دانستہ چھوڑا تھا یا وہ عجلت میں بھول گئی تھی۔ اس پر ایک فون نمبر کے ساتھ بے ربط لکیروں کے ذریعے غلیظ خاکے بنائے گئے تھے۔ اسی کاغذ پر جا بجا بے ہودہ الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے۔

''بالکل ہی سور کی بچی تھی۔'' ویرا نے وہ کاغذ پرزے پرزے کرکے نچلے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ ''یہاں بہت سی کم سن لڑکیاں بھی جسم فروشی جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جانے والی بھی ان ہی میں سے ایک رہی ہو۔''

ویرا کے اس تحقیر آمیز تبصرے پر مجھے ٹیوڈر ہوٹل کے لیے گاہک پھانسنے والی فراخ دل شیری رینڈل یاد آگئی جس نے محض چند منٹ کی ملاقات میں ہی میرے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اسی نے مجھے روانی میں بتایا تھا کہ لندن میں بیشتر جسم فروش لڑکیاں بھی ایک خوفناک سنڈیکیٹ سے وابستہ تھیں اور ایک بار اس کے چنگل میں پھنسنے کے بعد جوانی ڈھلنے تک اس گرداب سے نہیں نکل سکتی تھیں۔

جب کوئی بھی کام منظم جرائم پیشہ گروہوں کی تحویل میں آجائے تو اس میں اخلاق اور اقدار کے ساتھ انسان کی اہمیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اسے صرف اور صرف کاروباری خام مال کی طرح بے رحمی سے رگڑا جاتا ہے۔ اس میں عمر اور صنف کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ بس کاروباری تقاضے ملحوظ خاطر رہتے ہیں اور جس کارکن کی افادیت گرنے لگے، انہیں بہ یک بینی و دو گوش نکال باہر کیا جاتا ہے۔

ذہن میں وہ ایک عارضی سا خیال آکر تیزی سے گزر گیا۔ اس درمیان میں، میں اول خان کے دفتر کا فون نمبر ملا چکا تھا۔ چند ثانیوں کے انتظار کے بعد گھنٹی بجی اور فوراً ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔

''تمہارے آدمی اب اسے کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہیں؟'' میں نے کسی تمہید کے بغیر براہ راست یوں سوال کیا جیسے وہ گفتگو دیر سے ہو رہی ہو۔

''ہمارے پاس اس کا کوئی سراغ نہیں ہے۔ بس پورا شہر چھانا جارہا ہے۔''

''یوں اندھا دھند بھاگ دوڑ سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔ نیا آدمی راس المیڈا سے زیادہ مکار اور ذہین ہے۔ انہیں بلالو اور کوئی معقول حکمت عملی اختیار کرنے کی کوشش کرو۔''

''مگر یوں سوچنے میں وقت گزرتا چلا جائے گا....'' اس کی آواز سے بے بسی عیاں تھی۔

میں نے رسانیت سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''سوچے بغیر ہم آدمیوں کی محنت اور پیسہ برباد

کرتے رہیں گے۔ نتیجہ صفر رہے گا۔'' میں نے دانستہ تم کے بجائے ہم کا لفظ استعمال کیا تھا۔

''پھر تم ہی کوئی مشورہ دو۔ میں اس پر عمل کروں گا۔'' وہ بولا۔

''تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ وہ اب بھی اس شہر کے کسی حصے میں قید ہے؟''

''پھر وہ کہاں گیا؟ جہاز کا سارا ریکارڈ میں بہت اچھی طرح چیک کر چکا ہوں۔''

''جہاز کے بارے میں مجھے پوری بات بتاؤ۔ اس کی آمد اور روانگی سلطان شاہ کے اغوا کے مراحل سے بہت قریب ہے اور یہ بات میرے ذہن میں چبھ رہی ہے۔'' میں نے اسے اپنی بے لاگ رائے سے آگاہ کردیا۔ اس سے بات شروع ہونے کے بعد میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی اشتعال کی لہر معدوم ہوگئی تھی اور صحیح خطوط پر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو چکا تھا۔

''وہ مسقط کی بندرگاہ میں لنگر انداز امریکی بحریہ کے ایک طیارہ بردار جہاز سے پرواز کر کے چار دن پہلے کراچی ائرپورٹ پر اترا تھا اور آج چلا گیا۔'' اس نے بتایا۔

''جہاز کون سا تھا اور اس پر عملے کی کیا تعداد تھی؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''اس سی ون تھرٹی پر وہ ہوا باز اور ان کے تین معاون موجود تھے۔ چھ تابوت ساتھ لے کر صرف وہی پانچوں واپس گئے ہیں۔''

''یہ کیسے پتا چلا کہ جہاز پر صرف چھ تابوت تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاز تخریبی کارروائیوں سے حفاظت کے خیال سے ابتدا سے آخر تک ائرپورٹ سیکیورٹی فورس کے مسلح نوجوانوں کی نگرانی میں رہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جہاز اترنے کے بعد اس پر ایندھن اور خورونوش کی سفری ضروریات کے سوا صرف چھ تابوت لادے گئے تھے۔''

''اور ان میں صرف امریکی میرین کمانڈوز کی لاشیں تھیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''کہا یہی جاتا ہے۔ سول سرجن نے تصدیق کے بعد ریفریجریٹڈ کنٹینر کے بعد وہ سب تابوت امریکی قونصل خانے کے ایک افسر کے حوالے کردیے تھے۔ تابوت سفارتی مراعات یافتہ کارگو میں شامل تھے۔ انہیں مہر بند کرنا اور امریکا کے قومی پرچموں میں لپیٹنا قونصل خانے کی ذمے داری تھی۔''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک لاش کو بے ہوش سلطان شاہ سے تبدیل کردیا ہو؟''

''بالکل ممکن ہے لیکن وہ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ غیر ملکی سرزمین پر بیس میرین کمانڈوز کی بیک وقت ہلاکت کا واقعہ بہت بڑا تھا۔ مرنے والوں کے لواحقین پریس سمیت تابوتوں کو ہوائی اڈے پر وصول کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ یہاں روکی جانے والی لاش کی جگہ وہاں سلطان شاہ تابوت میں بند ہوگا تو ایک اودھم مچ جائے گا۔ امریکی شہری اپنے مردوں کی بے حرمتی اور سودے بازی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کریں گے۔ یہی سوچ کر میں نے اس امکان کو مسترد کردیا تھا۔''

اس کے دلائل معقول تھے۔ کراچی سے باقی ماندہ چھ تابوتوں کی روانگی کے بعد امریکا میں صرف پانچ لاشوں کی تدفین پر واقعی ایک کہرام برپا ہوسکتا تھا اور امریکی پریس پوری بے باکی سے اس راز کی بیخ کنی پر تل جاتا اور جب راز فاش ہوتا تو ایوان اقتدار کے در و بام ہل کر رہ جاتے۔

کوئی بھی امریکی حکمراں ڈیوڈ اسٹارز کے مفادات کے لیے اپنی بقا کو ایسے احمقانہ انداز میں داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

اول خان نے اس فیصلے پر پہنچنے کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ وہ عجلت میں اخذ کیا ہوا نتیجہ نہیں تھا۔ میں چند ثانیوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

میری چھٹی حس مجھے سلطان شاہ اور سی ون تھرٹی کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق پیدا کرنے پر اکسا رہی تھی مگر بظاہر کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اول خان کی فراہم کی ہوئی معلومات کی روشنی میں امریکی بحریہ کے طیارے کے بارے میں صرف ایک ہی بات غیر معمولی تھی کہ اس مال بردار طیارے کا عملہ پانچ نفوس پر مشتمل تھا۔ مسافر بردار اور جنگی طیاروں تک میں کاک پٹ کے لیے صرف ہوا باز اور اس کا معاون ہوتے ہیں لیکن سی ون تھرٹی پر شاید سفر کی طوالت کی وجہ سے دو کے بجائے پانچ کا عملہ مقرر کیا گیا تھا۔ مجھے سی ون تھرٹی میں عملے کی ضرورت کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا مگر میں نے فرض کرلیا تھا کہ دو دو افراد باری باری کاک پٹ میں ڈیوٹیاں سرانجام دیتے اور پانچواں ان لوگوں کی ضروریات پوری کرتا رہتا۔

فون پر میری وہ خاموشی بس چند ہی لمحوں کے لیے قائم رہی پھر میں نے بے ساختہ کہا۔ ''ٹھیک ہے، ایک لاش کی تبدیلی خارج از امکان ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی تابوت میں دو آدمی بند ہوں۔''

''یعنی سلطان شاہ کو کسی لاش کے ساتھ تابوت میں بند کردیا گیا ہو؟'' اول خان نے بے اعتباری سے پوچھا۔ ''اس طرف میرا خیال ہی نہیں گیا تھا۔''

''ہوسکے تو یہ معلوم کرو۔ یہ ترکیب ان کے لیے بہت سہل تھی۔ راستے میں وہ کہیں بھی سلطان شاہ کو تابوت سے نکال کر بے دست و پا کردیں گے۔ تابوتوں کی روانگی کے بعد سلطان شاہ کو پوری راز داری سے طیارے سے باہر نکال لیا جائے گا۔''

''تمہاری سب باتیں درست ہیں مگر تابوتوں کی موجودگی میں ہی یہ چیک کرنا ممکن تھا۔ ان کی روانگی کے بعد یہ کام کیسے ہوسکے گا۔''

''پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ وہاں لوڈنگ کے متعدد مراحل میں افرادی قوت کا استعمال بہت عام ہے۔ لوڈرز سے پوچھ گچھ کی جائے تو سرا ہاتھ آسکتا ہے۔''

''وہ صرف قیاس ہوگا۔ ہر آدمی کا وزن جسامت کے لحاظ سے کم و بیش ہوتا ہے۔''

''تم بھول رہے ہو کہ ہم عام آدمیوں کی نہیں، میرین کمانڈوز کی بات کر رہے ہیں۔ بیشتر شعبوں کے فوجی قد کاٹھ میں بڑی حد تک یکساں ہوتے ہیں۔ لاشوں کا جائزہ لینے والا سرجن تمہیں ان کے تخمینی وزن بتا سکتا ہے۔ سلطان شاہ ایک جسیم اور صحت مند نوجوان ہے۔ اس کے وزن کا فرق بہت غیر معمولی رہا ہوگا۔ باریکی سے چھان بین کی جائے تو بہت سی باتیں کھلیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ اندھیرے میں ہاتھ پیر مارنے سے بہتر ہے کہ یہی مشق کرلی جائے۔''

''دوسری بات جہاز کے عملے کی ہے۔ وہ چار دن تک کراچی میں کیا کرتا رہا۔ ان چاروں کا قیام کہاں رہا۔ ہوسکتا ہے کہ اسحاق گھمنٹی کے دونوں آدمی ان ہی میں شامل رہے ہوں۔''

''اوہ! یہ بھی ممکن ہے۔'' اول خان کی آواز پر خیال ہوگئی۔ ''کاش یہ باتیں ذرا پہلے ہمارے علم میں آگئی ہوتیں۔ جمن اور کریم ملاح ان دونوں کو شناخت کرسکتے تھے۔ کسی بھی ریکارڈ سے ان کی تصاویر نہیں مل سکیں گی۔ امیگریشن والوں کے صرف فارم ہوں گے جو آمد و روانگی کے مواقع پر بھرے گئے ہوں گے۔''

''انہوں نے پاکستان میں پانچ دن قیام کیا ہے۔ یہاں آمد پر انہیں کسی نہ کسی قسم کا ویزا جاری کیا گیا ہوگا۔ ویزا کے لیے تصاویر لازمی طور پر وصول کی جاتی ہیں۔ ان کی مدد سے جمن اور کریم ملا بہت کچھ اگل دیں گے۔'' بات بڑھنے کے ساتھ ساتھ مجھے راہیں کھلتی نظر آرہی تھیں۔

''میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم پاکستان میں موجود ہوتے تو یہاں کے حالات اتنے مایوس کن ہرگز نہ ہوتے..... میں مارنے یا مرجانے والا آدمی ہوں۔ زیادہ چال بازیاں میرے بس سے باہر ہیں لیکن تم سوچتے ہو تو بس سوچتے ہی چلے جاتے ہو۔''

''یہ چال بازیاں نہیں، دشمن کو اسی کے ہتھیار سے تباہ کرنے کے طریقے ہیں۔''

''اس کے باوجود میں ان طریقوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔''

''سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس طیارے پر پانچ افراد کیوں تھے۔ امریکا ایک عالمی قوت ہے۔ دنیا کے

ہر خطے میں اس کے فوجی اڈوں کا جال پھیلا ہوا ہے جہاں ہر وقت ہر شعبے کے لوگ تیار رہتے ہیں۔ایشیا سے یورپ تک کہیں بھی سی ون تھرٹی کا عملہ تبدیل کیا جا سکتا تھا......''

''وہ لوگ یقیناً یہی کریں گے۔'' میری بات کاٹ کر اول خان کی پرجوش آواز ابھری۔''اسحاق گھنٹی کے دو آدمی نیویارک سے مسقط پہنچے ہوں گے۔ وہاں سے وہ سی ون تھرٹی کے عملے میں شامل ہو کر کراچی گئے اور اپنا کام شروع کر دیا۔''

''میرے ذہن میں بالکل یہی باتیں ہیں۔سلطان شاہ کو اغوا کرنے کے بعد وہ ٹھٹھہ میں روپوش ہو گئے۔ جہاز کی روانگی کا شیڈول طے ہونے کے بعد انہوں نے سلطان شاہ کو قونصل خانے کے حوالے کیا اور خود جہاز کے عملے میں شامل ہو کر روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔'' اول خان کے خاموش ہونے پر میں نے باقی کڑیاں یکجا کرنی شروع کر دیں۔''قونصل خانے میں سلطان شاہ کو بے ہوش کرنے کے بعد تابوت میں بند کیا گیا، تابوت پر امریکی پرچم ڈالا گیا اور پھر کنٹینر میں رکھ کر......... ائرپورٹ پہنچا دیا گیا......لیکن ٹھہرو! کہیں ایسا تو نہیں کہ لاشوں کی حفاظت کے خیال سے وہ پورا کنٹینر ہی جہاز میں لاد دیا گیا ہو؟'' بات کرتے کرتے اچانک مجھے اس نکتے کا خیال آ گیا جو بہت بنیادی تھا۔

''کیا ایسا ہوتا تو میں لوڈروں کا ذکر آنے پر تمہیں نہ بتاتا؟''

اول خان نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''میں جن باتوں سے لاعلم ہوں ان کے بارے میں علامہ بننے کی کوشش نہیں کرتا، سادگی سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتا ہوں مگر جو کام کرتا ہوں اس کی اونچ نیچ پر پوری نگاہ رکھتا ہوں۔''

شاید وہ میرے ابتدائی لب ولہجے کی رکھائی بھانپ گیا تھا مگر میری اس سرد مہری کو پریشان خیالی سمجھ کر پی گیا۔اس وقت موقع ملا تو اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی اور میں اپنی جگہ پر شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔اس نے اپنے ایک ہی جواب سے میری طبیعت صاف کر دی تھی۔

''سوری!'' میں جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''ڈیئر!'' اس نے جذبات کی رو میں آ کر ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دی۔''میں نے بھی تم پر کوئی طنز نہیں کیا۔عمر اور تجربے میں تم سے سینئر ہونے کے باوجود میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔خدا نے تم کو زرخیز ذہن سے نوازا ہے۔تم میں حالات کے فوری تجزیے کی بہترین صلاحیتیں ہیں۔میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ایک دوسرے سے ملنے سے پہلے ہم اپنی اپنی جگہوں پر کوئی مقام حاصل کر چکے تھے......''

''بس، اب یہ باتیں ختم......اس وقت وہاں رات گہری ہو چکی ہو گی۔اب تم صبح ہی کام کرو گے۔''

''ہم جیسی ذمے داریوں پر مامور لوگ وقت دیکھ کر کام کرنے لگیں تو پھر کچھ باقی نہیں بچتا۔ٹیکسوں کے ذریعے قوم سے نچوڑے ہوئے وسائل میں سے ہمیں بھاری تنخواہیں دی جاتی ہیں......یہ قوم کا ہم پر احسان ہے اور اس احسان کو ہم قوم کی شب و روز خدمت ہی سے اتار سکتے ہیں......میں ابھی اور اسی وقت پورے اسٹاف کو فیلڈ سے بلا کر تمہاری دی ہوئی لائن پر کام شروع کرتا ہوں۔''

''کاش اس قوم کے سارے سرکاری افسر اسی انداز میں سوچنا شروع کر دیں۔''

ہلکی سی ہنسی کے بعد وہ بولا۔''تم بھول گئے ہو کہ ہم سرکاری نہیں ہیں۔''

''تم یقین کرو......تم لوگ جو بھی ہو تمہاری صفوں کا ایک ایک صف شکن سرکاری حرام خوری کے اس دور میں پوجا کے قابل ہے۔اہم مسئلہ درپیش نہ ہو تو تمہارے آدمی مقررہ اوقات میں کام کرنے کے بعد آرام کرتے ہیں اور مہم درپیش ہو تو اوور ٹائم کی آرزو کے بغیر کئی کئی دنوں تک مسلسل کام میں مصروف رہتے ہیں اور بدترین حالات میں بھی حرف شکایت زبان پر

نہیں لاتے۔''

''عسکری تربیت کا کمال ہے۔تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا ہر رکن جنگی بنیادوں پر تربیت یافتہ ہے۔ذرا غور تو کرو کہ کسی جنگی محاذ پر فوجی آٹھ گھنٹے تک دشمن کے دانت کھٹے کرنے کے بعد نئی شفٹ کے لیے جگہ خالی کرنے لگیں تو کیسی زبردست تباہی آئے گی۔وہاں تو ہر ایک کو فیصلہ ہونے تک مسلسل لڑنا ہوتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ کام کی یہ روح پھونکنے کے لیے تمام افسروں کو باری باری تربیت کے لیے فوج میں بھیجا جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔'' میں نے ایک بے ساختہ سنجیدگی سے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔''ہاں، فوج ان میں آ کر بھی ان کا سدھار نہیں کر سکتی۔ان کے جاتے ہی یہ پہلے سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔اب انہیں فوج میں بھیجنے کا تجربہ کر کے دیکھ لینا چاہیے لیکن دیکھنا یہ ہو گا کہ ان بگڑے رئیسوں کو سدھارنے کی ذمے داری کوئی لیتا بھی ہے یا نہیں۔''

''اس ملک میں ہر چیز کی بہتات ہے، کمی صرف ایک چیز کی ہے جسے احساس ذمے داری کہا جاتا ہے۔فون بند کرنے سے پہلے بس ایک بات سن لو، آج بدری کہہ رہا تھا کہ غربت میں ہماری قوم ان سے پیچھے ہے مگر ہمارے لوگ شہزادوں کی طرح مال دار ہیں اور دل کھول کر دولت لٹاتے ہیں۔''

''یہ دردمند دلوں کی سوچ ہے۔جب ضمیر سیاہ ہو جاتے ہیں تو سب سے پہلے دلوں سے رقت اور دردمندی رخصت ہوتی ہے اور سوچ پر ذاتی اغراض کے پردے پڑ جاتے ہیں۔تھوڑے سے چنے ہیں جو بساط بھر بھاڑ پھوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''اس بارے میں واپسی پر باتیں ہوں گی۔اب میں تمہارا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔اگر تم فوری طور پر نئے سرے سے کام شروع کرنے کا عزم کر چکے ہو تو اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔''

میں مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن وہ فقرہ مکمل ہوتے ہی اول خان نے میری بات اچک لی۔''اس وقت میں اپنے اسٹیشن پر اپنے اسٹینو کے ساتھ موجود ہوں۔میرے اردلی سمیت ساری نفری فیلڈ میں ہے۔میں نے اسٹینو کو اشارے سے ہدایت دے دی ہیں۔نفری کی طلبی کا پہلا مرحلہ یعنی نئی لائن پر کام شروع ہو چکا ہے۔ذرا تم اپنی مفروضہ کہانی تو پوری کر دو۔''

''میری کہانی مکمل ہے۔اس کا ایک سرا بھی مل جاتا تو سمجھ لو کہ پوری کہانی درست ہے ورنہ یہ پورا مفروضہ سرے سے غلط اور بے سروپا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بات کنٹینر پر آ کر اٹک گئی تھی۔وہ سب لاشیں منجمد تھیں اور کھلی فضا میں بھی تین چار روز خراب نہیں ہو سکتی تھیں۔'' اول خان نے بات جوڑتے ہوئے کہا۔''اس وجہ سے وہ تابوت سی ون تھرٹی کے ان خاص خانوں میں منتقل کر دیے گئے جو منجمد اشیا کی نقل و حمل کی غرض سے بنائے گئے ہیں اور طیارہ کلیرنس کے بعد پاکستان کی فضائی سرحدوں سے دور نکلتا چلا گیا۔''

''امریکا اس وقت کرہ ارض کی ایک موذی طاقت ہے اور موذی سے ہر ایک ڈرتا ہے۔اپنے بے شمار اڈوں کے علاوہ وہ جہاں چاہے اپنا طیارہ اتار سکتا ہے۔وہاں سے مسقط کا عملہ واپس لوٹ آئے گا اور نیا امریکی عملہ جہاز کو اسحاق گھنٹی کے آدمیوں سمیت آگے لے جائے گا اور جلد ہی وہ طیارہ امریکا کے کسی محفوظ ہوائی اڈے پر اتر جائے گا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کہانی کی صداقت کے شواہد مل جانے کے بعد تمہیں جلد از جلد امریکا کے لیے روانہ ہونا پڑے گا۔'' اس کی آواز یکایک پرتشویش ہو گئی۔

''ہاں......پھر تو امریکا ہی اصل میدان جدل بنے گا اور وہاں اسحاق گھنٹی کی قبر کھودنی پڑے گی۔'' میں نے بلا تامل جواب دیا۔

''لیکن تمہارے اصل منصوبے کا کیا......بنے گا۔یہاں سے تم کسی کے کہنے پر گئے تھے۔''

''قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔اسے جلد از جلد کوچ کرنے کا حکم مل چکا ہے۔شاید وہ کل آگے روانہ

ہو جائے۔اسی وجہ سے مجھے اپنی کہانی کی صداقت پر خاصا یقین ہے۔"

اس خبر نے اول خان کو خوش کر دیا۔ریسیور پر اس کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔"سب دھارے وہیں مل کر اکٹھے ہوتے ہیں جہاں ڈھلان ہوتا ہے۔اگر تم سب قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نیویارک کی طرف ہانکے جا رہے ہو تو وہاں کوئی نہ کوئی بڑا ڈراما جنم لینے والا ہے۔"

"تم اسے ڈراما کہہ رہے ہو۔میں اسے آرزوؤں کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھ رہا ہوں۔سلطان شاہ ہمارے ساتھ امریکا آنے کا شدت سے آرزومند تھا۔ہم نے اسے وہاں چھوڑ دیا۔اب اسحاق گھنٹی کے آدمی اسے اٹھا کر زبردستی وہاں لیے جا رہے ہیں۔شیطان کی آنت جیسا یہ طویل سفر شاید سلطان شاہ کے نام لکھ دیا گیا تھا مگر وہ اس میں پیش آنے والی صعوبتوں کا سزاوار بھی تھا، وہ ہمارے ساتھ سفر کرتا تو وہ آلام و مصائب کیسے رونما ہوتے جو اسحاق گھنٹی کے نمک خوار اس پر ڈھائیں گے۔"

"سلطان شاہ کی غیر حاضری میں غزالہ تمہارے فلیٹ میں تنہا رہ جائے گی۔مجھے اب بھی امید ہے کہ سلطان شاہ بازیاب کرا لیا جائے گا۔ایسا ممکن نہ ہو تو کیا ہوگا؟ غزالہ دشمنوں کے لیے پہلا نشانہ بن جائے گی۔ میں نے اسے اپنے گھر روک لیا ہے۔میرے بیوی بچوں کے ساتھ وہ مصروف اور خوش رہتی ہے...... میری بیوی کو بھی وقت گزارنے کے لیے ایک سلجھی ہوئی، تعلیم یافتہ لڑکی کا ساتھ مل گیا ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ عارضی بندوبست ناگزیر تھا اور تم اس کی توثیق کرو گے۔"

"عمر میں مجھ سے زیادہ بڑے نہ ہونے کے باوجود ان معاملات میں تم میرے مرحوم باپ کی جگہ ہو۔جو فیصلہ مناسب ہو کر سکتے ہو۔میں اسے کھلے دل سے تسلیم کروں گا۔"

"شاید تم ہوٹل کے فون پر بات کرنی مناسب نہیں سمجھتے۔آئندہ میں ہوٹل میں تمہیں صرف پیغام دوں گا اور تفصیلی گفتگو تمہاری جوابی کال پر ہوگی۔"

"فی الحال یہی بہتر رہے گا۔میں محفوظ رہ کر بھی آخری لمحات تک خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔امرا، شرفا، معززین اور وزرا مرد و خواتین کی کھلی کھلی قانونی ہم جنس پرستی کے عذاب میں مبتلا یہ قوم قانون کی بالادستی کے بارے میں ایک خبط بلکہ جنون میں مبتلا معلوم ہوتی ہے، پتا نہیں کب ہمارے تحفظ کا توازن بگڑ جائے۔ یہاں ہم اپنا اسکور پورا کر چکے ہیں۔اب سفر ضروری ہو گیا ہے۔"

"یہاں کے اخبارات میں غیر ملکی بلکہ بین الاقوامی خبریں بھی بہت کم جگہ پاتی ہیں۔صرف ان ہی خبروں کو اچھالا جاتا ہے جو حکومت وقت کو راس آتی ہیں۔مجھے کوشش کے باوجود تمہاری سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہو سکا۔"

"سرگرمیوں کو چھوڑ کر اب تو اسکور کی بات کرو۔میرا اور مسز روزی برڈ کا اسکور ایک ایک ہے۔ تیسرا بیچ میں آ کر بلاوجہ مارا گیا۔تمہارے لیے اتنی تفصیل کافی ہونی چاہیے۔"

"یہ کامیابیاں تم دونوں کو مبارک ہوں۔جس وقت بھی کوئی اہم خبر ہاتھ آئی، میں تم کو رابطے کا پیغام دوں گا، فی امان اللہ۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے بھی ریسیور ہک سے لٹکا دیا اور کارڈ واپس نکال کر بوتھ سے باہر نکل آیا کیوں کہ چند ثانیوں قبل ہی ایک معمر خاتون فون کرنے کے لیے ہمارے بوتھ کے باہر پہنچی تھی۔

"کیا تم بدری کو فون نہیں کرو گے؟" مختصر سے بوتھ سے باہر آتے ہی ویرا نے پوچھا۔

"کروں گا۔پہلے اس عورت کو فارغ ہونے دو۔" مجھے یاد تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک نوعمر لڑکی کی طول پکڑتی ہوئی کال سے مجھے کیسی کوفت ہو رہی تھی۔میں خود کسی کے لیے ایسی اذیت کا سبب بننا نہیں چاہتا تھا جو میرے لیے ناقابل برداشت ہو۔

مجھے وہ مخصوص بوتھ اسی لیے پسند تھا کہ میں وہاں سکون سے طویل گفتگو کر سکتا تھا کیوں کہ اس پر خال خال ہی کوئی نظر آتا تھا ورنہ وہ خالی پڑا رہتا تھا۔

سلطان شاہ کے بارے میں میرے ذہن پر چھائی ہوئی جھلاہٹ اور بے بسی اب صرف گہری تشویش میں بدل کر رہ گئی تھی۔اول خان سے سرد مہری سے شروع ہونے والی گفتگو کا اختتام مجموعی طور پر مفاہمانہ اور خوش گوار ثابت ہوا تھا۔میری یہ غلط فہمی بھی رفع ہو چکی تھی کہ اس نے اپنی چھان بین میں بعض بنیادی غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا۔

اول تو وہ کراچی میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔وہاں اسے مشورہ دینے اور راہ سجھانے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ویسے بھی وہ اس قسم کی تفتیش اور چھان پھٹک کا آدمی نہیں تھا۔خود میرا یہ عالم تھا کہ اس کا نمبر ملانے تک میرا ذہن بالکل کورا تھا۔میں غلطیوں وغیرہ کے ادراک کے باوجود کسی نئی راہ کا تعین کرنے سے قاصر تھا۔اس سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور آخر کار ہمارے سامنے ایک واضح لائحہ عمل آ گیا۔مجھے امید تھی کہ ان خطوط پر کام کر کے اول خان ٹھوس نتائج حاصل کر سکے گا۔

اسی لمحے ویرا نے وہ بات کہہ ڈالی جو میں سوچ رہا تھا۔وہ شکوہ کر رہی تھی۔"تم نے سلطان شاہ کے بارے میں اتنی دور تک سوچ لیا تھا لیکن مجھے ایک لفظ کی بھی ہوا نہیں لگنے دی۔"

"میں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔" میں نے پورے خلوص سے کہا۔"غصے اور مایوسی کی وجہ سے میرا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔سب کچھ اس وقت ذہن میں آیا ہے۔"

"میں نہیں مان سکتی۔" وہ بے اعتباری سے بولی۔"دماغ میں ایک خاکہ بنائے بغیر اتنے مربوط انداز میں بال کی کھال نکالنی ممکن ہی نہیں تھی۔"

"تم نہ مانو مگر حقیقت وہی ہے جو میں بتا رہا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

مجھے خیال آیا...... کہ اول خان سے طویل گفتگو میں، میں صرف سلطان شاہ کے مسئلے میں الجھا رہا اور اسے جہانگیر کی خبر گیری کے بارے میں ہدایت دینا

بالکل بھول گیا۔
میں نے تفکر آمیز انداز میں سگریٹ سلگا کر پہلا ہی کش لیا تھا کہ معمر عورت اپنی بات مکمل کر کے بوتھ سے باہر آئی۔ ہمیں باہر کھڑا دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ ہم نے اسے موقع دینے کے لیے بوتھ خالی کیا تھا ورنہ ہماری کالز کا سلسلہ جاری تھا۔
''شکریہ!'' اس نے باہر آ کر انگریزی میں ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں بہت شریف ہو۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں معمر شہریوں کا ذرا بھی احترام نہیں کرتے۔''
''کوئی بات نہیں۔ بڑے بوڑھوں کا احترام ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔'' میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔
وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہو گئی۔ ''تمہاری تہذیب! شاید تم انڈین ہو۔''
''انڈین نہیں، پاکستانی۔'' میں نے خلیقانہ مسکراہٹ سے اس کی تصحیح کی۔
''اوہ۔ میں اپنے غلط قیاس پر معذرت خواہ ہوں۔ ایک مرتبہ پھر تمہارا شکریہ۔''
مجھے اندیشہ ہوا تھا کہ کہیں وہ گفتگو کو طول دے کر ہمارا وقت برباد نہ کرے لیکن دوسری بار شکریہ ادا کر کے وہ اپنی راہ ہولی اور ہم دوبارہ بوتھ میں گھس گئے۔
کارڈ سلاٹ میں ڈال کر میں نے دوبارہ اول خان کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف اس کا کوئی آدمی تھا۔
''اول خان سے بات کراؤ۔'' میں نے فرمائش کی۔ ''سر، وہ موجود نہیں ہیں۔'' مودبانہ لہجے میں دوسری طرف سے جواب آیا۔
''ابھی ابھی تو ان سے میری بات ہوئی تھی۔'' میں نے بے ساختہ حیرت سے کہا۔
''سر، آپ شاید ڈیفی صاحب ہیں۔ آپ سے بات ہوتے ہی وہ چلے گئے تھے۔'' اس نے میری حیرت میں پوشیدہ الزام تراشی کا برا مانے بغیر وضاحت کی۔
''میں ان کا اسٹینو بول رہا ہوں۔''
''وہ آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ جہانگیر کی بھی خیر خبر رکھیں۔ اس وقت وہ بھی خطرے میں ہے۔''
''او کے سر، میں نے پیغام لکھ لیا ہے۔ دے دوں گا۔'' وہ بولا۔ میں نے کریڈل دبا کر سلسلہ منقطع کر دیا اور کارڈ سلاٹ سے باہر آ گیا۔
کارڈ اندر دبا کر اس بار میں نے سری نواسن کے گھر کا نمبر ملایا۔ فون کسی خاتون نے اٹھایا۔ میں نے انگریزی کے بجائے اردو میں اپنا نام گرنام بتا کر بدری ناتھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور وہ مجھے ہولڈ کرنے کی ہدایت دے کر غائب ہو گئی۔
بدری ذرا تاخیر سے فون پر آیا اور آتے ہی معذرت کرنے لگا۔ ''معاف کرنا مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ میں ذرا کپڑے تبدیل کر رہا تھا تا کہ آرام سے بستر میں لیٹ کر اخبار چاٹ سکوں۔''
''یہاں کے موٹے موٹے اخباروں میں، میں صرف .... کام .... کی ... خبریں ہی دیکھتا ہوں۔ انہیں پڑھنے میں مزہ نہیں آتا۔'' میں نے اس کے شوق پر رائے دیتے ہوئے کہا۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دراصل اخبار کا قصہ بھی سگریٹ کے برانڈ کے جیسا ہے۔ جس کے منہ کو جو برانڈ لگ جائے وہ بس وہی برانڈ پینا پسند کرتا ہے۔ اسی طرح اخبار بس اپنی پسند کا اچھا لگتا ہے۔''
''اس کا مطلب ہے کہ تم اخبار کو بھی ایک نشہ سمجھتے ہو؟'' میں نے ہنس کر کہا۔
اول خان سے سنگین اور تھکا دینے والی گفتگو کے بعد ذرا سی دیر کے لیے ہلکی پھلکی باتوں کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا جو اس وقت پوری ہو سکتی تھی۔
''ہاں ہاں، یہ نشہ ہی ہے۔'' اس نے پرزور لہجے میں اعتراف کیا۔
''میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو صبح کا اخبار ہاتھ میں آئے بغیر باتھ روم نہیں جا سکتے۔''
''کیا تم خود بھی ان ہی میں سے ہو؟ اخبار کی چھٹی والے دن کیا کرتے ہو؟''
وہ میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔
''میں ان میں سے نہیں ہوں۔ ایسے لوگوں کو چھٹی

والے دن قبض ہی رہتا ہوگا۔ مجھے تو پیشہ ورانہ طور پر بھی اخبار کھنگالنے پڑتے ہیں۔''
''تمہارے پیشے کا اخبارات سے ایسا کون سا گہرا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہم ملک سے باہر ہوں تو مقامی اخبارات ہی ہمیں سیاست سے لے کر فیشن تک اس شہر کے تازہ ترین اور مقبول موضوعات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان چھوٹے موٹے چٹکلوں میں اپنی دلچسپی کا اظہار کر کے ہم مقامیوں میں کئی پرجوش دوست بنا لیتے ہیں۔ محض یاری دوستی میں ایسی خبریں مل جاتی ہیں جو پیسے دے کر بھی نہیں خریدی جا سکتیں۔''
''یہ واقعی سامنے کی بات ہے۔ تمہارا یہ گراب امریکہ میں آزمایا جائے گا۔ تم امریکہ کے لیے اپنی روانگی کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔
''اگر تمہیں جاننے کی خواہش نہیں تو مجھے تمہارا وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگوں کے سینے سمندر ہوتے ہیں۔ مرتے ہیں تو اپنے ساتھ نہ جانے کیا کچھ سمیٹ لے جاتے ہیں۔''
''جاننے کی خواہش نہ ہوتی تو اس وقت تمہیں فون نہ کر رہا ہوتا۔''
''سرگباشی رمیش اگروال کی آخری رسمیں بڑی دلدوز تھیں۔'' یکایک اس کی آواز دھیمی اور راز دارانہ ہو گئی جیسے وہ ان باتوں کو سری نواسن کے اہلِ خانہ کے کانوں میں پڑنے سے روکنا چاہتا ہو۔
''ذرا کھل کر بتاؤ۔'' اس کے انداز نے میرے دل میں تجسس بیدار کر دیا۔
''اس کی ارتھی کے ساتھ صرف تین آدمی شمشان گھاٹ گئے تھے۔ ان میں سے ایک پیر میں موچ کا بہانہ کر کے اپنے ساتھ فولادی واکنگ اسٹک بھی لے گیا تھا۔ لاش کے جلتے ہوئے اس نے فولادی راڈ سے گردن اور بدن پر ایسی چار چوٹ کی مار ماری گئی کہ اس

کا کچھ باقی رہ بھی گیا ہوتو اسے دیکھ کر کچھ پتا نہیں چلے گا۔ ویسے بھی ہر چتا جلنے کے بعد یہاں کے محکمہ صحت والے بہت احتیاط سے راکھ اور ملبے کی صفائی کر کے جراثیم کش دواؤں کا اسپرے کرتے ہیں تا کہ آگ سے زندگی پانے والے جراثیم مقامی آبادی کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔"

"ان تین میں تم تو ضرور شامل رہے ہوگے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"توبہ کرو!" اس نے تمسخرانہ لہجے میں جواب دیا۔ "وہ اسٹیٹ سیکرٹ تھا۔ اس میں ہائی کمیشن کے تین ملازمین کے سوا چوتھا کوئی نہیں تھا۔"

"سرکاری کاغذات میں اندراج کراتے ہوئے کیا ظاہر کیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا

"سب کام جعلی ہوئے ہیں۔ سرکاری سطح پر ہوئے ہیں اس لیے کوئی انہیں جعلی نہیں کہہ سکتا۔ ریکارڈ میں اس کا نام راج کپاڈیا لکھا گیا تھا۔ اس نام کا ایک آدمی تین مہینے پہلے گلاسکو سے بھارت جا کر مر چکا ہے۔ وہ بالکل بے سروسامان آدمی تھا اور اس کا کہیں کوئی وراث نہیں ہے۔"

"اب رائیش اگروال کا کیا ہوگا۔ ریکارڈ پر تو وہ اب بھی زندہ ہے۔ مرا تو وارث اس کی لاش مانگیں گے۔ انہیں تمہاری سرکار کیا جواب دے گی۔"

"ہماری سرکار بڑی چنٹ ہے۔ اس کے پاس ایسے جواب ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کشمیر کا کھاتا بند ہوگیا تو اس پر ذرا وقت پڑے گا ورنہ اب تو یہی کہا جائے گا کہ رمیش کو کشمیر میں غداروں نے پکڑ کر مار دیا۔ تم اس کے بارے میں مت سوچو۔ دوسرے بہت سوچ چکے ہیں۔"

میرے لیے وہ واقعہ اتنا سرسری نہیں بلکہ عبرت انگیز تھا۔ اپنے ایک نامور سیکرٹ ایجنٹ کے قتل کو چھپا کر کسی اور کے نام سے ٹھکانے لگانا اور اس کے ورثا کو اس کی موت کی کوئی گھڑی ہوئی کہانی سنا کر لاش تک سے محروم کر دینا کسی بھی حکومت کے لیے سفاکی اور درندگی سے کم نہیں تھا۔

"اور تم کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے اس کا ردعمل جاننے کے لیے پوچھا۔

"آج وہ، کل تمہاری باری ہے۔" بدری کی آواز میں افسوس یا آزردگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"عزت کی، موت مل گئی تو اپنا مردہ ذرا شان و شوکت سے جلایا جائے گا ورنہ اس جیسا انجام تو ہونا ہی ہے۔ بس ایک اطمینان رہتا ہے کہ یوں مارے جانے والوں کے بیوی بچوں کی لاٹری نکل آتی ہے۔ سرکار انہیں مفت گھر، تعلیم، وظیفے اور خاص نوکریوں سے ایسا نوازتی ہے کہ وہ سب اپنے یتیم اور بیوہ ہونے پر رشک کرنے لگتے ہیں۔ جان کاروں اور رشتے داروں کی ہمدردی مفت میں ہاتھ آتی ہیں۔"

"یعنی تم بھی ایسے ہی انجام کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ چونک پڑا۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا...... سب کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ یہ عزت کشمیر میں مرنے والوں کے گھر والوں کو ملتی ہے تا کہ لوگ وہاں جاتے رہیں، انکار نہ کریں۔ ورنہ بہت سے خاندان تو میں نے یوں بگڑتے اور برباد ہوتے دیکھے ہیں کہ الاماں۔ ایک جوان بیوہ تو کوٹھے پر جا بیٹھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس کی ساس نائکہ بن گئی اور نو سال کا بیٹا گاہک پٹانے لگا تھا۔"

بدری ناتھ نے بہت بے باکانہ انداز میں وہ تصویر کشی کی تھی۔ جسے سن کر میں اندر سے لرز اٹھا۔ جس شخص کے سامنے اس کے معاشرے کی وہ دونوں انتہائیں یوں کھل کر بے نقاب ہو چکی ہوں وہ کیوں اور کیسے اور کب تک اپنے مقاصد سے مخلص رہ سکتا ہے۔

شیر یا عورت مغرب کی ایک شہرہ آفاق کہانی ہے۔ خوبرو شہزادی کے عاشق کو بادشاہ اپنی مجبوری کے باعث دو بند دروازوں کے سامنے کھڑا ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ صحیح دروازہ کھلنے پر اپنے محبوب کے فراق میں تڑپتی ہوئی شہزادی باہر آئی تو بادشاہ اسے اپنا داماد بنا لے گا۔ غلط دروازہ کھلا تو کئی دن کا بھوکا شیر اس

عاشق نامراد کی تکا بوٹی کر ڈالے گا۔

وہ دو بند کوٹھریوں، دو بند دروازوں اور دو انتہاؤں کی کہانی تھی جو بدری ناتھ نے مجھے سنائی۔ اس میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ عبرت بھی پوشیدہ تھی۔

"جوان بیوہ اور نو سالہ بیٹے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی جوان اور جونیئر افسر رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جو لوگ اپنے کیریر کی ابتدا میں کسی حادثے سے دوچار ہو جاتے ہیں انہیں اتنی بے رحمی سے نظر انداز کرنا سراسر زیادتی ہے۔ پرانے لوگوں کو خاص طور سے کچھ نہ دیا جائے تب بھی ان کے واجبات خاصے ہوتے ہیں...... یہ سب تمہاری ملازمت کی پیچیدگیاں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس مزید دلچسپ خبریں کیا ہیں۔"

"ہاں، ان باتوں میں پڑ کر میں اصل قصہ بھول ہی بیٹھا۔ رمیش اگروال کے خون کو برٹش اتھارٹیز سے سختی سے چھپایا گیا ہے لیکن ہمارے ہائی کمیشن میں یہ ایک کھلا راز ہے جس پر... چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے باتیں کررہے ہیں اور سخت خوف زدہ ہیں۔"

"گیتا، جیمو اور رائیش کے بعد انہیں اپنی باری آتی ہوئی نظر آرہی ہوگی۔"

"یہی اصل مسئلہ ہے۔ اپنی اپنی سلامتی کے خوف کے ساتھ ہائی کمیشن کے بڑوں کو میری سلامتی کی فکر پیدا ہوگئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ رمیش کے بعد اب میری باری ہے۔ اس بار انہوں نے مجھ سے مشورہ کر کے دو تجربے کار آدمی میری حفاظت پر لگا دیے ہیں۔"

"یہ سب متوقع باتیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ کراچی والے بندر کا کیا حال ہے۔" میں نے نک موڈلے کا نام لیے بغیر پوچھا۔ "تمہارے مستقبل کا انحصار اس کے فیصلوں پر تھا۔"

"میرے یہاں پہنچ جانے کے بعد وہ یہاں سے بھیجی گئی رپورٹوں کا محتاج ہے۔"

"تو کیا تمہارے بارے میں باضابطہ رپورٹیں بھیجی جارہی ہیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"مجھے صحیح علم نہیں۔ سفارتی تھیلوں کے ذریعے کوئی بھی چیز ایک سے دوسری جگہ بھیجی جاسکتی ہے اور اسے کہیں چیک نہیں کیا جاسکتا۔"

وہ اپنے شعبے کی وجہ سے اس قسم کی پراسرار... سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود اپنے معاملے میں ہونے والی کارروائیوں سے بے خبر تھا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "لکھ کر بھیجی جائے یا فون پر دی جائے رپورٹ، رپورٹ ہی ہوتی ہے۔ اس کی روشنی میں بندر بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے جو یہاں والے اخذ کئے بیٹھے ہیں، اسی کی بنیاد پر اس نے مجھے فوری طور پر لندن چھوڑ دینے کی ہدایت کی ہے۔"

"کیا اس نے تم سے براہ راست رابطہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں آنے کے بعد آج اس نے پہلی بار اس فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرے ہائی کمیشن کو میرے سفر کی فوری تیاری کا مشورہ دے چکا ہے۔"

"یہ خبر تو تمہیں اپنے دوستوں سے بھی مل جاتی پھر اسے براہ راست فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ براہ راست میرے تاثرات جاننا چاہ رہا تھا۔ اس کے سر پر ڈیبی کا بھوت سوار ہے۔ وہ ایسی کوئی شہادت تلاش کرنے کے لیے بے چین ہے جس سے یہ پتا چل سکے کہ ڈیبی اس وقت لندن میں موجود ہے اور وہی اس کشت وخون کا ذمے دار ہے۔"

"تو کیا وہ ایسی شہادت حاصل کر کے ڈیبی کو پھانسی چڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے؟"

"ڈیبی ان لوگوں کا اشتہاری مجرم ہے۔ پاکستان میں اسے ایجنسیوں کی پشت پناہی حاصل ہے اس لیے وہ آج تک ان کے ہاتھ نہیں آسکا۔ اگر اسے بھنک بھی مل جائے کہ اس وقت ڈیبی کسی مغربی ملک میں سرگرم عمل ہے تو وہ اس کی تلاش میں اپنے سارے وسائل جھونکنے پر تیار ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ رمیش کو چھوڑ کر دوسرے دو کو ٹھکانے لگانے والا کون تھا؟"

"پہلے مجھے تم پر شبہ تھا۔ تمہارے انکار کے بعد وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے اس سے یہی کہا کہ ڈیبی ایک چھلاوا ہے۔ وہ کہیں بھی جھپٹتا ہے اور نیا وار کر کے کوئی نشان چھوڑے بغیر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہی لندن میں منڈلا رہا ہو۔"

"یعنی تم نے اس کے شکوک وشبہات کو تقویت پہنچانے کی... کوشش کی ہے۔"

"پھر اور کیا کرتا۔ اپنی ذات کو الزامات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی خیالی دشمن کے پیچھے بھاگتا رہے۔ ڈیبی یہاں ہو یا نہ ہو، وہ مجھے اور تمہیں بھول کر صرف اسی کو ڈھونڈتا رہے گا۔" اس کے لہجے میں اچانک نفرت انگیز تلخی عود کر آئی۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اس بندر نے مجھ سے کیا سلوک کیا تھا۔ مجھے اپنوں سے یہ شکوہ ہے کہ انہوں نے کچھ دیکھے بھالے بغیر بے خبری میں مجھے میری تنظیم سے نکال کر اس حرامی بندر کے حوالے کر دیا اور بندر نے ذرا بھی لحاظ کئے بغیر میرے ساتھ ایسی ایسی بدسلوکیاں کیں کہ میں نے اس سے انتقام لینے کے لیے بغاوت کا فیصلہ کر لیا اور اب تم میرے ساتھ ہو۔"

"فون پر ایسی کھلی کھلی باتیں کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی خوف نہیں کہ یہ گفتگو کوئی نہ سن لے۔" میں نے ایک فوری خوف کے تحت جھرجھری لے کر پوچھا۔

معنی خیز انداز میں ہنسنے کی آواز کے بعد اس کی آسودہ آواز ابھری۔ "اب میں کراچی کی طرح یہاں بے سروسامان نہیں ہوں۔ رمیش کے سرگباش ہونے کے بعد میری ذات شک وشبہات کے دھندلکوں سے نکل کر دوبارہ عزت کے اجالے میں آگئی ہے۔ میرے پاس بہت سے وسائل آگئے ہیں جن میں چھوٹی سی مگر بیش قیمت سی ایس ڈی بھی ہے جو اس وقت کام کر رہی ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہماری یہ باتیں کوئی سن رہا ہے اور نہ یہ ریکارڈ ہو رہی ہیں۔"

اس کی زبان سے سی ایس ڈی سنتے ہی میرے ذہن میں فوجیوں کی خریداری کے لیے قائم کئے جانے والے روزمرہ ضروریات کی اشیا کے کفایتی اسٹور گھوم گئے اور میں بے اختیار پوچھ بیٹھا۔ "یہ سی ایس ڈی کیا بلا ہے؟"

میرے کانوں میں اس کی آسودہ سی ہنسی گونجی پھر وہ بولا۔ "یہ فورسز والا سی ایس ڈی نہیں ہے بلکہ سنز سینسنگ ڈیوائس کا مخفف ہے۔ یہ اس قدر حساس ہے کہ اسے کسی لائن سے منسلک کر دیا جائے تو یہ دو براہ راست لائنوں کے درمیان گفتگو تک خاموش رہتا ہے۔ کوئی غلطی سے کسی لائن کا ایکس ٹنشن بھی اٹھا لے تو اس پر سرخ روشنی کے ساتھ الارم بیپ گونجنے لگتا ہے۔"

"یہ را کی کوئی خاص ایجاد ہے؟" رازداری کا یقین ہو جانے پر میں نے کھل کر پوچھا۔

"الیکٹرونکس کے معاملے میں جاپان سب سے آگے ہے۔ را نے یہ آلے ریڈ آرمی سے خریدے ہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے حقیقت بیان کر دی۔

ریڈ آرمی بھی اوم شری انکو کی طرح جاپان کی سرزمین پر قائم کی ہوئی ایک صیہونی دہشت گرد تنظیم تھی جو آئے دن اخبارات میں دہشت گردی کے لرزہ خیز وارداتوں کی خبروں کا موضوع بنتی رہتی تھی۔ میرے لیے یہ اطلاع حیرت انگیز تھی کہ ایک طرف را والے ڈیوڈ اسٹارز سے پینگیں بڑھا رہے تھے تو دوسری طرف عالمی دہشت گرد تنظیموں کی فنی مہارت سے بھی استفادہ کر رہے تھے۔

"سی ایس ڈی کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

"میں اپنی سی ایس ڈی تمہیں دے نہیں سکتا۔ یہ بازار میں دستیاب نہیں ہے۔ ریڈ آرمی والے اپنی اس ایجاد کے سات ہزار ڈالر طلب کرتے ہیں جو میرے یا تمہارے لیے بہت زیادہ ہیں۔"

"تم کچھ دیر کے لیے یہ آلہ مجھے مستعار تو دے سکتے ہو؟" میں نے پرخیال لہجے میں پوچھا۔

"کیوں؟ تمہیں اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم نے کہا تھا نا کہ میں ڈیبی بن کر آ تزک بیل کو خوف زدہ کروں۔" میں نے معصومیت سے اسے یاد دلایا۔

"تم نے ابھی تک اس سے رابطہ نہیں کیا؟" وہ ذکر آنے پر بدری چونکا تھا۔

"تذبذب میں تھا۔ ڈیبی پاکستان میں ہے۔ آ تزک نے یہ ٹریس کر لیا کہ اسے لندن سے فون کیا جا رہا ہے تو بھانڈا پھوٹ جائے گا اور وہ سازش کی بو سونگھ لے گا۔ یہ لوگ بہت ترقی یافتہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے فون میں لگا ہوا کوئی آلہ آن ہوتے ہی یہ بتا دیتا ہو کہ فون کس ملک، شہر اور نمبر سے کیا جا رہا ہے۔"

"ہم لوگ ایسی ایجادات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ فی الحال یہ مستقبل کا ایک خواب ہوسکتا ہے۔ ایسی کسی سہولت کا وجود نہیں ہے البتہ دوسرے فون ایکسچینج سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فلاں نمبر پر کال کہاں سے آئی ہوئی ہے۔" بدری نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ "ایک سہولت ایکسچینج میں موجود ہے تو اسے شاید عام کرنا دشوار ہو مگر تھوڑی سی رقم خرچ کر کے چند چیدہ چیدہ نمبروں پر منتقل کرنا تو ناممکن نہیں ہونا چاہیے۔"

"خصوصی بندوبست تو ہزاروں ہوسکتے ہیں۔ ہر چیز جو ایک جگہ موجود ہو اسے دوسری جگہ تک پہنچانا واقعی ناممکن نہیں ہوتا مگر اب میری حفاظت کا بندوبست ہونے کے بعد میرا تم سے ملنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے ورنہ تم دس پندرہ منٹ میں سی ایس ڈی سے اپنا کام نکال کر اسے لوٹا سکتے تھے۔ اب وقت بھی نہیں رہا۔ ہوسکتا ہے کہ کل میں نیویارک کے لیے پرواز کر جاؤں۔"

"کیا ابھی تک تمہاری سیٹ کنفرم نہیں ہوسکی؟" میں نے سی ایس ڈی کو فراموش کر کے گفتگو کا رخ اس کی روانگی کی طرف موڑ دیا۔

"یہاں سے روز بے شمار پروازیں امریکا کے لیے روانہ ہوتی ہیں۔ ڈیلٹا، اٹلانٹا اور یونائیٹڈ ائرلائن کی گیٹ وک اور ہیتھرو سے بیسیوں پروازیں ہیں مگر اگلے چار پانچ دن کے لیے کسی پر سیٹ نہیں ہے۔"

"تو کیا پورا برطانیہ امریکا منتقل ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بیشتر ایشیائی مسافر سفر کی حالت سے بچنے کے لیے چند دن لندن میں ٹھہر کر آگے جاتے ہیں اس لیے یہ روٹ شاید دنیا کا مصروف ترین فضائی روٹ ہے۔ بہت سی ایشیائی کمپنیاں صرف یورپ اور لندن تک ہی آتی ہیں۔ ان کے مسافر بڑی امریکی ائرلائنز سے بحراوقیانوس عبور کرتے ہیں۔ یہاں سے امریکا کے لیے فوری طور پر سیٹ ملنی عام طور سے مشکل ہوتی ہے مگر کوئی نہ کوئی راہ نکلے گی۔"

"تم ائرانڈیا سے رابطہ کیوں نہیں کرتے۔ وہ پیچھے سے آنے والے کسی بھی مسافر کو روک کر تمہیں اگلی پرواز سے نیویارک بھیج سکتے ہیں۔"

"یہ میرا نہیں، ہائی کمیشن کے ٹریول سیکشن کا کام ہے کہ میری روانگی کا بندوبست کرے اور ان لوگوں کو اپنے کام میں ماہر ہونا چاہیے۔ اصولی طور پر تمہارا مشورہ درست ہے۔ ائرانڈیا یہاں سے امریکا کے لیے آپریٹ نہ کرتی ہو تو تب بھی اس روٹ پر اس کا کسی اور سے معاہدہ ہوگا۔ بس سمجھ لو کہ میں نکل جاؤں گا۔"

"مجھے سیٹ ملنے میں دشواری ہوگی۔ یہ بتاؤ کے نیویارک میں تمہارا رابطہ کیا ہوگا۔"

"وہاں میرا ایک کزن ہوٹل چلا رہا ہے۔ میں اس کا فون نمبر دیکھ کر بتاتا ہوں۔"

"یہ بھی کیتھی والا تجربہ تو نہیں ہوگا؟" میں نے ماضی کی تلخی کے پیش نظر پوچھ لیا۔

"ہرگز نہیں۔ شیام ناتھ میرا دور کا کزن ہے۔ تم اس سے گرنام بن کر ہی بات کرنا۔ مسلمان کے نام پر وہ زیادہ خوش نہیں ہوگا۔"

"یعنی تم وہاں بھی اپنے کزن کے ساتھ نہیں ٹھہرو گے۔ تمہارا سفارت خانہ تمہاری دیکھ بھال کرے گا؟"

"تمہارے دونوں سوالوں کے جواب نفی میں ہے۔ اس بار مجھے خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ میں اپنے سفارت کاروں وغیرہ سے دور رہوں گا۔ لندن سے نکلنے کے بعد تک موڈ لے براہ

راست کوئی بندوبست کرے گا۔ وہاں کیا ہوتا ہے، یہ میرے علم میں نہیں ہے۔"

یہ گفتگو بھی خاصی طویل ہو چکی تھی۔ اس دوران میں کئی افراد لمحہ بھر کے لیے بوتھ کے سامنے ٹھٹکے تھے اور اسے ہمارے زیر استعمال دیکھ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ کسی نے باہر رک کر بوتھ خالی ہونے کا انتظار نہیں کیا تھا۔

"بس میں تمہارے سفر کے لیے نیک تمنائیں ہی پیش کر سکتا ہوں۔ اب مجھے شیام ناتھ کا نمبر دے دو۔" میں نے ویرا کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں بدری ناتھ اپنی کسی ڈائری وغیرہ کی ورق گردانی کر کے مطلوبہ نمبر نکال چکا تھا۔ وہ رک رک کر نمبر بتاتا چلا گیا، میں ہندسے دہراتا رہا اور ویرا نے وہ نمبر نوٹ کر لیا۔

مزید چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

"اب جہانگیر کی باری ہے یا اول خان کو دوبارہ دیکھو گے؟" ویرا نے پوچھا

"اول خان کے لیے پیغام دے چکا ہوں جو اسے مل جائے گا۔ جہانگیر کے بارے میں تذبذب ہے کہ اسے فون کروں یا نہ کروں۔" میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈال کر کہا۔

"کیوں؟ کیا وہ سو گیا ہوگا؟"

"مجھ سے بات کرنے کے لیے وہ گہری نیند سے بیدار ہونے میں بھی خوشی محسوس کرے گا۔ مسئلہ اس کی شراب نوشی کا ہے۔ وہ اس وقت گہرے سرور کے عالم میں ہوگا۔"

"پھر تو میں اسے فون کرتی ہوں۔" ویرا خوش ہو کر بولی۔ "اسے گھیرنے میں مزہ آتا ہے۔"

میں مسکرا کر رہ گیا۔

سڑک کے کنارے لگے ہوئے اسٹریٹ لیمپس کی روشنی نے بند بوتھ کے اندرونی حصے کو روشن کیا ہوا تھا اس کے باوجود بوتھ کی چھت میں روشنی نصب تھی۔ لندن کے کسی آوارہ گرد یا بھٹکے ہوئے شرابی نے روشنی توڑنے یا بلب اتار کر لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ویرا نے مجھ سے پوچھے بغیر جہانگیر کا نمبر ملایا جو اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔

ویرا کے کان سے کان ملائے بغیر ریسیور میں پیدا ہونے والی مدھم آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ میں ویرا سے لگ کر کھڑا ہوا تو آوازیں واضح ہو گئیں۔ جب میں بات کر رہا تھا تو ویرا میرے اوپر یوں جھکی ہوئی تھی جیسے اسے باتیں سننے میں دشواری ہو رہی ہو۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد بین الاقوامی کال ملنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ ڈائلنگ کی آوازیں رکنے کے بعد ریسیور پر سکوت طاری ہو گیا۔ چند ثانیوں بعد گھنٹیاں بجنے لگیں۔

تیسری گھنٹی پر جہانگیر کی آواز سنائی دی۔ وہ نیند کے ساتھ نشے میں بھی تھا۔

"ہیلو؟ ڈارلنگ! کیا تم سو رہے تھے؟" ویرا نے انگریزی میں بہت محبت کے ساتھ پوچھا۔

"ہائیں...... ڈ...... ڈارلنگ! ام...... میں تمہارا ڈارلنگ...... تم کون ہو؟" جہانگیر کی خمار سے بوجھل اور لکنت آمیز آواز میں بلا کی حیرت اُمڈ آئی تھی۔ وہ پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے انگریزی میں ہی جواب دیا تھا۔

"تو اب تم میری آواز بھی نہیں پہچانتے۔" ویرا نے نخریلی آواز میں شکوہ کیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم جہانگیر ہی ہو یا کوئی غلط نمبر ملا بیٹھی ہوں۔"

"میں...... میں جہانگیر ہی ہوں۔" اس کی آواز قدرے عجلت آمیز تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں ویرا فون بند ہی نہ کر دے۔ "تم باتیں کرتی رہو میں یقیناً تمہیں پہچان لوں گا۔"

"تمہاری بوجھل اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے پتا چل رہا ہے کہ اس وقت تم نشے میں ہو۔"

"ہاں...... تم جیسی لڑکیاں مل کر بچھڑ جائیں تو ان کے سوگ میں پینی پڑتی ہے۔"

"میرا نام یاد نہیں اور میرے غم میں پی رہے ہو؟" ویرا نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔

"نام میں کیا رکھا ہے۔ سامنے آؤ گی تو جھٹ

...وں گا۔ کب آ رہی ہو؟"

...معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری بیوی گھر پر نہیں ہے۔"

...طنز سے کہا۔

"ہائیں! تم تو ولی اللہ ہو گئیں۔ تمہیں کیسے پتا چلا ...گھر پر نہیں ہے؟"

"وہ ہوتی تو تم مجھ سے اس طرح کھل کر باتیں نہ ...رہے ہوتے۔"

"تم...... تم بہت ذہین ہو...... سالے ڈیپی کی ...ح۔" وہ جھونک میں بول رہا تھا۔ "کبھی کبھی وہ بھی ...ی کی بیٹ دیکھ کر اس کا پورا حسب نسب بتا دیتا ہے۔"

اس کی زبان سے اپنی مٹی پلید ہوتے سن کر میں ...تا گیا۔ میں نے ویرا سے ریسیور لینا چاہا مگر اس نے ...زبردستی الگ دھکیل دیا۔

"یہ ڈیپی کون ہے؟" ویرا کے لیے اپنی ہنسی پر قابو ...رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

جہانگیر کے ایک گہرے سانس کی آواز آئی "یار ...اپنا...... بہت بے جگر آدمی ہے۔ پتا نہیں آج کل ...کہاں مرا ہوا ہے۔ اس وقت اسے چھوڑو۔ آپس کی ...باتیں کرو۔"

"بیوی گئی ہوئی ہے۔ دوست غائب ہے اور تم ...گھر میں اکیلے ہو۔ مجھے تم پر بہت ترس آ رہا ہے۔ ...مجبوری نہ ہوتی تو اسی وقت دوڑ کر تمہارے پاس آ جاتی۔"

"تم کتنی دور ہو...... کیا امریکا میں ہو؟" جہانگیر ...کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

"تمہیں امریکا کیوں یاد آ گیا؟"

"تم اتنی اچھی انگریزی جو بول رہی ہو۔" اس ...کے مخمور ذہن میں جواب محفوظ تھا۔

"تو کیا پاکستان میں رہنے والی کوئی لڑکی اچھی ...انگریزی نہیں بول سکتی۔"

"یہ کالے انگریز!" جہانگیر کی آواز تحقیر آمیز ہو گئی۔ "یہ کیا انگریزی بولیں گے۔ انگریزی بولنے کے چکر ...میں اپنی ماں کی ٹانگ توڑنے لگتے ہیں۔"

وہ انگریزی میں مدر ٹنگ کو ٹنگ آف مدر کہہ گیا تھا۔ ویرا نے فوراً بات پکڑ لی۔ "یہ ماں کی زبان کیا ہوتی ہے۔ میں یہ اصطلاح پہلی بار سن رہی ہوں۔"

"اس کو بھاڑ میں ڈالو۔" یہ کہہ کر اس نے انگریزی میں بے مقصد گالیاں دیں۔ وہ بری طرح بہک رہا تھا۔ اسے اپنی زبان پر ذرا بھی قابو نہیں تھا۔ الفاظ اس کی زبان سے دراز ہو کر اور بگڑ کر ادا ہو رہے تھے۔ یہ صرف ایک اجنبی نسوانی آواز کا کرشمہ تھا کہ فون پر بولے جا رہا تھا ورنہ اس حالت ...... سرور میں آدمی کو آرام سے زیادہ کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی۔

گفتگو کی ابتدا سے ہی اس نے خود کو سنبھالے رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر اس مرحلے پر وہ بالکل ہی پٹری سے اترتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں اس کی گالیوں کا تسلسل ٹوٹنے کا منتظر رہا اور پانچویں گالی شروع ہوتے ہی میں نے کریڈل دبا دیا۔ مجھے جہانگیر پر غصہ آنے کے ساتھ گہرا افسوس بھی ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے ویرا سے بھی خفت محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ جہانگیر بہرحال میرا دوست تھا اور اس کے بگڑنے کی کچھ ذمے داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔

"بہت دلچسپ آدمی ہے۔" باہر آ کر ویرا ہنستے ہوئے بولی۔ "ذرا سی دیر اور کال جاری رہنے دیتے تو وہ پوری طرح ترنگ میں آ چکا ہوتا۔ تمہیں پتا ہے کہ میں گالیوں والیوں کی پروا نہیں کرتی۔"

"وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی گردن دبا دیتا۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ وہ بگڑ کر اب عادی شرابی بن چکا ہے۔ اگر اس کے دوران خون میں الکحل کی خاصی مقدار شامل نہ رہے تو شاید وہ اعصابی کھچاؤ اور ذہنی ابتری سے بے حال ہو جائے۔"

"اس کا واحد سبب اس کی تلخ ازدواجی زندگی ہے۔" ویرا سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے اندازا تھا کہ وہ اس وقت برے حال میں ہوگا اسی لیے میں اسے فون کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ صبح اپنے ہوش و حواس میں آئے گا تو شاید تمہاری

کال اس کے ذہن سے محو ہو چکی ہوگی۔''
''ایسے غیر ذمے دار اور بے پروا آدمی کی حفاظت کون کرسکتا ہے؟ اس وقت صرف ایک آدمی بھی چاہے تو آسانی سے اسے اغوا کر کے لے جاسکتا ہے۔''
''شاید یہ سب ہمارے ان گناہوں کا کفارہ ہے جو ہم نے شی میں رہ کر کیے تھے۔'' میں نے ملول آواز میں کہا۔
''وہ نشے میں ہے اور تم پر قنوطیت طاری ہو رہی ہے۔'' ویرا نے میرے بازو میں چٹکی لی۔
''ایسی باتوں پر دل بہت اداس ہونے لگتا ہے۔ اپنی غفلتوں کی وجہ سے وہ کہیں مارا گیا تو میں اپنے ذہن پر سے یہ بوجھ کبھی نہ اتار سکوں گا۔ اب اسے سنبھل جانا چاہیے۔''
''اسے بہت پہلے سنبھل... جانا چاہیے تھا۔ اب کی کیا بات ہے؟''
''پہلے وہ اکیلا تھا۔ اب وہ ایک عورت کا شوہر اور بچے کا باپ ہے۔''
''ہاں...... یہ فرق تو ضرور پڑا ہے۔'' لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوگئی پھر چونک کر بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔'' تمہاری جبری شادی کو کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ تم کب باپ بن رہے ہو؟''
''تم بہت بے شرم عورت ہو۔'' میں نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔'' یہ سوال تمہیں میرے بجائے غزالہ سے کرنا چاہیے تھا۔ عورتوں کی باتیں عورتوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔''
''آج تک اس بارے میں خیال ہی نہیں آیا۔ اس وقت بھی تم نے جہانگیر کے باپ ہونے کا ذکر نہ چھیڑا ہوتا تو میں نے تم سے وہ سوال نہ پوچھا ہوتا جسے تم بے شرمی قرار دے رہے ہو۔''
میں خاموش رہا۔ اس موضوع کو طول دینا مجھے نامناسب معلوم ہو رہا تھا۔
''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد وہ میرے پہلو میں ٹھوکا دے کر بولی۔'' غزالہ سے تو میں اس کے ماں بننے کے بارے میں پوچھوں گی۔ باپ بننے کے مسئلے پر تو تم روشنی ڈال سکتے ہو۔''
''اس بارے میں پھر کبھی بات ہوگی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔
''ایسا تو نہیں کہ تم خاندانی منصوبہ بندی والوں کی تشہیر سے متاثر ہوگئے ہو۔'' اس نے میرے لہجے کی پروا کیے بغیر ڈھٹائی سے پوچھا۔'' دو بچوں کو تو وہ خود بھی اچھا کہتے ہیں۔''
''اب تم نے اپنی زبان کو لگام نہیں دی تو میں الگ کمرا لے لوں گا۔'' میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔'' میری نجی زندگی کو اتنا نہ کریدو کہ میں بیزار ہو جاؤں......''
''چلو۔ میں خاموش ہوگئی۔'' میری بات کاٹ کر اس نے میری توقع کے برعکس اس بار ہتھیار ڈال دیے اور میں نے بڑھ کر کاؤنٹر سے اپنے کمرے کی چابی لے لی۔
''کیوں نہ ریستوران میں کھانا کھانے کے بعد اوپر چلا جائے؟'' ویرا نے تجویز پیش کی اور میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا رخ ریستوران کی طرف موڑ لیا۔
مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی تھی کہ ویرا نے میری سختی کا برا نہیں منایا تھا لیکن میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ویرا کے ذہن میں ایک بار جو سوال آجائے اس کا جواب حاصل کر کے ہی دم لیتی ہے۔
میں نے کسی نہ کسی طرح ویرا کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن غزالہ کے لیے ویرا کو ٹالنا اتنا آسان نہ ہوتا۔ میں اس گھڑی کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا جب میں نے روا روی میں جہانگیر کے باپ ہونے کا ذکر کر کے ویرا کے ذہن میں خود ہی ایک سوال انڈیلا تھا۔ یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں وقت ضائع کیے بغیر غزالہ کو بھی خبردار کر دیتا تاکہ وہ ویرا کے حملہ آور ہونے سے پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیتی۔
اس وقت تک ریستوران میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ہال میں کئی خوش نما چہرے نظر آ رہے تھے۔ باہر کی خنک فضا کے مقابلے میں بند ہال ملی جلی خوشبوؤں اور جسموں کی مہکار سے بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ اس وقت تک کچن کے حصے سے آنے والی خوشبوئیں ہال میں نہیں پھیلی تھیں۔ ہمیں نیم تاریک گوشے میں چار نشستوں والی پسندیدہ میز مل گئی۔
ویٹریس نے ہم دونوں کے سامنے مینو کارڈ رکھے تو ویرا نے مجھ سے پوچھے بغیر اسے دو لارج وہسکی اور سوڈا لانے کی ہدایت دے دی۔ میں نے انکار کی خواہش کو ہونٹوں پر آنے سے پہلے گھونٹ دیا۔ ان لمحات میں میرا وہ انکار ویرا کو ٹھیس پہنچا سکتا تھا۔ غنیمت یہی تھا کہ اس نے پوری یا آدھی بوتل کے بجائے لارج پیگ منگوانے پر اکتفا کیا تھا جو کھانے کے انتظار کے وقفے میں شغل کے طور پر ختم کیے جاسکتے تھے۔
مغربی کھانوں کے بارے میں میری معلومات اچھی ہی تھیں۔ ابتدائی مشوروں کے بعد میں نے اپنا مینو کارڈ میز پر ڈال کر کھانوں کا انتخاب ویرا پر ڈال دیا۔ پاکستان میں طویل عرصہ گزار کر وہ خود بھی چٹ پٹے کھانوں کی عادی ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خود بھی روکھے پھیکے کھانے پسند نہیں کرے گی۔
ویٹریس ایک ٹرے میں دو گلاسوں کے ساتھ دیگر لوازم لے آئی۔ ادب سے گلاس ہم دونوں کے سامنے رکھ کر اس نے انفرادی اجازت سے گلاسوں میں برف کے چند ٹکڑے ڈالے، سائفن سے گلاسوں میں سوڈے کی دھاریں ڈالیں اور مسکراتی ہوئی رخصت ہوگئی۔ درمیان میں ویرا نے اسے کھانے کے بارے میں بتا دیا تھا۔
''یہ وہ خدمات ہیں جن کے لیے مجموعی بل پر ہوٹل والے سروس چارجز لیتے ہیں۔'' میں نے ویٹریس کی شائستہ خرامی سے محظوظ ہوتے ہوئے ویرا سے کہا۔
''سروس چارجز تو ہوتے ہی ہیں لیکن ہوٹل کے بار کے مقابلے میں یہاں یہ پیگ کہیں زیادہ مہنگا ہوگا۔ یہ سب دراصل ماحول کی فراہمی اور نگاہوں کی آوارگی کے دام ہوتے ہیں جسے آسودہ حال لوگ خوشی خوشی ادا کرتے ہیں اور چوں تک نہیں کرتے۔'' ویرا بولی۔
''سلطان شاہ کی آزادی کے نام۔'' ویرا اپنا گلاس اٹھا کر مسکرائی۔
اس شام کے لیے ہم دونوں کی سب سے بڑی تمنا وہی تھی۔ میں نے گلاس اس کی طرف لہرایا اور پھر دونوں گلاس ہونٹوں سے جا لگے۔
ویرا نے بہت نزاکت اور شائستگی سے ایک ہلکی سی چسکی لے کر گلاس میز پر رکھا اور سگریٹ سلگانے لگی۔ مجھے شرمندگی ہوئی کہ میرے پہلے گھونٹ میں چوتھائی سے زیادہ گلاس خالی ہو چکا تھا۔
''یہ اچھی جگہ ہے۔ کمال ہے کہ پہلے ہمیں ادھر آنے کا خیال نہیں آیا۔'' سگریٹ کا کش لے کر ویرا ہال کا جائزہ لیتے ہوئے آسودہ لہجے میں بولی۔
''ہمیں یہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ تم یہ بھی بھول رہی ہو کہ ہم اب تک پہچانے جانے کے خوف سے چھپتے رہے ہیں۔ آج ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا ہے تو ادھر کی سوجھی ہے ورنہ کون ادھر کا رخ کرتا۔''
''تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں شمپین لی تو میرا دماغ بہت...... پراگندہ تھا۔ عملی طور پر اس وقت بھی حالات جوں کے توں ہیں مگر ایک راہ نظر آجانے کے بعد پریشانی کم ہوگئی ہے۔''
کسی ریڈار کی طرح بہت دھیرے دھیرے گھومتی ہوئی اس کی گردن جب کئی سیکنڈ تک ایک ہی جگہ رکی رہی تو میں نے چونک کر آہستہ سے پوچھا۔'' تمہیں ادھر کیا نظر آگیا جو نظریں جم کر رہ گئی ہیں۔''
''ایک سفید فام جوڑا۔'' اس نے اپنے ہدف سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔
''کیا مرد بہت وجیہہ اور طرح دار لگ رہا ہے؟'' میں نے از راہ مذاق پوچھا۔
''نہیں۔ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہم آئے تو یہ دونوں ہوٹل کی لابی میں پڑے ہوئے صوفوں پر یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں اور اب یہاں موجود ہیں۔''

''اپنی نظریں ادھر سے ہٹالو۔ بلاوجہ انہیں گھورتی رہوگی تو وہ بھی تمہاری ذات میں دلچسپی لینی شروع کردیں گے۔ یہ اتفاق... بھی ہوسکتا ہے۔ اسے اہمیت مت دو۔''

ویرا نے سر جھٹک کر میری آنکھوں میں جھانکا، گلاس سے ایک اور چسکی لی اور مسکرانے لگی۔

''میرا دماغ خراب نہیں ہے جو اجنبی مردوں کو گھورتی پھروں۔'' چند ثانیوں تک خاموشی سے مسکرانے کے بعد وہ لب کشا ہوئی۔ ''میری نظریں اس پر صرف اس لیے مرکوز ہوئیں کہ وہ پہلے سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی اس نے سٹپٹا کر اپنی گردن سیدھی کرلی مگر بعد میں کن انکھیوں سے میرا جائزہ لینے کی کوشش کررہا تھا۔''

''ایسا ہے تو یہ بات تشویش ناک ہے۔ تم کہہ رہی تھیں کہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو تو کیا تم پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکی ہو؟''

''عورت کی پشت میری طرف ہے لیکن مرد میری نظروں میں ہے۔ اپنے کھڑے کھڑے خدوخال، لمبی ناک اور قدرے جھلسی ہوئی رنگت کی وجہ سے وہ اطالوی معلوم ہورہا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میں کہیں نہ کہیں اسے دیکھ چکی ہوں یا پھر اس سے مل چکی ہوں۔''

''اگر وہ پہلے لابی میں بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے کاؤنٹر سے رہائشی کمرے کی چابی لی ہے۔ ہم کھانا کھائے بغیر بل ادا کرکے عجلت میں یہاں سے چل دیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انہیں علم ہوچکا ہے کہ ہم اسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔''

''ہمیں بھاگنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے دوبارہ اسی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ ''الو کا پٹھا پھر اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے متوجہ ہوتے ہی نظریں چرالیں۔''

برطانیہ میں موجود ایک مشتبہ اطالوی کا وجود سامنے آتے ہی میرے ذہن میں مافیا کا ہولناک ہوا کھڑا ہوگیا۔ مافیا جو ایک اطالوی جزیرے سسلی میں برسہا برس پہلے وجود میں آئی، کسی ہزار پا بلا [...] پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے بڑوں کو [...] ان کا حصہ ادا کیے بغیر کہیں بھی کوئی منظم گروہ [...] سکتا تھا۔

ڈیوڈ اسٹارز کا قصہ شروع ہونے سے [...] مافیا شی کی سب سے طاقت ور حریف تھی۔ شی سے [...] انحراف کے بعد مافیا کے تیسرے درجے کے ایک [...] نے مجھے اپنے ساتھ مل بیٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں [...] پیشکش نہ قبول کرتا تو موت کا پیغام میرے [...] تھا۔ میں شی کا باغی تھا۔ مافیا والے مجھے پناہ فراہم کر [...] تھے۔ میں نے وقتی طور پر حالات سے سمجھوتا کرلیا۔

بعد میں میں نے اپنی حکمت عملی سے کام [...] کراچی میں شی اور مافیا کو ایک دوسرے کے [...] لاکھڑا کیا۔ ان میں چند خوں ریز تصادم ہونے کے [...] شی اس بری طرح بکھری کہ پھر بکھرتی ہی چلی گئی [...] کی تباہی میں مافیا نے بھرپور رول ادا کیا تھا۔

پاکستان کی حد تک اپنے حریف کا صفایا ہو [...] کے بعد میں نے اپنی ساری توجہ دوسرے دشمن پر [...] کردی۔ ایس ٹی ایف کے خفیہ تعاون اور میری [...] سے مافیا کے بیشتر بڑے آپریشن پے درپے ناکامی [...] شکار ہونے لگے۔

میں مافیا کے مقامی چیف کا دست راست تھا [...] لیے مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ میں [...] مافیا کے چیف کی اصلیت کا سراغ لگالیا۔ وہ ایک لکھ [...] سیٹھ حبیب جیوانی تھا جسے جرمنی میں ہیروئن [...] کرنے کے الزام میں عمر قید ہوئی تھی۔

مافیا والوں نے جیل میں اس کا متبادل پہنچا [...] اسے فرار کرادیا تھا۔ اس سودے بازی کے [...] میں حبیب جیوانی ساری عمر کے لیے مافیا کا غلام بن [...] گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے سامنے آتے [...] جرمن حکام کو جیل میں ہونے والی سازش کا علم ہوجا [...] اور وہ دوبارہ اندر پہنچا دیا جاتا۔

میرے لیے وہ موت وزیست کی کشمکش کا ایک [...] بھیانک دور تھا جس کا اختتام حبیب جیوانی اور مافیا کی [...]

مکمل تباہی پر ہوا اور ان کا کوئی ڈان اس بربادی کو نہیں ٹال سکا۔

پہلی مرتبہ بڑے کے رابطوں سے آزاد ہونے کے بعد مجھے مکمل خود مختاری حاصل ہوئی اور میں ملک دشمنوں کو چن چن کر ٹھکانے لگانے کے مقدس کام میں مصروف ہوگیا۔

پاکستان کے سوا دوسری تمام عالمی منڈیوں میں شی اور مافیا کا راج تھا اور وہ دونوں حریف میرے لہو کے پیاسے تھے۔ ذلت اور بربادی سے دوچار ہونے کے بہت بعد میں انہیں علم ہوگیا تھا کہ ان کے خاتمے میں بنیادی کردار میرا ہی رہا تھا۔

وہ دور یاد آتے ہی میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ اگر مافیا کے کسی ایجنٹ نے ویرا کو پہچان لیا تھا تو میری خیر نہیں تھی۔ زیرزمین دنیا کے ہر قابل ذکر آدمی کو معلوم ہوچکا تھا کہ جمی الائیڈ کی زندگی میں ہی ویرا اپنے باپ سے منحرف ہوکر میرے ساتھ مل چکی تھی۔

ڈیوڈ اسٹارز کی نحوست کی وجہ سے میرے پرانے دشمن بھی دھیرے دھیرے سامنے آرہے تھے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی مگر اس وقت اسے ٹالنا میرے بس سے باہر تھا۔

''اگر وہ تم سے نظریں چار نہیں کررہا تو اس کے دل میں بھی کوئی چور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے ساتھ اپنی نفسیاتی لڑائی جاری رکھو۔ اگر وہ ریستوران میں موجود رہے تو میں کھانے کے دوران میں ان سے نمٹنے کی کوئی راہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''وہ بھی بھاگنے والا نظر نہیں آتا۔ ان لوگوں کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔''

''ضرورت پڑی تو میں براہِ راست ان کی میز پر بھی جاسکتا ہوں۔''

''براہ راست تصادم کی ضرورت نہیں۔'' وہ گھبرا کے بولی۔ ''ایک آدھ روز میں ہمیں یہاں سے نکل ہی جانا ہے۔ ہمیں صرف وقت گزارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''تصادم کے بغیر میں اس سے یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ وہ میری گرل فرینڈ کو مسلسل کیوں گھور رہا ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ہاں...... یہ ایک معقول جارحانہ اقدام ہوسکتا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک ہال میں موجود دوسرے لوگ اس کی یہ بدتمیزی نوٹ کرچکے ہوں۔ کسی تکرار کی صورت میں وہ ضرور تمہارا ساتھ دیں گے۔''

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ''لوگوں کی بات آئے گی تو ایسے بھی بولیں گے جو تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ تم خود اشارے بازی کرکے اس اطالوی کی حوصلہ افزائی کررہی تھیں۔''

''یہ ضرور ہوگا۔ شاید ایک آدھ مرد یا عورت نے اب تک نوٹ بھی کرلیا ہو۔''

''فکر کی بات نہیں۔ اب اس عمل کے ساتھ ذرا ہراساں ہونے کی اداکاری بھی شروع کردو۔ بات بن جائے گی۔ تمہارے ہراساں ہونے سے وہ بھی ذرا شیر ہوجائے گا اور اس کے خلاف ہال میں متعدد گواہ پیدا ہوجائیں گے۔''

''سبب جو بھی ہو، فی الحال اسے ذلیل ضرور کیا جانا چاہیے۔''

اسکاچ کے گلاس خالی ہونے تک ویٹرس نے ہماری میز پر سلاد کے ساتھ پلیٹیں وغیرہ لگانی شروع کردیں۔ ویرا نے میری ہدایت کے مطابق کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح اپنی آنکھیں ذرا پھیلالی تھیں اور دور ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی وجہ سے سخت پریشان اور مضطرب ہے۔

میری پوزیشن اس قدر ناموزوں تھی کہ پیچھے گھومے بغیر اس خبیث اطالوی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویرا کا اندازہ تھا کہ اس کی ساتھی لڑکی اس قدر گاؤدی تھی کہ اسے اس وقت تک اپنے بوائے فرینڈ کی حرکات کا علم نہیں ہوسکتا تھا۔

کراکری سجانے کے بعد میں نے کرسی چھوڑی تو ویرا مزید پریشان ہوگئی۔ میں نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وضاحت کردی کہ میں اطالوی سے لڑنے

نہیں بلکہ لندن کی اصطلاح میں لوبا باتھ روم تک جا رہا تھا۔ ویرا بے جان سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

میز چھوڑتے ہوئے میں ایسے زاویے سے باہر نکلا کہ پیچھے کا حصہ میری نگاہوں میں آ گیا اور پھر میں نے ویرا کی نظروں کی سمت میں ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس دراز قامت اطالوی کو بھی دیکھ لیا جو ہمارے لیے مسائل پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک ویٹر کی رہنمائی کے ذریعے میں ریستوران کے واش روم میں جا پہنچا۔ اس وقت مجھے کسی قسم کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ بس اپنے تازہ حریف کی ایک جھلک دیکھنے کا بہانہ تھا جو مجھے واش روم تک لے آیا۔ میں نے بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے چمک دار دیوار گیر آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ کئی دن کے بڑھے ہوئے شیو کی وجہ سے میری شخصیت میں لاابالی یا لوفرانہ انداز ابھر آیا تھا۔

ڈرائر مشین پر ہاتھ خشک کرنے کے بعد میں واپس لوٹا تو پوری بساط جوں کی توں تھی۔ صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ ہماری میز پر کھانا لگنا شروع ہو گیا تھا۔

"مجھے ایک شبہ تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ خبیث تمہیں اکیلا دیکھ کر کہیں تمہاری میز پر ہی نہ آ جائے۔" میں نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"استثنا ہر جگہ موجود ہوتا ہے مگر ایک قوم کی حیثیت سے اطالویوں کے تین عیب بہت مشہور ہیں۔ عورتوں کے معاملے میں بہت ندیدے ہوتے ہیں اور اپنی خوشامدوں کے ذریعے عورتوں کو شیشے میں اتارنے کے فن میں طاق ہوتے ہیں۔ ان کی تعریف و توصیف کے جال سے بچنا محال ہوتا ہے۔"

ہم اس وقت ایک پریشان کن صورت حال سے دوچار تھے لیکن ویرا نے جس انداز میں اطالویوں کے موروثی عیوب گنوانے شروع کیے میں اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اگر تم اطالویوں کے بارے میں اتنی مستند معلومات رکھتی ہو تو ان کے بقیہ دو عیوب کے بارے میں بھی بتا ڈالو تاکہ میں بھی ان باتوں سے ہوشیار رہوں۔" میں نے اس سے فرمائش کی۔

"یہ شیخی خورے ہوتے ہیں۔ اپنی کارکردگی کے اظہار میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، سچ تک پہنچنے کے لیے ان کے دعووں کو اکثر چار سے تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ اور تیسرا عیب یہ ہے کہ یہ پیدائشی جواری ہوتے ہیں۔ اصل اور مروج مفہوم میں جوا کھیلیں یا نہیں کھیلیں، ان کا مزاج جواریوں والا ہوتا ہے۔"

"یہ تینوں خامیاں دلیری اور مردانگی کی کمی ظاہر کرتی ہیں۔ حیرت ہے کہ مافیا نے ایک ایسی قوم میں جنم لیا جو بے خوف اور بے جگر معلوم نہیں ہوتی۔"

"سسلی والے خود کو کبھی اطالوی نہیں کہتے۔ وہ ہمیشہ خود کو ان سے الگ شمار کرتے ہیں۔ اور مافیا کی داغ بیل وہیں ڈالی گئی تھی۔" کھانے کے دوران میں ویرا نے آگاہ کیا۔

ویرا نے بتایا کہ اس شخص کی تاک جھانک کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔ اس سے میں ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ ابتدا میں وہ بھی ویرا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہم لوگ نسبتاً نیم تاریک جے میں بیٹھے ہوئے تھے اس لیے وہ ایک نگاہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ اسے اپنے ذہن پر زور دے کر مسلسل اور بار بار ویرا کی طرف دیکھنا پڑ رہا تھا۔ جب اس نے اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر لی تو اسے ویرا کی طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور مجاز پر نظر بازیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

کھانا جو کچھ بھی تھا، بہت لذیذ اور تازہ تھا جسے ویرا کی خاص ہدایت پر مسالوں سے چٹپٹا کر کے لایا گیا تھا۔ کھانے کے ساتھ فرانس کی عمدہ سرخ وائن ہوٹل اپنی طرف سے فراہم کرتا تھا۔ وہ اس کی قیمت بل میں شامل نہیں کرتے تھے لیکن یہ بات واضح تھی کہ کیڈ وائن کے دام ہر کھانے کی قیمت میں پہلے سے ہی شامل ہوں گے۔

ہم نے نہایت اطمینان سے کھانا ختم کیا، آئس کریم کھائی اور بل پر کمرا نمبر ڈال کر دستخط بھی کر دیے۔

کمرے کی تصدیق کے لیے چابی کافی تھی جو لمبے سے نمبر ٹیگ کے ساتھ میز پر رکھی تھی۔

اطالوی جوڑے کا کھانا دیر سے آیا تھا۔ وہ بدستور مصروف تھے۔ ویرا کے مشاہدے کے مطابق انہیں کھانا ختم کرنے کی کوئی عجلت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"موقع غنیمت ہے۔ جلدی سے نکل چلو۔ وہ یہیں کھانا کھاتے رہ جائیں گے۔" ویرا نے مجھے اکسایا۔

"بعض اوقات تم بالکل احمقانہ باتیں کرنے لگتی ہو۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"اس وقت میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی جو تم میری عقل پر شبہ کر رہے ہو؟"

"وہ ہمیں سرو کرنے والی ویٹریس سے ہمارے کمرے کا نمبر معلوم کر سکتے ہیں۔ وہ یہ تو جان ہی چکے ہیں کہ ہم اسی ہوٹل میں مقیم ہیں پھر انہیں عجلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں بیٹھنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ایسا بھی نہیں ہے لیکن تم نے یہاں سے چلنے کا جواز بہت بودا پیش کیا تھا۔ ہماری کمرے میں موجودگی ضروری ہے کیوں کہ ادل خان کسی بھی وقت فون کر سکتا ہے۔"

ویرا نے فوراً کرسی چھوڑ دی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ اطالوی نے سر اٹھا کر طائرانہ انداز میں ہماری طرف ایک نگاہ ڈالی اور سر جھکا کر دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کے رویے میں سدھار پیدا ہو جانے کی وجہ سے میں نے اس سے باز پرس کرنے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ اس طرح پیدا ہونے والی بدمزگی کے نتیجے میں ہم چاروں ہی ہال میں موجود تمام افراد اور ہوٹل کے ملازمین کی توجہ کا مرکز بن جاتے جو ہم میں سے کسی کے بھی حق میں بہتر نہ ہوتا۔

ہم دونوں ریستوران سے نکل کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے کاؤنٹر کے سامنے سے گزرے تو نگاہیں چار ہوتے ہی وہاں موجود لڑکی نے ہمیں بلانے کا اشارہ کیا اور میرے دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہو گئیں۔

کاؤنٹر تک پہنچتے پہنچتے میرے ذہن میں کئی اندیشے سر ابھار چکے تھے۔ ہم اس وقت جن حالات سے دوچار تھے ان کے سبب اس قسم کا کوئی بھی واقعہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچ کر ہمیں اپنی طرف بلایا تھا اور وہ ہم سے کیا چاہتی تھی۔

قریب پہنچتے ہی اس نے خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ شام بخیر کہا پھر میرے ہاتھ میں جھولتی ہوئی چابی دیکھ کر بولی۔ "میرا ابھی خیال تھا کہ چابی بورڈ سے غائب ہے اور کمرے سے جواب نہیں مل رہا تو تم لوگ ریستوران ہی میں ہو سکتے ہو۔ میں تمہاری منتظر تھی۔"

"مگر کیوں؟" ویرا تفکر آمیز لہجے میں بولی۔ میری طرح وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔

"تمہارے لیے فون پر اس شخص نے رابطہ کیا تھا۔" اس نے کاؤنٹر کی دراز سے ایک رقعہ نکال کر ویرا کو تھما دیا۔

میں نے بڑھ کر وہ پرچہ دیکھا تو میری جان میں جان آ گئی۔

پرچے پر انگریزی میں آڈل کان لکھا ہوا تھا جو ادل خان کی بگڑی ہوئی شکل ہی ہو سکتی تھی۔

"شکریہ!" ویرا نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری فرض شناسی قابل تعریف ہے۔ تم اس پیغام کو اہمیت نہ دیتیں تو صبح تک ہم اس سے بے خبر رہتے۔"

"یہ ہمارا فرض ہے۔ غیر ملکی پیغامات کو ہم ہمیشہ اہمیت دیتے ہیں۔"

"کھانے کے بعد اب ہمارا موڈ بدل گیا ہے۔" میں نے چابی کاؤنٹر پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "چہل قدمی سے واپسی پر تم سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔"

وہ اپنے کی بورڈ کی طرف مڑ گئی اور ہم دونوں دروازے کی طرف ہو لیے۔

"تم نے کیسی مکاری سے باہر جانے کا عذر پیش کیا ہے!" ویرا نے اردو میں حیرت سے کہا۔

"یہ الو خان سے بات کرنے کے لیے ضروری تھا۔

وہ اپنے نام کی یہ درگت دیکھ لے تو ناچ اٹھے گا۔''

''اگر اس وقت بدری ناتھ کا سی ایس ڈی ہماری تحویل میں ہوتا تو بوتھ تک دوڑ لگائے بغیر ہم کمرے سے ہی کراچی فون کر سکتے تھے۔ یہ بھی پتا چل جاتا کہ ہوٹل کی آپریٹر چھپ کر باتیں سننے کی کوشش کرتی ہے یا یہاں کسی مداخلت کا اندیشہ نہیں ہے۔'' ویرانے کہا۔

''سب کچھ فون پر ہی منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم یوں ہی ہوٹل اور پبلک بوتھ کے درمیان دوڑ دوڑ کر ہلکان ہوتے رہیں گے۔'' میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''یہ ٹیلی فون آپریٹروں کی ایک عالمگیر بیماری ہے کہ فرصت کا وقت گزارنے کے لیے دلچسپ گفتگو کی تلاش میں وہ خاموشی سے کالز سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ سی ایس ڈی جیسی چیز کے بغیر یہاں کے فون پر زیادہ بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اب تک میں نے اس توقع پر فون استعمال کیا کہ ہماری ساری باتیں اردو میں ہوتی ہیں اور یہاں کے عملے میں مجھے ابھی تک ایک بھی ایشیائی نظر نہیں آیا ہے۔ اب میں یہ خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔''

فون بوتھ اس مرتبہ خالی ملا۔ کراچی میں اول خان اپنے دفتر میں موجود تھا۔

میری آواز سنتے ہی وہ پر جوش آواز میں بولا۔ ''تمہارے مقابلے میں چار گھنٹے کے خسارے میں ہونے کے باوجود میں نے اپنا کام نمٹا لیا۔ اب مجھے صرف تمہارے فون کا انتظار تھا۔ آج کی بدترین خبر یہ ہے کہ تمہارے تمام خدشات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے ہیں۔ سلطان شاہ کو کسی تابوت میں لاش کے ساتھ چھپا کر امریکی بحریہ کے سی ون تھرٹی میں لے جایا گیا ہے جسے امریکی سفارتی کارگو ظاہر کیا گیا تھا اور یہ صرف چھ لاشوں کے بند تابوتوں پر مشتمل تھا۔ جہاز کے پانچ نفری عملے میں سلطان شاہ کو اغوا کرنے والے بھی شامل تھے جو اپنا کام پورا کر کے خاموشی سے ہماری گرفت سے نکل گئے۔ میرا منہ کالا ہو گیا۔ میں......''

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تمہاری سب سے بڑی کارگزاری یہ ہے کہ تم نے کراچی جیسے انسانوں کے سمندر میں جمن کا سراغ لگایا جس کے ذریعے ہم اصل واقعات کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو سکے۔''

''مجھے طفل تسلیاں مت دو۔ ہم نے جمن کو ضرور تلاش کیا مگر پھر بھی بھٹک رہے تھے۔ تم وہاں بیٹھ کر میری رہنمائی نہ کر رہے ہوتے تو میرے آدمی اس وقت بھی سلطان شاہ کو کراچی میں تلاش کر رہے ہوتے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے...... یہ کچوکے تم محسوس نہیں کر سکتے۔ یہاں بازار ٹھنڈا ہو گیا۔ اب سارا بوجھ تمہارے کندھوں پر آپڑا ہے۔ مجھے خوش اور سرخرو دیکھنا چاہتے ہو تو سلطان شاہ تک پہنچو۔ کیسا اندھیر ہے کہ اب عالمی چوہدری بننے والے ملک سفارت کاری کی آڑ میں اغوا اور اسمگلنگ جیسے جرم کرنے لگے ہیں۔''

اس بار میں نے اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا پورا موقع دیا۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو میں نے کہا۔ ''تمہیں آج پتا چلا لیکن دنیا بھر میں برسوں سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے لیکن تم اس پر کسی سے احتجاج نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس جمن اور کریم ملاح جیسے ضمیر فروش گواہوں کے سوا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ تمہارے احتجاج کو جھوٹی الزام تراشی قرار دے کر نہ جانے کیا کچھ کر گزریں گے۔''

''کیسی بے کسی اور مجبوری ہے۔ ظالم ظلم کر کے رونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لوگ اپنی عزت اور ساکھ کو اتنی بے رحمی سے استعمال کرتے ہوں گے۔''

''یہ یاد رکھو کہ ظلم انفرادی ہو یا عالمی، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ وہ وقت شاید قریب آگیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اتنے کم وقت میں یہ کام کیسے ختم کر لیا۔'' میں نے اسے دلاسا دے کر کہا۔

''ملیر کینٹ سے ائرپورٹ چند منٹ کی مسافت پر ہے۔ میں وہاں پہنچا تو سی ون تھرٹی کو روانہ کرنے والی پوری ٹیم شفٹ بدلنے کی آخری تیاریوں میں مصروف تھی۔ میں امیگریشن کے عملے اور لوڈروں کو رکوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔''

''تابوت کے بارے میں تمہیں کیسے علم ہوا؟'' میں نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔

''اس بارے میں پہلے ہی یہاں چرچا ہو رہا تھا۔ چھ میں سے ایک تابوت بہت بھاری تھا۔ ہر لوڈر اسے ہاتھ لگانے سے بھاگ رہا تھا۔ ان میں آپس میں تکرار ہوتی رہی کہ بھاری تابوت کون سی پارٹی اٹھائے گی۔ وہ سب پتھر کی طرح وزنی تابوت کو کسی گناہ گار کی میت قرار دے رہے تھے۔ آخر کار سارے تابوت ٹرالی پر طیارے تک لے جائے گئے جہاں فورک لفٹ ٹرک سے انہیں جہاز پر چڑھا دیا گیا......''

''اتنی غیر معمولی بات ہونے کے باوجود لوڈنگ انچارج یا کسی کسٹم آفیسر نے بھاری تابوت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میری تفتیش تک سب کے ذہنوں پر گناہ گار میت کا فلسفہ سوار تھا۔ کسی نے یہاں تک مشورہ دیا تھا کہ جب تک بھاری تابوت پر قینچی نہیں رکھی جائے گی، اسے اٹھایا نہیں جا سکے گا۔''

اول خان نے مایوسانہ لہجے میں بتایا۔ ''ان میں سے کوئی شبہ ظاہر کرتا تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ بظاہر وہ لاشوں کے تابوت تھے اور سفارتی مراعات کے تحت روانہ کیے جا رہے تھے، انہیں چھیڑا تک نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کسی عام پرواز سے جا رہے ہوتے تو کسی حیلے بہانے سے ان کی روانگی میں تاخیر کی جا سکتی تھی مگر وہاں یہ گنجائش ہی نہیں تھی۔ رن وے پر ان کا اپنا سی ون تھرٹی تیار کھڑا تھا۔ قلیوں وغیرہ کی ساری بحث اور تکرار اردو میں ہوتی رہی۔ قونصل خانے کے دو افسر لاتعلقانہ انداز میں جہاز کے عملے سے گپ شپ کرتے رہے اور لوڈنگ مکمل ہوتے ہی طیارے کے انجن چلا دیے گئے۔ کنٹرول ٹاور سے کلیرنس ملنے کے بعد طیارے نے جگہ چھوڑنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔''

''اب ہر ایک کو علم ہو چکا ہوگا کہ بھاری تابوت میں لاش کے ساتھ ایک زندہ پاکستانی بھی قید تھا۔'' میں نے پرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

''سو فیصد ٹھوس ثبوت کے بغیر سفارتی کارگو پر شبہ ظاہر کرنا سنگین ترین بے قاعدگی میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے اس بارے میں سختی سے اپنی زبان بند رکھی۔ لوگ قیاس آرائی کر رہے تھے کہ شاید چھٹے تابوت میں ہیروئن چھپا کر لے جائی گئی ہے۔ زندہ قیدی کی بات تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکی ہوگی۔'' وہ افسردگی سے بتا رہا تھا۔ ''اگر امریکیوں کو پتا چل جائے کہ کوئی شخص بھاری تابوت میں زندہ قیدی کی موجودگی کے امکان کی چھان بین کر رہا تھا تو وہ مجھے تلاش کر کے ہمیشہ کے لیے میری زبان بند کر سکتے ہیں۔ ایسے مجرم اور خونی سفارت کاروں سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے۔''

''تمہارا یہ فیصلہ بہت صائب تھا۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ اب ہم سلطان شاہ کے اغوا کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔'' بات کرتے کرتے میں چونک پڑا۔ ''لیکن ابھی تمہاری بات ادھوری ہے۔ آئزک کے آدمیوں کی عملے میں موجودگی کی تصدیق کیسے ہوئی؟''

''تمہاری بتائی ہوئی تجویز کے سوا کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے بھاری تابوت کے بارے میں اپنی زبان سختی سے بند رکھنے کے ساتھ وہاں عملی طور پر اس مفروضے کو ہوا دی کہ جہاز کے عملے کا کوئی رکن بھاری تابوت میں ہیروئن چھپا کر لے جانے میں ملوث تھا۔ ہمارا عام شہری آج بھی یقین نہیں کرے گا کہ بعض سفارت کار ایسی گندی سازشوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ جب میں نے اپنے پرانے ریکارڈ کے حوالے سے جہاز کے عملے کے ویزا فارم وغیرہ طلب کیے تو مجھ سے بھرپور تعاون کیا گیا۔ پندرہ منٹ میں پانچوں تصاویر میرے حوالے کر دی گئیں۔ ائرپورٹ سے اسٹیشن فوراً آتے ہی میں نے جمن اور کریم کو ایک دوسرے سے الگ کر کے باری باری تصاویر دکھائیں اور ان دونوں نے کسی تردد کے بغیر اپنے دونوں آقاؤں کو پہچان لیا۔ ان پانچوں کے بارے میں کسی بھی بھاگ دوڑ کے بغیر حقیقت سامنے آگئی۔''

بہت دشوار بلکہ ناممکن نظر آنے والے مراحل واقعی حیران کن تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچے تھے۔ میں نے کہا ''تمہاری یہ مثالی کارکردگی قابل تعریف ہے۔ اب......''

''میرے زخموں پر نمک پاشی مت کرو۔'' اول خان کی آواز فریادی ہوگئی۔ ''سلطان شاہ کے معاملے میں شکست کے بعد یکایک مجھے تھکن محسوس ہونے لگی ہے۔ میری طبیعت مضمحل ہے۔ تم تعریف کرتے ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے تم مجھ پر طنز کر رہے ہو۔ مجھے اب گھر جا کر لمبی نیند لینے دو۔''

''ایسی باتوں سے تم مجھے بھی اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دو گے اور میں سلطان شاہ کو رہا کرانے کے بجائے دشمن کے تیار کیے ہوئے کسی گڑھے میں جا گروں گا۔ تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں ہو۔''

''کہو۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔'' چند ثانیوں کے سکوت کے بعد اول خان نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''سلطان شاہ عارضی طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ غزالہ تمہارے گھر پر محفوظ ہے۔ اب تمہیں جہانگیر کی حفاظت کرنی ہے۔ اسے بھی خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔''

''مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اس سے بات کی تھی مگر وہ فون پر نشے میں اول فول بک رہا تھا۔ اس سے کہو کہ پہلے اپنی شراب نوشی میں کمی کرے۔ اس کے بعد ہی وہ محفوظ رہ سکے گا۔ اس وقت وہ اپنا سب سے بڑا دشمن ہے۔''

''اس کی رات کی مدہوشی ختم ہو جائے تو میں اسے کڑی سرزنش کروں گا مگر تم اپنا کام کرتے رہو۔ اپنا دل مضبوط رکھو۔ لڑائی میں ہار جیت ہوتی ہی رہتی ہے۔ شکست کا عزت اور وقار کے ساتھ سامنا کرنا بھی دل گردے کا کام ہے۔ اب تم گھر جا کر سو سکتے ہو۔''

''تم نے اپنے ایک جملے سے اس وقت میری آنکھیں کھول دی ہیں۔'' اس کی آواز میں پہلی بار ایک نیا عزم اور ولولہ امڈ آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اب مجھے کبھی ملول اور افسردہ نہیں پاؤ گے۔ شکست ہو ہی گئی ہے تو اب میں عزت اور وقار سے اس کا سامنا کروں گا۔ ایک سچے سپاہی کی یہی شان ہوتی ہے۔''

''فکر مت کرو۔ جلد ہی تم فتح یاب بھی ہو جاؤ گے، خدا حافظ۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

''اس معاملے میں سامنے آنے والی تلخ بلکہ ہوش ربا حقیقتوں نے اس حساس آدمی کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا ہے۔'' ویرا نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''شاید تمہارا آخری سبق اسے نیا حوصلہ دے سکے۔ اس وقت مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔''

''بھول جاؤ کہ تم نے یہ باتیں سنی ہیں۔ اس سے کسی گفتگو میں ان کا حوالہ نہ دے بیٹھنا۔ وہ اپنی کسی کمزوری کی تشہیر پسند نہیں کرے گا۔'' میں نے ویرا کو تنبیہ کی۔

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ میں مڑ کر اسے گھورنے لگا۔

''کیا میں نے غلط بات کہی ہے؟''

''تمہاری بات میں نے سن لی اور اس پر عمل بھی کروں گی۔'' اس نے وضاحت کی ''یہ موقع اچھا ہے۔ ہم خاموشی سے ہوٹل بدل لیں تو اس اطالوی جوڑے سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔''

اس کی تجویز نے مجھے چونکا دیا۔ اس وقت وہ بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔ پاسپورٹ، ٹکٹ اور رقم اس وقت بھی ویرا کے بیگ میں موجود تھیں۔ سفر میں ان چیزوں کو میں ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں ہمارے چند جوڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کراچی سے لائے ہوئے ہلکے پھلکے سوٹ کیس سے محرومی کا ازالہ ذرا سی دیر کی خریداری سے کیا جا سکتا تھا۔

اطالوی مرد کو ہمارے بارے میں یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ ہم اسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ میرے ہاتھ میں موجود چابی سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ کھانے کے بعد ہم اپنے کمرے میں ہی جائیں گے اور وہ جب چاہے ہمارا سامنا کر لے گا لیکن اول خان کے پیغام کی وجہ سے ہم غیر متوقع طور پر ہوٹل سے نکل آئے تھے۔ ہوٹل میں ہمارے متوقع بل سے زیادہ رقم جمع تھی۔ اگر

ہم وہاں لوٹنے کا ارادہ منسوخ کر دیتے تو اس اطالوی سے ہماری جان چھوٹ سکتی تھی۔

دوسرے ہوٹل میں وہ رات بسر کر کے ہم اگلے دن....... نیویارک کی نشستیں بک کراتے اور جلد از جلد لندن سے نکل جاتے تو ہر خطرہ ٹل سکتا تھا۔ وہ ویرا کی تجویز کا مثبت ترین پہلو تھا جو ہر اعتبار سے ترغیب انگیز تھا۔

اس میں کیا خطرات پنہا ہو سکتے تھے۔ اس سوال نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔

لمحہ بھر میں ہی تصویر کا دوسرا رخ میرے ذہن میں اجاگر ہونے لگا۔

پہلا نقصان یہ ہوتا کہ اس اطالوی کے بارے میں ہمیشہ کے لیے میرے ذہن میں خلش موجود رہتی۔ نہ جانے وہ کون تھا کیوں ویرا کی طرف متوجہ ہوا تھا اور کیا چاہتا تھا۔ دوسرا خطرہ استقبالیہ پر موجود لڑکی کی طرف سے تھا۔ اس سے اوُل کان کا پیغام ملنے کے بعد میں نے چہل قدمی سے واپسی پر ملاقات کے بارے میں زبان کھولی تھی۔ اصل نام سے قطع نظر آوُل کان کے الفاظ ایسے بے تکے تھے کہ وہ لڑکی ہفتوں بلکہ مہینوں نہیں بھول سکتی تھی۔ رات بھر ہمارے کمرے کی چابی ہوٹل کے کی بوڈ پر موجود رہتی تو وہ لڑکی سوچ میں پڑ جاتی کہ ہماری چہل قدمی اتنی طویل کیوں ہو گئی۔

ہماری غیر حاضری کے طول پکڑنے کی صورت میں اگلے دن بات ہوٹل کی انتظامیہ تک پہنچ جاتی اور بات کچھ یوں بنتی کہ ایک جوڑا بیرون ملک سے کسی آوُل کان کا پراسرار پیغام ملتے ہی ہوٹل سے چہل قدمی کے لیے باہر گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔

غیر ملکیوں کے بارے میں ہر ہوٹل کی انتظامیہ بہت حساس ہوتی ہے۔ معاملہ فوراً پولیس تک پہنچ جاتا اور ہماری تلاش کی مہم شروع ہو جاتی۔ ہوٹل کے ریکارڈ میں موجود ہمارے پاسپورٹوں کے اندراجات پولیس کے ہاتھوں سے گزرتے ہوئے ائرپورٹ امیگریشن تک پہنچ جاتے۔ ہم نیو یارک روانگی کے لیے ادھر کا رخ کرتے اور روک لیے جاتے، ہم سے پوچھا جاتا کہ ہم ہوٹل سے پراسرار انداز میں کہاں غائب ہوئے تھے اور آوُل کان کون ہے؟ ساؤتھ آل کے واقعات کی وجہ سے اس تفتیش کے تیور بہت جارحانہ ہوتے۔ مزید خطرناک بات یہ تھی کہ میں بھی گیتا اور رمیش کی طرح ایک ایشیائی تھا۔ ایک غلط فیصلے کی وجہ سے پولیس سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی اور ہم دلدل میں دھنستے چلے جاتے جس سے باہر آنا ناممکن ہو جاتا۔

اطالوی کا سامنا کرنے کے مقابلے میں وہ خطرات بہت سنگین اور جان لیوا تھے۔

''رک کر کیوں کھڑی ہو گئیں؟ ہوٹل کی طرف چلتی رہو۔'' قلیل سے توقف کے دوران میں، میں نے وہ سب سوچ لینے کے بعد ویرا سے کہا۔ ''ابھی کچھ پتا نہیں کہ ہمیں کب کی نشستیں ملیں اور ہمیں کتنے دن لندن میں رہنا پڑے۔ اطالوی سے جان چھڑا کر ہم دوسرے بہت سے سنگین خطرات کو دعوت دے بیٹھیں گے۔''

''اگر تم کہہ رہے ہو تو اس تجویز میں خطرات ضرور پنہاں ہوں گے مگر میں ان کے بارے میں جاننا ضرور چاہوں گی۔'' اس نے میرے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔

''پولیس، سب سے بڑا خطرہ لندن پولیس کی مداخلت کا ہے۔'' میں نے اسے بتانا شروع کیا۔

وہ پولیس کا نام سنتے ہی چونکی تھی لیکن پوری بات سن لینے کے بعد پوری طرح میری ہم خیال ہو چکی تھی۔ اسے بس ایک ہی اعتراض سوجھا تھا کہ استقبالیہ والی لڑکی رات بھر ڈیوٹی پر موجود نہیں رہ سکتی تھی کیوں کہ ہوٹلوں میں رات کے عملے کی شفٹ دس اور بارہ بجے کے درمیان شروع ہوتی ہے جب کہ وہ آٹھ بجے ڈیوٹی پر موجود تھی۔ اس کا خیال تھا کہ رات کا عملہ آنے پر اس کی چھٹی ہو جاتی مگر خطرہ پھر بھی باقی رہتا۔

وہ خطرہ آوُل کان کے الفاظ سے تھا۔ جانے سے پہلے وہ یہ لطیفہ پورے ہوٹل میں پھیلا چکی ہوتی کہ دنیا کے ایک حصے میں آوُل یعنی الو بھی نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ہماری طویل چہل قدمی کی کہانی بھی رات والے عملے تک پہنچ سکتی تھی۔

میں نے اس کی رائے کی ذرا بھی تردید نہیں کی کیونکہ اس نے خود ہی اپنے اعتراض کا ایک معقول جواب ڈھونڈ لیا تھا۔

ہم دونوں ہوٹل میں داخل ہوئے تو استقبالیہ والی لڑکی نے دوستانہ مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ ''تمہاری چہل قدمی تو واقعی مختصر ثابت ہوئی۔ کیا باہر ہوائیں چلنی شروع ہو گئی ہیں؟''

''میرے دوست کے گھٹنے کمزور ہو گئے ہیں۔'' ویرا نے ہنس کر اس کے ہاتھ سے چابی لے لی۔

اس وقت کاؤنٹر پر کوئی اور گاہک موجود نہیں تھا۔ لڑکی نے اس فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بات بڑھائی۔ ''تم برا نہ مانو، ایک ذاتی سا سوال پوچھ لوں؟''

ویرا نے اسے اجازت دے دی۔ میں اس کے سوال کا اندازہ کر چکا تھا۔

''آوُل مغرب میں عقل اور دانش کی علامت ہے مگر پھر بھی کوئی یہ نام نہیں رکھتا۔ کس ملک......''

''یہ انگریزی والا آوُل نہیں ہے۔ اس کا تلفظ ذرا مختلف ہے۔'' ویرا نے اس کی بات کاٹ کر بہت خوب صورتی سے اسے جامع جواب دے دیا۔

ویرا نے تلفظ کے اختلاف کی آڑ لی تھی مگر اردو اور انگریزی میں سفر، رن، کف، اور روز جیسے سو فیصد یکساں ...تلفظ پر مشتمل الفاظ کے معنے یکسر مختلف تھے۔ ایک دو الفاظ تو ایسے بھی تھے جو اردو میں جامع قانونی مفہوم رکھتے تھے مگر انگریزی میں استعمال ہوتے ہی...گالی بن جاتے تھے۔

لڑکی نے ہمیں گڈ نائٹ کہا اور ہم دونوں لفٹ کی طرف چل دیے۔

کمرے میں پہنچتے ہی ویرا نے اپنی عادت کے مطابق ٹیلی وژن آن کیا اور شب خوابی کا لباس سمیٹ کر باتھ روم میں جا گھسی۔ میں نے ریموٹ سے آواز دھیمی کر دی اور پھرتی سے لباس تبدیل کرنے میں مصروف ہو گیا تا کہ ویرا کے نمودار ہونے سے پہلے بستر پر قابض ہو سکوں۔

ویرا کافی دیر بعد واپس آئی۔ میری طرف دیکھ کر اس نے بائیں آنکھ دبائی اور لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں صرف بیڈ لیمپ کی روشنی باقی رہ گئی تھی۔ وہ نہ بھی ہوتی تو ٹیلی وژن اسکرین کی گھٹتی بڑھتی روشنی بھی کمرے میں نقل و حرکت میں مدد دے سکتی تھی۔

''اب تک اول خان بھی گھر لوٹ کر اپنے بستر میں پہنچ چکا ہوگا۔'' ویرا نے بستر پر لیٹتے ہی کہا۔

''آج تم زیادہ تر اسی کے بارے میں سوچتی رہی ہو۔''

وہ میرے لہجے میں پوشیدہ طنز کو نظر انداز کر کے بولی۔ ''وہ عزت کے لائق ہے اور میں اس کی عزت کرتی ہوں۔''

پھر ہمارے درمیان اگلے روز کے پروگرام پر تبادلہ خیال شروع ہو گیا جو خبروں کے آغاز تک جاری رہا۔ نو بجے خبریں آتے ہی ہماری توجہ اسکرین کی طرف مبذول ہو گئی۔

ملکی خبروں میں پہلی خبر شہزادہ چارلس کی صدارت میں ہونے والے ایک فلاحی پروگرام کی تھی جس میں معذور بچوں کی بہبود کے لیے معتدد اداروں نے بھاری رقوم کی عطیے دیے تھے۔ دوسری خبر کی ابتدا اس قدر سنسنی خیز تھی کہ میں نے اچھل کر بستر چھوڑ دیا اور ٹیلی وژن کی آواز بڑھا دی۔

ساؤتھ آل کے دہرے قتل کا اہم ترین گواہ آخر کار سامنے آ گیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اسکرین سے خبر پڑھنے والا غائب ہو گیا اور فلم شروع ہو گئی۔ وہ کسی دفتر کا منظر تھا جس میں بہت سے باوردی پولیس افسران بھرے ہوئے تھے اور ایک ادھیڑ عمر شہری ایک میز کے سامنے کسی پولیس افسر کے روبرو بیٹھا کچھ بیان کر رہا تھا۔

پس منظر میں بتایا جا رہا تھا کہ قتل کی واردات والے دن گیتا اور اس کے ایک ایشیائی ساتھی کو سینٹرل لندن میں کینسنگٹن روڈ سے ادمیز ریستوران کے راستے ساؤتھ آل میں جائے واردات تک پہنچانے والے ٹیکسی

ڈرائیور نے جنوبی لندن میں پولیس افسران کے روبرو پانچ بجے شام اپنا ابتدائی بیان ریکارڈ کرادیا ہے جسے فی الوقت صیغہ راز میں رکھا جارہا تھا۔ صرف گیتا کے آخری سفر کی جائے آغاز کا اظہار کیا گیا تھا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اگر وہ مزید دوروز کے لیے اپنا بیان ریکارڈ کرانے کا ارادہ ملتوی کیے رکھتا تو اس کی قانونی پوزیشن میں ذرا بھی فرق نہ آتا۔ بس ہم دونوں کو اطمینان سے برطانیہ سے روانہ ہونے کا موقع مل جاتا۔

ٹیلی وژن پر کیمرے میں ادھیڑ عمر شہری رفتہ رفتہ نمایاں ہونے لگا۔ اس کا چہرہ واضح ہوتے ہی میرے وجود میں سنسنی اور خوف کی ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اپنے ٹیکسی ڈرائیور کا وہ چہرہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسکرین سے کسی بھی لمحے میری طرف اشارہ کر کے پولیس افسران سے کہے گا "یہ ہے گیتا اور جیمز کا اصل قاتل جسے میں لاد کر لایا تھا، گرفتار کرلو اسے۔"

"کیا تمہیں یہ چہرہ یاد ہے؟" نیم تاریکی میں ویرا کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

"یہ منحوس چہرہ میں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔ چار دن تک مسلسل غائب رہ کر اس نے ہمارے سارے خوف مٹا دیے تھے۔ شاید قصہ بالکل ہی دب جاتا۔ اس نے اچانک سامنے آکر اس مردہ کیس میں نئی جان ڈال دی ہے۔"

ہمارے لیے اس خبر میں ڈرائیور کے سامنے آنے سے زیادہ کوئی بات قابل ذکر نہیں تھی۔ اس کا بیان خفیہ رکھا گیا تھا۔ اس لیے وہ خبر بھی اتنی ہی تھی لیکن ٹیلی وژن پر مقتولین اور جائے واردات کے ساتھ ادمیز ریستوران کی پرانی تصاویر در کینسنگٹن روڈ کی وڈیو فلم پر مشتمل طویل خبر چلتی رہی۔

اس اہم ترین گواہ کے یکایک نمودار ہونے سے ٹیلی وژن پر ایک نیا جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ اس مبصر کا کہیں پتا نہیں تھا جس نے روپوش گواہ کو اس کی امکانی اینگلو انڈین نسل کی وجہ سے ملامت کا ہدف بنا کر مقامیوں کی قانون پروری کے گن گائے تھے۔

"اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔" ویرا بڑبڑائی۔

"اس وقت پورے زوروشور سے پولیس والوں کی روایتی کارروائیاں شروع ہوچکی ہوں گی جن میں مشتبہ ملزم بلکہ مجرم کے خاکے بھی شامل ہیں۔"

"دعا کرو کہ یہ آفت نازل ہوہی گئی ہے تو ڈرائیور کے بتائے ہوئے حلیے کی بنا پر خاکے جلد جاری نہ ہوسکیں۔ ان کے بڑے پیمانے پر تشہیر تمہارے لیے مشکلات پیدا کردے گی۔"

"میری چند روزہ داڑھی بھی اس وقت شک وشبے کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ مجھے اس سے فوراً ہی نجات حاصل کرلینی چاہیے۔" میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ یہ ضروری ہوگیا ہے۔ ویسے آج ہم ایک تباہی سے بال بال بچے ہیں۔"

"اس ڈرائیور کے نمودار ہونے سے زیادہ بڑی تباہی اور کیا ہوسکتی ہیں؟"

"اطالوی کے خوف سے ہم ہوٹل چھوڑ کر فرار ہوگئے ہوتے تو ہماری نجات کی ساری راہیں خود بخود مسدود ہوجاتیں۔ شاید یہ خبر پانچ بجے کے بعد سے ہی ٹیلی وژن چینلز پر چل رہی ہوگی۔ ہماری پراسرار روپوشی کی کڑیاں اسی سے ملائی جاتیں اور شہر سے ائرپورٹ تک کہیں نہ کہیں ہم دھر لیے جاتے۔"

"ہاں۔" میں نے اس کی تائید کی "ایسی صورت میں صرف پاسپورٹ ہی ہماری گرفتاری کے وارنٹ بن جاتے کیونکہ ان کی ہر تفصیل ہوٹل کے رجسٹر میں موجود ہے۔"

میرے ذہن پر تشویش کی ایسی لہر سوار ہوئی کہ میں کمرا روشن کر کے فوراً باتھ روم میں واش بیسن اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا ارادہ صرف شیو بنانے کا تھا اس لیے میں نے دروازہ بند کرنے کا تکلف نہیں کیا اور ویرا میرے پیچھے پیچھے دروازے پر آکھڑی ہوئی۔

میں نے لمحہ بھر کے لیے آئینے میں اپنی نومولود داڑھی کا جائزہ لیا اور پھر اس پر برش سے شیونگ کریم پھیلانی شروع کردی۔

"تمہارا کیا خیال ہے آج اتنے دن گزر جانے کے بعد تمہاری شناخت کے بارے میں ڈرائیور کی یادداشت اس کا ساتھ دے سکے گی؟" ویرا نے پوچھا۔

"اس سے میرا سرسری سا سامنا ہوا تھا مگر ہم دن کی روشنی میں تھے اور پھر یہ لوگ پیشہ ورانہ طور پر چہرے یاد رکھنے میں شاید ماہر ہوتے ہوں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"میری رائے تم سے مختلف ہے۔ دن بھر سیکڑوں سواریوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ وہ کہاں تک چہرے یاد رکھ سکتے ہیں۔ دوسری سواری اٹھانے تک پچھلی سواری کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ صنف مخالف کے غیر معمولی چہروں یا مشہور لوگوں کی بات مختلف ہوسکتی ہے۔"

"ناامیدی کے اندھیرے میں اب امید کی یہی چند کرنیں ہیں جن کی روشنی میں، میں نے اسی وقت شیو کرنے کا فیصلہ کیا ہے ورنہ مجھے کلین شیو دیکھ کر ہوٹل کا عملہ بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ کئی دن کا بڑھا ہوا شیو میں نے اچانک کیوں صاف کردیا۔" امید کے ساتھ میرے ذہن میں نت نئے وسوسے بھی سر ابھار رہے تھے۔

شیونگ کریم کے جھاگ میرے چہرے کے بالوں پر پوری طرح چھا چکے تھے، میں نے ریزر نکال کر بال اتارنے شروع کردیے۔ چند منٹ میں میرا چہرہ کلین شیو ہوچکا تھا۔

منہ دھو کر میں کمرے میں لوٹ آیا۔ ویرا پریشانی کے عالم میں کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

اس رات ہم دیر تک تفکرات بانٹ کر ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہے۔ دوبارہ بتی گل کی تو رات کے دو بج چکے تھے۔

سونے سے قبل اپنے تفکرات کے باوجود مجھے رہ رہ کر اطالوی کا خیال آرہا تھا۔ ریستوران میں بھرپور تجسس کے مظاہرے کے بعد اس کی طرف سے طویل خاموشی میری توقعات سے میل نہیں کھا رہی تھی۔

اگلی صبح ویرا مجھ سے پہلے بیدار ہوگئی۔ میں نے بستر چھوڑا تو ویرا اخبار چاٹنے میں مصروف تھی۔

"کیا خبریں ہیں؟" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے ویرا سے سوال کیا۔

"پولیس والوں کو جان اسمتھ نامی اس ڈرائیور کو اخباری نمائندہ کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی نامعلوم مقام پر مہمان رکھا ہوا ہے مگر وہ اس کے اہل خانہ اور دوستوں وغیرہ کو گھیر کر کچھ معلومات جمع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین یہ ہے کہ جان اسمتھ نے اپنی گواہی دینے یا نہ دینے کے بارے میں ان میں سے کسی کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔"

"پورے اخبار میں تمہیں یہی ایک خبر ملی ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے بہت سی بے سروپا کہانیاں موجود ہیں لیکن کسی سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ قتل کی خبر پھیلتے ہی پولیس کے پاس کیوں نہیں گیا اور اب کیوں گیا ہے؟"

"آج غور سے اخبار دیکھنے کا کام تم ہی کر ڈالو۔ میں تیار ہوکر آتا ہوں۔"

باتھ روم سے واپسی پر بھی مجھے ویرا سے کوئی نئی خبر نہیں مل سکی اور میں نے فون سنبھال لیا۔

ہمارے نیویارک تک کے ٹکٹ امارات ائر لائنز ہی کے تھے مگر میرے پاس ان کے لندن دفتر کا فون نمبر نہیں تھا۔ سائڈ ٹیبل کے نچلے خانے میں موجود ٹیلی فون ڈائریکٹری سے میں نمبر تلاش کرسکتا تھا لیکن چند منٹ بچانے کے لیے میں نے آپریٹر کو ہی مطلوبہ نمبر تلاش کر کے ملانے کی ہدایت کردی۔

آپریٹر بہت مستعد تھی۔ دوسرا منٹ گزرنے سے پہلے مجھے لائن مل گئی۔

دونوں ٹکٹوں کے کوائف بتا کر میں نے امارات کے متعلقہ افسر سے نیویارک کے لیے جلد از جلد روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے کمپیوٹر دیکھنے کے بعد بتایا کہ اسی دن کوئی جگہ نہیں تھی۔ حتیٰ کہ چانس پر بھی نمبر نہیں دیا

ے دن کے لیے ہیتھ رو سے چانس پر اور گیٹ وک سے کنفرم نشستیں مل سکتی تھیں۔

بدری ناتھ کی بتائی ہوئی صورت حال میں وہ خبر میرے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ میں نے فوراً ہی کنفرم نشستوں کی فرمائش کر دی۔

مجھے ہولڈ کرا کے وہ شاید اپنے کمپیوٹر میں ہمارا ٹکٹ ڈیٹا فیڈ کرتا رہا۔ اس بار کئی منٹ کے بعد اس نے ایک کمپیوٹر نمبر دینے کے ساتھ مجھے پرواز کے کوائف بتائے اور ہدایت کی کہ میں ان کے دفتر سے یا پھر پرواز کی روانگی سے دو گھنٹے پہلے گیٹ وک ائر پورٹ سے ہی ٹکٹوں پر اسٹکر لگا لوں ورنہ کنفرمیشن خود بخود منسوخ ہو جائے گی۔ بکنگ کے حوالے سے صرف کمپیوٹر نمبر کافی تھا۔

اس وقت تک پاکستان میں گھر بیٹھے اتنی آسانی سے بکنگ کا تصور نا پید تھا۔ مسافر اس کے ٹریول ایجنٹ کو کئی چکر لگائے بغیر کسی مصروف روٹ پر آسانی سے کنفرمیشن نہیں ملتی تھی۔

فون بند کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ بدری کی باتوں نے مجھے اس معاملے میں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"کب روانگی ہے؟" میرے فارغ ہوتے ہی ویرا نے پرتجسس لہجے میں سوال داغ دیا۔

"گیٹ وک ائر پورٹ سے کل دوپہر یونائیٹڈ ائر لائن کی پرواز طے ہو گئی ہے۔ ہمیں پرواز سے دو گھنٹے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔" میں نے مسرت آمیز لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ "خدا کرے کہ یہ وقت بھی خیریت سے گزر جائے اور جان اسمتھ ہمارے لیے کوئی نئی پریشانی کھڑی نہ کرنے پائے۔"

"یہاں سے گیٹ وک کافی دور ہے۔ ویسے بھی ہمیں یہاں کون سے ہل جوتنے ہیں۔ صبح ناشتا کرتے ہی نکل پڑیں گے۔ گیٹ وک پر ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔" ویرا نے مشورہ دیا۔ "شاید وہ وکٹوریہ کے بس اسٹینڈ سے مقررہ وقفوں سے گیٹ وک کے لیے بسیں روانہ ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں کہیں سے معلومات مل جائیں گی۔"

سفر میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن لندن میں، میں جن حالات سے دو چار تھا ان کی وجہ سے میرے اعصاب پر تناؤ سا طاری ہو رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وقت پر لگا کر اڑے اور ہم گیٹ وک ائر پورٹ سے اپنی پرواز کے ذریعے اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔

میں نے ہوٹل کے عملے سے دور رہنے کے لیے ناشتا کمرے میں ہی منگوانے کا فیصلہ کیا اور انٹرکام پر روم سروس کو آرڈر نوٹ کرانے کے بعد سری نواس کے گھر کا نمبر ملا لیا۔

اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ بدری خود ہی فون اٹھائے گا اور یہی ہوا۔

"تم کب پرواز کر رہے ہو؟" اس کی آواز پہچانتے ہی میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"کل صبح ڈیلٹا ائر لائنز سے روانگی ہے۔ نیو یارک پہنچوں گا تو وہاں دوپہر ہو گی۔ سیٹ بہت مشکل سے ملی ہے۔ ہر پرواز پر بہت رش چل رہا ہے۔" اس کی آواز سے خوشی مترشح تھی۔

"بالکل بکواس ہے۔ میں نے ابھی فون پر بکنگ کرائی ہے۔ تم نیو یارک میں اتر و گے اور میں یہاں سے چلوں گا۔ یہ کام کسی سفارش یا کوشش کے بغیر گھر بیٹھے بلکہ ہوٹل بیٹھے ہوا ہے۔"

"حیرت ہے۔ شنکر تو مجھے دوسری کہانی سنا رہا تھا۔" اس کی آواز تعجب آمیز تھی۔

"بعض سرکاری افسر دوسروں کو دھوکا دیتے دیتے اتنے بگڑ جاتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں پر بھی جا و بے جا احسان جتانے سے باز نہیں آتے حالانکہ ان بے مقصد حرکتوں سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"فائدہ کیوں نہیں ہوتا۔" بدری ناتھ کی آواز میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔ "اب میں سمجھا کہ اس نے یہ ڈراما کیوں رچایا تھا۔ میرے ٹکٹ اور پاسپورٹ کے ساتھ اس نے اپنی بیوی کے فرمائشی سامان کی ایک فہرست بھی بھیجی ہے جو مجھے واپسی پر دہلی میں اس کے گھر پہنچانا

ہوگا۔"

"شاید وہ تمہارے اصل پروگرام سے بے خبر ہے جو......" اس نے میری بات اچک لی۔

"تم ٹھیک سمجھے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں وہ فہرست اسی وقت ردی کی ٹوکری میں ڈال دوں گا۔"

"تمہاری کہانی نے مجھے فکر مند کر دیا تھا اس لیے آج میں نے ناشتے سے پہلے ہی اس کام کا آغاز کیا اور منٹوں میں سارا مسئلہ حل ہو گیا، یہ بتاؤ کہ سی ایس ڈی کا کیا کرو گے؟"

"ساتھ لے جاؤں گا۔" اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ میرے سوال نے اسے حیران کر دیا تھا۔

"ساتھ لے جا کر اسے ضائع کرو گے۔ تمہارے میزبان اس پر قبضہ کر لیں گے۔"

"ہاں...... یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ضرورت کی چیزیں وہ خود فراہم کریں گے۔"

"اور غیر ضروری چیزیں لے لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ تم مجھے کیوں نہیں دے دیتے۔ جب چاہو گے تمہاری امانت تم کو واپس مل جائے گی اور میرا بھلا ہوتا رہے گا۔"

"میں اسے دے تو دوں مگر کیسے؟" اس کی تردد آمیز آواز ابھری۔ "لندن میں اب ہمارا ایک دوسرے سے ملنا ممکن نہیں ہے۔ سری کو اس کی ہوا لگ گئی تو وہ تمہیں دینے کے بجائے خود کھا جائے گا۔" وہ چند ثانیوں تک سوچنے کے انداز میں اوں اوں کرتا رہا پھر فوری خیال کے تحت بولا۔ "میں نے شیام سے بات کی ہے۔ وہی ائر پورٹ پر مجھ سے ملنے آئے گا۔ پتا نہیں بعد میں مجھے اس سے کب ملنے کا موقع ملے۔ میں سی ایس ڈی اسی کو دے دوں گا۔ اس سے لے لینا۔"

"اوکے۔ وہ میرے بہت کام آئے گا۔ تم جاؤ میں تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔"

"بھگوان ہماری دوستی کو سدا قائم رکھے اور تمہاری رکھوالی کرتا رہے۔" بدری ناتھ نے ان الفاظ کے ساتھ فون بند کر دیا۔

"تمہارے ہاتھ میں بدری اب موم کی ناک بن کر رہ گیا ہے۔ جدھر چاہتے ہو موڑ لیتے ہو۔" گفتگو ختم ہوتے ہی ویرا نے ہنس کر کہا۔ "شاید وہ سی ایس ڈی سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہو گیا ہے۔"

"اس کا اسی میں فائدہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس طرف سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مگر دوسری طرف سے انجانے اندیشے ہیں۔ ذرا اٹھ کر ٹیلی وژن تو کھول دو۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید روم سروس والا ناشتا لے آیا تھا۔

میں بستر سے چھلانگ مار کر غسل خانے میں گھس گیا۔ ویرا دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

"آجاؤ۔ میدان صاف ہے۔" ڈیڑھ دو منٹ بعد ویرا کی آواز پر میں کمرے میں لوٹ آیا۔

ٹیلی وژن آن تھا اور ویرا ناشتا سرو کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔

میں نے نرم ٹوسٹ اور ہاف فرائیڈ انڈوں سے ناشتے کا آغاز ہی کیا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی چیخ اٹھی اور میں بری طرح چونک پڑا۔

میرا پہلا خیال اول خان کی طرف گیا اور میں نے دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ریسیور اٹھا لیا۔

ریسیور اٹھاتے ہی ایک حلیم سی مردانہ آواز سنائی دی مگر ہیلو سے آگے ایک لفظ بھی میرے پلے نہ پڑ سکا۔ مجھے شبہ سا ہوا کہ کہیں وہ اطالوی نہ بول رہا ہو۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر شستہ انگریزی میں کہا۔ "میں یہ زبان نہیں سمجھتا۔ انگریزی میں بتاؤ کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"نو...... نو...... انگلیشیا" شاید میرے فقرے اس کے سر پر سے گزر گئے مگر وہ میرا مدعا سمجھ گیا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ "مادام سیکا......" اس سے آگے پھر وہی اجنبی زبان تھی۔ میرے ذہن میں یکا یک پچھلی رات والے مشتبہ اطالوی کی تصویر ابھر آئی۔ لب و لہجے سے وہ اطالوی زبان ہی معلوم ہو رہی تھی

"شاید وہی حرامی اطالوی ہے۔ تم دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔" میں نے ریسیور ویرا کی طرف بڑھا دیا۔

ویرا نے ریسیور لیتے ہی بہت روانی سے کچھ کہا۔ اجنبی کی طرح اس کے الفاظ میں بھی خ اور ن کی بہت زیادہ تکرار تھی یا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ ویرا یورپ میں بولی جانے والی ہر بڑی زبان پر قدرت رکھتی تھی۔

اپنی بات کہہ دینے کے بعد جب ویرا دوسری طرف کی بات سننے کے لیے خاموش ہوئی تو میں نے لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرتے دیکھا۔ دوسری طرف سے اس نے یقیناً کوئی پریشان کن بات سنی ہوگی مگر فوراً ہی اپنے بے ساختہ عمل پر قابو پا لیا تھا۔

فون پر ویرا کی وہ گفتگو کئی منٹ جاری رہی۔ میں اس کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنے ناشتے سے بھی انصاف کرتا رہا۔ بات ختم کر کے ویرا واپس آئی تو اس کا چہرہ قدرے اترا ہوا تھا۔

واپس لوٹ کر وہ خاموشی سے ناشتے میں مصروف ہو گئی تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے فون کے بارے میں مجھے کوئی بات بتانے کی زحمت نہیں کی۔

میں نے کچھ دیر تک اس خیال سے انتظار کیا کہ شاید وہ بات کی ابتدا کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہو لیکن جب اس کی خاموشی کا تسلسل بڑھتا چلا گیا تو مجھے زبان کھولنی پڑ گئی۔ "تم نے بتایا نہیں کہ یہ کس کا فون تھا؟"

"وہی تھا۔" ویرا نے مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر افسردگی سے کہا۔ "اسی ہوٹل کے ایک کمرے سے بول رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔"

میرے لیے ویرا کا وہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ "مگر وہ ہے کون؟" میں نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"وہ ڈان روزینی کا بیٹا ہے۔ ناشتا کر لو تو میں تمہیں اس کی پوری کہانی سنا دوں گی۔"

ڈان روزینی۔ میرے ذہن نے اس نام کا اعادہ کیا۔ نام اور اس کی وطنیت ہی سے ظاہر تھا کہ وہ یقینی طور پر مافیا کی کسی کڑی سے وابستہ تھا۔ اگر مافیا کے کسی گرگے نے ویرا کو پہچان لیا تھا تو پھر میری اصلیت کا راز میں رہنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس شناخت کے نتیجے میں پرانی رنجشیں اور رقابتیں فوری طور پر رنگ دکھا سکتی تھیں۔

وہ کوئی پسندیدہ صورتِ حال نہیں تھی۔ لندن میں ہمارا پورا ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اگلے دن روانگی کا پورا بندوبست ہو چکا تھا لیکن اچانک ہی وقت کا پہیہ ہمارے خلاف حرکت میں آگیا تھا۔

ایک طرف روپوش ٹیکسی ڈرائیور پولیس کے سامنے پیش ہو چکا تھا اور دوسری طرف ڈان روزینی کے بیٹے نے ویرا کو پہچان لیا تھا۔ بات کچھ بگڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہم دونوں کو فوراً ہی ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔" ناشتے سے فارغ ہو کر ویرا نے پژمردہ آواز میں کہا۔ "یہاں سے ہم الگ الگ نکلنے کی کوشش کریں گے۔ خیریت سے نیویارک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو وہاں پھر یک جا ہو جائیں گے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے بہ اصرار دریافت کیا۔ "آخر تم ڈان روزینی کے بیٹے سے بات کرنے کے بعد اتنی خوف زدہ کیوں ہو گئی ہو؟"

"یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ کل ایک ڈرائیور سامنے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے عقب نما آئینے میں اپنے تعاقب کا اندازہ لگا لیا ہو۔ بات وہیں آجائے گی کہ پولیس سفید فام عورت اور ایشیائی مرد پر مشتمل ہر جوڑے کو شبے کی نگاہ سے دیکھے گی اور ہم پھنس جائیں گے۔"

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔ ڈرائیور کے شبے سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوگا۔ عقب نما آئینے میں وہ کوئی دوسری ٹیکسی تو دیکھ سکتا تھا، یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس میں کوئی سفید فام عورت اس کی گاڑی کا پیچھا کر رہی ہے۔ دوسرے ڈرائیور کے سامنے آئے بغیر یہ راز فاش نہیں ہو سکتا۔"

''اس کے بیان سے شہ پاکر کسی وقت دوسرا ڈرائیور بھی سامنے آجائے گا۔''

''اس وقت تک ہم یہاں سے ہزاروں میل دور نکل چکے ہوں گے، تم یہ بے سروپا بہانے بازیاں چھوڑ دو اور مجھے اس اطالوی کے بارے میں بلاکم وکاست پوری حقیقت بتادو۔اس کی روشنی میں ہی ہم مل کر کوئی صحیح فیصلہ کرسکیں گے۔''

''اور اگر میں اس بارے میں کچھ نہ بتانا چاہوں؟'' اس نے مجروح نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کوئی فرق نہیں پڑے گا۔میں اس کے دروازے پر دستک دوں گا۔''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔آج اس نے میرے پرانے زخم ہرے کردیے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے شرمسار ہو...کر اپنا سر جھکا لیا۔میں نے اسے پہلی بار یوں شرمندہ ہوتے دیکھا تھا۔

''جب تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، ہمارے سارے مسائل مشترک ہیں۔ویسے بھی تمہارا ماضی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ہر بات کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے ہے اور میں نے آج تک اس حوالے سے تم کو کبھی بھی شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''یہ تمہاری بڑائی ہے۔'' وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔

''مجھے مجبور مت کرو۔''

وہ خاموش رہنے پر تلی ہوئی تھی۔میں اس کی زبان کھلوانے پر اصرار کرتا رہا۔آخر کار اسے میرے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑ گئے۔

''راماکا سے میری پہلی ملاقات روم میں ان دنوں ہوئی تھی جب ڈان مرسیانو کے روپ میں جمی لائیڈ مجھے نسوانی طاقت کے ذریعے شہ زور مردوں کو مسخر کرنے کی ترتیب دے رہا تھا۔'' ویرا کھوئی کھوئی آواز میں رک رک کر بتانے لگی۔''راماکا بہت خودسر نوجوان ہے اور ان دنوں مجھے ایسے مردوں کی انا کو ریزہ ریزہ کرنے کی کچھ عادت سی ہوئی تھی۔وہ میرے گرد منڈلاتا رہا دوستی کر لینے کے باوجود میں نے اسے حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی پھر مجھے اچانک روم سے جانا پڑ گیا۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکی تو میں نے پوچھا۔ ''اسی کے ساتھ مجھے ذرا سا پس منظر بھی بتاتی چلو تو بہتر رہے گا، روزینی کون ہے؟ روم میں تم کس حیثیت سے رہی تھیں؟''

''سسلی کے جزیرے کے شمال مغربی ساحل پر پالرمو نامی ایک شہر مافیا کا اصل وطن ہے۔روزینی اسی قصبے کے مضافات کا ایک جاگیردار ہے جو ان دنوں بھی مافیا کا بہت بارسوخ ڈان ہوا کرتا تھا۔راماکا اسی ڈان روزینی کا لڑکا ہے۔وقت کے ساتھ اس میں اتنی تبدیلیاں آگئی ہیں، وہ تعارف نہ کراتا تو میں اب بھی اسے نہیں پہچان سکتی تھی لیکن اس نے کل میری ایک جھلک دیکھتے ہی میرا پیچھا شروع کر دیا تھا اور آخرکار مجھے پہچاننے میں کامیاب ہوگیا۔وہ مجھے سیکا کے نام سے جانتا ہے۔ان دنوں مجھے روم میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔''

''اگر وہ تمہارے اصل نام سے ابھی تک بے خبر ہے تو پھر اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اطمینان ...کا ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''میرا دم اس خوف سے نکل رہا تھا کہ کسی مافیا والے نے تمہیں ویرا ااا ئیڈ کی حیثیت سے پہچان لیا ہے اور ہم یہیں الجھ کر رہ جائیں گے۔''

''نہیں، یہ میرا خالص ذاتی معاملہ ہے اسی لیے میں تم سے الگ ہو کر اسے نمٹانا چاہتی ہوں۔وہ میرے ساتھ الجھا رہے گا اور تم آسانی سے یہاں سے نکل جاؤ گے۔میں بعد میں اسے جل دے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گی۔اس وقت یہی سب سے محفوظ اور مناسب راہ ہے۔''

''یہ ناممکن ہے کہ میں تمہیں اس کے رحم وکرم پر چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔آخر تم اس سے اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو؟ میں پہلی بار تمہیں اتنا ہراساں دیکھ رہا ہوں۔وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟'' میں نے اپنی جھلاہٹ پر قابو پا کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ دیوانگی کی حد تک خودسر اور ضدی ہے۔مافیا کے ایک طاقت ور ڈان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ خود کو زمین کا خدا سمجھتا ہے جس کی کسی خواہش سے انحراف ممکن نہیں ہے۔وہ اپنی بیوی کے ساتھ لندن آیا ہوا ہے اور شناساؤں سے بچنے کے لیے اس متوسط اور غیر معروف ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔اس نے اپنی بیوی کو ناشتے کے لیے بھیج کر مجھے فون کیا تھا۔''

وہ پھر خاموش ہوگئی۔اس کی خاموشی سے اس بار مجھے وحشت سی ہونے لگی۔''وہ کیا چاہتا ہے؟''

''وہ لندن میں میری سہولت کے مطابق مجھ سے جلد از جلد شادی کا خواہاں ہے۔''

''شادی شدہ ہوتے ہوئے وہ تم سے کیسے شادی کرسکتا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ خودسر اور انا پرست ہے۔اس کے نزدیک بیوی کی اہمیت پیر کی جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔وہ اسے طلاق دینے پر آمادہ ہے۔''

''اور تمہاری کیا رائے ہے؟'' میں نے اس نازک موڑ پر کسی خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے گہرے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''آج مجھے اس کی صورت ہی نہیں آواز تک سے سخت ترین نفرت ہوگئی ہے۔میں اس کی کیفیت کو خوب سمجھ رہی ہوں۔مجھے دیکھ کر اس کے دل میں کوئی لطیف جذبہ بیدار نہیں ہوا بلکہ اسے روم والی توہین یاد آگئی۔اب وہ ہر قیمت پر اس توہین کا انتقام لینا چاہتا ہے اس کی وحشیانہ سوچ کا اندازہ اسی بات سے لگا سکتے ہو کہ اس انتقام کی خاطر وہ اپنا بسا بسایا گھر تک اجاڑنے پر تل گیا ہے۔''

''میں اس سے گفتگو کے دوران میں تمہارے چہرے کے نرم اور مدافعانہ تاثرات دیکھ رہا تھا، اس سے تو تم نے یہ سب باتیں نہیں کی ہوں گی۔'' میں نے اپنے دل ودماغ میں انگڑائیاں لینے والے قہر وغضب کے طوفان کو ویرا سے پوشیدہ رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس کی مکاری کا جواب میں بھی مکاری سے ہی دیا ہے۔میں نے تمہیں اپنا شوہر قرار دے کر مجبوری ظاہر کی ہے۔اس کا مطالبہ ہے کہ تم سے طلاق لے لوں، تم آمادہ نہ ہوئے تو وہ تمہاری جان تک لینے کے لیے تلا بیٹھا ہے۔اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ تم کل کی پرواز سے نکل جاؤ۔اس کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔اپنا انتقام پورا ہونے تک وہ مجھے کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔میں آرام سے اسے دو تین دن تک الجھائے رکھوں گی اور پھر خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گی۔''

''یہ نہیں ہوگا۔ہم ایک ساتھ جائیں گے۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔''پورا پس منظر سامنے آجانے کے بعد میں پورے اعتماد سے اس کا سامنا کرسکتا ہوں......''

''نہیں۔تم اس کے سامنے نہیں جاؤ گے۔'' اس نے گھبرا کے میری بات کاٹ دی۔''پڑھ لکھ لینے کے باوجود وہ ذہنی طور پر آج بھی انیسویں صدی کا وحشی قبائلی ہے۔میرے اور تمہارے مفروضہ ازدواجی رشتے کا ذکر سنتے ہی اس نے بے ساختہ تم سے ڈوئل کی طرز پر گن شوٹنگ کے مقابلے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔تم تصور نہیں کرسکتے کہ اندر سے وہ کتنا جنگلی ہے اور اپنی ہر خوبی پر کس طرح ناز کرتا ہے۔''

''اسے اپنے نشانے پر گھمنڈ ہے تو تم مجھ کو بھی جانتی ہو اگر انگلینڈ میں ایسے مقابلوں کی کوئی قانونی حیثیت ہے تو یہ اسے اس کے کیفرِ کردار تک پہنچانے کا بہترین طریقہ ثابت ہوسکتا ہے۔''

''تم کہاں کی باتیں کر رہے ہو؟'' اپنی پوری کتھا سنا دینے کے بعد میرا حوصلہ افزا رویہ دیکھ کر ویرا کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔''بیسویں صدی میں مہذب دنیا کا کوئی قانون ایسی جاہلانہ خونریزیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ان کے دماغوں میں پچھلی صدی کا وہی ماحول رچا بسا ہوا ہے۔جب ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا اور ان کے ظلم کے سامنے کوئی سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔''

''ایسے سرکش اور بد دماغ لوگ اس زمین کا بوجھ

ہوتے ہیں۔ ان کا بہتر ٹھکانا زمین کے سینے میں ہی ہوتا ہے۔ ہمارے پاس صرف آج کا دن ہے۔ ہمیں آج ہی اس بارے میں کچھ کر گزرنا ہوگا۔ اگر گیتا کیس میں کوئی نئی الجھن پیدا نہ ہوئی تو کل ہمیں ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''تمہارے الفاظ سے خون کی بو آ رہی ہے۔ تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''مجھے جو کرنا ہوگا، میں کر گزروں گا۔ تم اس سے فون پر بات کرو۔ اس کا حوصلہ بڑھاؤ تا کہ وہ آج شام تمہارے ساتھ سیر کے لیے کسی ویرانے کی طرف نکلنے پر آمادہ ہو جائے۔ تم یہ پروگرام بنانے میں کامیاب ہو گئیں تو آج رات ہم میٹھی نیند سو سکیں گے۔''

میرے کسی منفی ردعمل کا خوف دور ہونے کے بعد وہ دھیرے دھیرے اپنے اصل روپ میں آتی جا رہی تھی۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد میرے منصوبے کی تفصیل جانے بغیر میرے مشورے پر عمل کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

میرے سامنے اس کے علاوہ مزید دو اہم کام تھے۔ پہلے غزالہ کو فون کر کے ویرا کے متوقع تجسس سے ہوشیار کرتے ہوئے امریکا روانگی کے پروگرام سے آگاہ کرنا تھا۔ دوم جہانگیر کو خطرات کا احساس دلا کر بسیار نوشی سے گریز کرنے اور اول خان سے رابطے میں رہنے کا مشورہ دینا تھا۔

پہلے فون کے لیے ویرا سے رازداری برتنی ضروری تھی اور دوسرے فون کے لیے ہوٹل نامناسب تھا۔

''مجھے جہانگیر کی گوشمالی کرنی ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں اسے فون کر کے تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔ اس دوران میں تم تخلیے میں پوری آزادی سے اپنے جنگلی سے بات کر سکتی ہو۔''

''مجھ سے بات کر کے وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری گھات میں کہیں آس پاس ہی منڈلا رہا ہو اور تمہیں دیکھتے ہی الجھنے کی کوشش کرے۔'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہم کسی جنگل میں نہیں، لندن کے ایک معقول ہوٹل میں ہیں۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے۔ یہاں اپنی ... کا مظاہرہ کر کے وہ خود بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا اور ... تو اس نے تمہیں مجھ سے طلاق لینے کا مشورہ دیا ہے۔ براہ راست الجھنے سے پہلے وہ اس مشورے کے نتائج کا انتظار کرے گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''راما کا روزینی سے بات کرنے کے لیے مجھے کسی تخلیے کی ضرورت نہیں تمہاری موجودگی میں بھی میں ... اس سے کھل کر بات کر سکتی ہوں کیونکہ تم اطالوی زبان سے ناواقف ہو اور وہ انگریزی سے نابلد ہے۔''

''یہ حیرت کی بات ہے کہ یورپ کے بعض خطوں میں انگریزی ایسی اجنبی زبان سمجھی جاتی ہے۔'' میں نے اضطراری انداز میں وہ بات کہہ ڈالی۔

''اجنبیت کے سات کچھ تعصبات بھی ہیں۔ ان کا مظاہرہ فرانس میں کیا جاتا ہے۔ بیشتر فرنچ انگریزی میں پوچھے گئے سوال کا جواب فرنچ میں دیتے ہیں اور ناگزیر ضرورت کے بغیر انگریزی کا سہارا لینا معیوب سمجھتے ہیں۔'' ویرا نے بتایا۔ وہ بات پہلے ہی میرے مشاہدے میں تھی۔

میری طرف سے موضوع کی تبدیلی کو ویرا نے ایک ساتھ روانگی پر رضامندی تصور کرتے ہوئے جوتے پہننے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے اسے ٹوک دیا۔ نہیں ویرا، میری بات مانو، میں جو کہہ رہا......''

میرا وہ فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ ٹیلی وژن پر معمول کی نشریات روک کر ساؤتھ آل مرڈر کیس کے بارے میں ایک خاص پروگرام پیش کرنے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

''قاتل ہم میں سے کسی نہ کسی کے آس پاس پوری آزادی سے دندناتا پھر رہا ہے۔ اسے پہچان کر قانون کے حوالے کریں۔ ٹیکسی ڈرائیور جان اسمتھ کی یادداشت سے مجرم کا خاکہ آپ کے سامنے ہے۔'' اس گمبھیر اور ڈرامائی کمنٹری کے ساتھ ہی پوری اسکرین پر ایک قلمی چہرہ نقطے سے بڑھ کر ٹیلی ویژن کی پوری اسکرین پر چھاتا چلا گیا۔

میں سانس روکے ٹیلی وژن پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

ٹیلی وژن اسکرین پر تصویر واضح ہو کر پوری طرح پھیل گئی۔ وہ سرکاری محکمے کے کسی مصور کا بنایا ہوا قلمی خاکہ تھا۔ ٹیلی وژن پر نشر ہونے والے اعلان نے ان لمحات میں گویا میری ہڈیوں میں گودا تک منجمد کر دیا تھا لیکن خاکہ نمایاں ہوتے ہی کمرے کی محدود فضا ویرا کی دبی دبی ہیجان آمیز سرگوشی سے گونج اٹھی۔

''یہ تم نہیں ہو سکتے......اس خاکے کو دیکھ کر کوئی بھی تم پر شبہ نہیں کر سکے گا۔ جان اسمتھ نے تمہارے ایک محسن کے روپ میں سامنے آ کر سب کو غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔''

ویرا کی اس مسرت آمیز آواز نے میرے وجود پر چھایا ہوا سحر توڑ دیا۔ میں نے خوف اور خالی الذہنی کی کیفیات کو اپنے ذہن سے جھٹک کر اس خاکے کا ناقدانہ جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اس خاکے میں چہرے کی ساخت یا بیرونی خطوط میرے اصل چہرے کے مطابق نہیں تو اس سے مشابہ ضرور تھے اس سے آگے سب کچھ گمراہ کن تھا۔

اس خاکے میں بال کافی بڑے، پیشانی تنگ، آنکھیں سرد اور بھنچی ہوئی اور دہانہ شقاوت قلبی کا مظہر نظر آ رہا تھا۔

شاید ڈرائیور کی یادداشت کے بارے میں ویرا کا ہی نظریہ درست ثابت ہوا تھا۔ اگلی سواری بٹھانے تک ہر پیشہ ور ڈرائیور اپنی پچھلی سواری کو بھول چکا ہوتا ہے۔ صرف غیر معمولی حسین و وجیہہ، بگڑے ہوئے یا دہشت ناک چہرے ہی ان کی یادداشت کے خانوں میں چپکے رہ جاتے ہیں۔

لندن پولیس کے سراغ رسانوں نے جان اسمتھ کا ذہن کرید کرید کر کاغذ پر جو پیکر تراشا تھا، اس کے بارے میں ٹیلی وژن پر تفصیلی اعلان جاری تھا مگر اس کی اصلیت کا بھرم کھل جانے کے بعد ہم دونوں کے ذہن پر چھائی ہوئی دہشت معدوم ہو چکی تھی۔ ویرا نے ٹیلی وژن بند کر دیا۔

''یہ تو واقعی کسی قاتل کے خدوخال تھے۔ تم اتنے بھیانک تو نہیں ہو۔'' ویرا نے ٹیلی وژن بند کرنے کے بعد رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

''بعض لوگ اس قدر تخیل پرست ہوتے ہیں کہ سامنے کی چیزوں کو بھی ان کے اصل روپ میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ہر چیز اور چہرے کو صرف اسی روپ میں دیکھتے ہیں جس میں وہ خود اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے قدرے اطمینان کے ساتھ سگریٹ سلگا کر کہا۔

ویرا نے حیرت سے آنکھیں نکال کر بات دہرائی

''لوگ ہر چیز اور چہرے کو اسی روپ میں دیکھتے ہیں جس میں وہ خود اسے دیکھنا چاہتے ہیں...... یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہ عام بات نہیں تھی۔ میں بعض لوگوں کی بات کر رہا تھا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''ایسے آدمی کو ٹرین گھوڑے کی صورت میں نظر آئے گی؟'' ویرا نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ مرض کی شدت میں ایسا بھی ہوتا ہو۔'' میں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا ''ورنہ ٹرین کی جگہ بلٹ ٹرین اور گھوڑے کی جگہ یونی کارن ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔''

''خوب!'' ویرا نے طنز سے کہا ''اس کا مطلب ہے کہ اب تم نے نفسیات پر بھی منہ مارنا شروع کر دیا ہے۔ یہ باتیں کس کتاب میں مل سکیں گی؟''

اس کی جھلاہٹ پر میں ہنس پڑا ''تم خود ہی بات کو بلاوجہ دور لے گئیں۔ میں نے گھوڑے اور ٹرین کی بات نہیں کی تھی۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ جان اسمتھ نے میرے بارے میں پولیس کے سراغ رسانوں کو صرف ایسی جزئیات بتائیں جو کسی قاتل پر ہی صادق آ سکتی ہیں۔ میرے خدوخال کے بارے میں اس کا حافظہ صاف تھا۔ پوچھ گچھ جاری رہی تو اس نے اپنے قیاس کے سہارے ایک قاتل کا خاکہ بنوا دیا جو حقیقت سے بہت دور تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے پریس اور عوام کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنے کے لیے یہ ساری مشق کی ہو۔ اگر وہ ہر سوال کے جواب میں کہتا رہتا کہ اسے قاتل کا چہرہ یاد نہیں ہے تو اسے ایک عام بلکہ سرسری سا گواہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ اب وہ وی آئی پی بن چکا ہے۔''

''پھر تو وہ ذہنی مریض ہے۔ اپنی تسکین کے لیے

سب کو گمراہ کر رہا ہے۔''

''اب تم نفسیات پر منہ مار رہی ہو۔ میں بھی تمہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''وہ اپنی ایسی کی تیسی میں جائے۔ اسے ذہنی مریض ثابت کرنے کے لیے یہی ایک بات کافی ہے کہ وہ طویل تذبذب اور روپوشی کے بعد سامنے آیا ہے۔ پتا نہیں یہ بات پولیس والوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آسکی۔ یہ بس تمہاری خوش قسمتی ہی ہو سکتی ہے۔''

''پہلے کے مقابلے میں اب میں خود کو زیادہ محفوظ تصور کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جان اسمتھ کا فراڈ کھلنے تک ہم دونوں سمندر پار کر کے دور جا چکے ہوں گے۔''

''یہ فراڈ کبھی نہیں کھل سکے گا۔'' میں نے کرسی میں پہلو بدل کر کہا ''یہ اسی وقت ممکن ہے جب اصل قاتل پولیس کے روبرو جا کر یہ دعویٰ کرے کہ جان اسمتھ نے اس کا غلط خاکہ بنوایا ہے۔''

''ٹیلی وژن پر خاکے کا ذکر سنتے ہی میری جان نکل گئی تھی۔'' ویرا نے ایک گہرا سانس لے کر کہا ''غنیمت ہے کہ یہ خطرہ بھی ٹل گیا۔ پوری کہانی میں اب صرف ایک ہی نکتہ اہم ہے کہ گیتا کا ساتھی ایک صحت مند ایشیائی تھا۔ پتا نہیں اس خاکے کی بنا پر کتنے بے گناہ پولیس کے ہتھے چڑھتے ہیں۔''

''بے گناہوں کے لیے ان کے وکیل قانون میں کہیں نہ کہیں لچک تلاش کر لیتے ہیں۔ اب ہمیں اس بارے میں اپنا سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ تم راما کا روزینی سے بات کرو، میں جہانگیر کی خبر لے کر آتا ہوں۔''

''تم پھر وہیں اڑے ہوئے ہو۔ اس وقت مجھے ساتھ لے جانے میں کیا حرج ہے؟''

''کوئی حرج نہیں ہے مگر یہ جاننا ضروری ہے کہ تم میرے ساتھ جانے پر کیوں مصر ہو؟''

''راما کا بہت وحشی اور درندہ صفت آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ بے خبری میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا بیٹھے۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''تم ان باتوں کو دہرا کر مجھے اشتعال دلا رہی ہو، اس کی وحشت و بربریت کے گن گا کر مجھے ضد دلا رہی ہو۔ تم اتنی سورما تو نہیں ہو کہ تمہاری وجہ سے وہ خوف زدہ ہو جائے گا۔''

''بعض اوقات تم بالکل ڈفر ہو کر رہ جاتے ہو۔ وہ اپنے زعم میں میرا عاشق بنا ہوا ہے اور مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ جھوٹ ہی سہی، لیکن اسے یہ معلوم ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میری موجودگی میں وہ تمہارے ساتھ الجھنے کی کوشش نہیں کرے گا.....''

''اگر میں اکیلا باہر نکلا تو وہ مجھے پھاڑ کھائے گا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا ''میں دیکھتا ہوں کہ اس حرامزادے میں کتنا دم خم ہے۔ اس نے تمہیں مجھ سے طلاق لینے کے لیے وقت دیا ہے۔ اگر وہ اتنا انتظار کیے بغیر مجھ سے الجھا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔''

ویرا کو بحث اور تکرار میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ دنیا کے بے جان ترین موضوعات پر بھی گھنٹوں بے تکان بول سکتی تھی۔ اس بحث کو وہیں ختم کرنے کے لیے میں نے غصیلے انداز میں ایک جھٹکے سے اپنی کرسی چھوڑ دی اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

پیچھے دیکھے بغیر میں نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہا تو رکاوٹ کا احساس ہوا۔

میں بھنا کر پلٹا تو ویرا مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ دروازے سے باہر آ چکی تھی۔

اسے میرے تیوروں کا پہلے سے اندازہ تھا۔ میرے برسنے سے پہلے ہی بول پڑی ''تم جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گی۔ مجھے ہوٹل کی بک شاپ سے کچھ خریداری کرنی ہے۔''

میں نے غصیلی پھنکار کی صورت میں ایک گہرا سانس لیا اور تیزی سے لفٹ کی طرف چل دیا۔

اس بار ویرا نے موقع کی نزاکت بھانپ کر میری رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ راہ داری میں موجود رہ کر اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ میری راما کا روزینی سے مڈھ بھیڑ نہ ہو۔

لفٹ اسی فلور پر موجود تھی۔ میں اس کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچا اور کاؤنٹر پر موجود لڑکی سے خفیف سی مسکراہٹ کا تبادلہ کرتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔

میں اپنی دھن میں سر جھکائے ٹیلی فون بوتھ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کے اس عقبی حصے میں فٹ پاتھ کشادہ ہیں اور ان پر زیادہ بھیڑ بھاڑ بھی نہیں ہوتی۔ میں بے فکر تھا کہ میرے سامنے کوئی رکاوٹ تھی، نہ میں کسی کی راہ میں حائل ہو رہا تھا۔

میری یہ بے فکری ذرا ہی دیر کے لیے برقرار رہ سکی اور پھر اچانک سامنے سے ایک نرم و نازک اور خوشبو میں نہایا ہوا وجود میرے بدن سے آ ٹکرایا۔

اس لڑکی کے حلق سے ''اوہ...... سوری!'' کی ہلکی اور سریلی سی آواز برآمد ہونے سے پہلے ہی میں اس کا ہاتھ تھام کر اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ چکا تھا۔

''اوہ..... پلیز..... میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ میرا کوئی غلط ارادہ نہیں تھا۔'' اس نے خوف زدہ آواز میں سرگوشی کی۔

''مگر میرا ارادہ بہت غلط ہے۔'' میں نے بے رحمانہ سرد مہری سے کہا۔

میرے جیکٹ کے داہنی جیب میں پڑا ہوا اس کا ہاتھ میں نے باہر سے یوں دبوچا ہوا تھا کہ پوزیشن کی ذرا سی تبدیلی سے دوسروں کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ میں نے اسے اپنی جیب تراشی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

اس کے خوب صورت چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

وہ پچیس چھبیس سال کی ایک دراز قامت اور سبک اندام عورت تھی۔ چہرے پر بہت ہلکا اور واجبی میک اپ ہونے کے باوجود اس کے خدوخال بہت دلکش تھے جو ہراساں ہونے کی وجہ سے اور بھی نکھر آئے تھے۔ اس روز لندن کا موسم خاصا خنک تھا مگر اس خاتون کا لباس اس قدر کفایت زدہ تھا کہ چہرے سے کافی نیچے تک کھلے ہوئے سینے کی جلد پر جا بجا خون کے ارتکاز کی علامات نظر آ رہی تھیں۔

''مجھے چھوڑ دو..... خدا کے لیے، جو چاہو کر لینا مگر میرا ہاتھ چھوڑ دو۔'' وہ ملتجیانہ آواز میں بولی ''گشت کرتے ہوئے کسی ٹامی نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا تو میں برباد ہو جاؤں گی۔''

''تم مجھ سے دانستہ کیوں ٹکرائیں؟ تمہارا ہاتھ میری جیب میں کیوں گیا؟'' میں نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا کر سختی سے سوال کیا۔

''میں گرہ کٹ نہیں ہوں۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی ''کل رات سے بھوکی ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ ایشیائی لڑکے یہاں آ کر سفید لڑکیوں کے لمس کو ترستے ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تم مجھے سنبھالتے رہ جاؤ گے اور میں ناشتے کے لیے تمہاری جیب سے دو چار پاؤنڈ نکال لوں گی..... پلیز مجھے چھوڑ دو..... میں التجا کر رہی ہوں۔''

معاً میری نگاہ نیلی وردیوں اور رومن طرز کی اونچی ٹوپیوں میں ملبوس ان دو سپاہیوں پر پڑی جو نہایت سست روی سے آس پاس کا جائزہ لیتے اور گشت کرتے ہوئے نہایت خاموشی سے ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کی مداخلت سے وہ معاملہ کوئی سنگین رخ بھی اختیار کر سکتا تھا۔

ان دونوں وردی پوشوں پر نگاہ پڑتے ہی میں نے مشینی انداز میں جیکٹ کی جیب کی بیرونی سطح پر اپنے ہاتھ کی گرفت ختم کر دی اور اس لڑکی نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا ہاتھ نکال لیا۔

اس لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی فاقہ زدہ یا بدحال عورت نہیں بلکہ پیشہ ور جیب تراش تھی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی حیرت ناک طور پر پلک جھپکتے میں اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ خوف و ہراس کی جگہ اس کی آنکھوں میں تحقیر کی چنگاریاں سلگ اٹھیں۔

''تم کالے ایشیائی..... الو کے پٹھے!'' وہ دانت پیس کر غرائی۔ ''راہ چلتی لڑکیوں سے ٹکرا کر ان کے بدن پر چٹکیاں کاٹتے ہو.....''

وہ نہ جانے کیا کچھ بکتی ہوئی تیزی سے مخالف سمت میں بڑھتی چلی گئی۔ ہاتھ آزاد ہونے کے بعد اس نے ایک لمحے کے لیے بھی میرے پاس رکنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

اس ولایتی اور چور دوشیزہ سے گالیاں کھا کر میں بھی غالب کی طرح بے مزہ نہیں ہوا۔ سر جھٹک کر مسکرایا اور پھر اپنی راہ ہو لیا۔

میری جیب میں اترا ہوا اپنا ہاتھ آزاد ہونے کے بعد اس خاتون یا دوشیزہ نے جو کچھ کیا، اس کا مقصد میرے اوپر الزام تراشی نہیں تھا۔ شاید وہ اس کا کوئی آزمودہ مدافعانہ حربہ تھا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے راہ گیروں نے اگر ہم دونوں کو مشتبہ انداز میں ایک دوسرے سے تقریباً جڑے دیکھا ہوتا تو اس فرار ہوتی ہوئی لڑکی کے تبصرے سن کر وہ اس پر ذرا بھی شبہ نہ کرتے۔ بدگمانی میرے بارے میں پیدا ہوتی۔

میں اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی اس شہرِ خرابات میں جاتا رہا لیکن عقل و ہوش چرانے والیوں کی جیب تراشی کے کسی تجربے سے گزرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک عورت کی زیادتی کا نشانہ بننے اور پھر اسی کی زبان سے گالیاں سننے کا وہ اکلوتا تجربہ تھا جسے شاید لندن والیوں کے لیے کوئی کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔ جس شہر میں ناز نخروں اور تیکھی چتون سے جیبیں خالی کرانے کی بھرپور آزادیاں ہوں، سوہو کی پیچ در پیچ، نیم تاریک اور پُراسرار گلیوں میں قدرے روشن زینے اور تاریک تر چوبارے جیب تراش نازنینوں کی دکانوں کا درجہ رکھتے ہوں، وہاں کون احمق لڑکی کھل کر کسی کی جیب پر ہاتھ ڈالنے کی حماقت کرے گی۔

میرے لیے وہ تجربہ بہت انوکھا اور دلچسپ تھا۔ اپنے پسندیدہ فون بوتھ میں پہنچ کر جہانگیر کے گھر کا نمبر ملانے تک میں اس کے بارے میں سوچتا اور محظوظ ہوتا رہا۔

یہ کہانی میں آج لکھ رہا ہوں۔ گئے برسوں میں میری زبان سے یہ قصہ سن کر، بار بار لندن بلکہ دنیا جہان کی سیر کو جانے والے ایک دوست نے چند ماہ بعد بہت بھنا کر یہ شکوہ کیا کہ وہ آکسفورڈ اسٹریٹ، پکاڈلی اور سوہو کے بازاروں میں جا بہ جا اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے نوٹوں کی کھلی نمائش کرتے پھرے۔ رات گئے تک کوئی جیب تراش انگریز نازنین انہیں نہ ٹکرائی۔ یہ اور بات ہے کہ ''دیگر مصروفیات'' میں الجھ کر وہ رات کے ڈیڑھ بجے اپنے ہوٹل پہنچے تو ان کی تمام جیبیں خالی تھیں۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ کوئی جیب تراش نازنین ان پر مائل بہ کرم نہ ہوئی اور میری بدقسمتی تھی کہ ہوٹل سے ٹیلی فون بوتھ تک کی مختصر سی سڑک پیمائی میں ایک سفید فام لڑکی ناکام جیب تراشی کے بعد روکھی پھیکی گالیاں مجھے سنا کر موقع واردات سے فرار ہوگئی۔

کراچی میں فون کی گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔ فون کی گھنٹی اور پھر میری آواز سنتے ہی جہانگیر چہکنے لگا ''آخاہ...... تو اب تم بھی پاکستان سے باہر پہنچے ہوئے ہو...... کہاں ہو......؟ کیا حال ہیں تمہارے؟''

بین الاقوامی کال ملنے پر گھنٹی کی مخصوص آواز کو تبدیل کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں تھا اس لیے اس آواز سے اس نے میری پاکستان سے غیر حاضری کا اندازہ لگالیا تھا۔

میں نے اس سے نرمی سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کرکے ترشی سے کہا ''غنیمت ہے کہ اس وقت تم ہوش میں ہو ورنہ تم یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ میں جنت سے بول رہا ہوں۔''

''یہ تم کیسی جلی کٹی باتیں کررہے ہو؟'' اس کی آواز سے حیرت جھلک رہی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ سلمیٰ غائب ہے اور تم دن رات پی رہے ہو۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟ دن میں تو میں زیادہ نہیں پیتا...... دراصل سلمیٰ چند روز کے لیے اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ میری بزنس والی ڈیل میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ فرصت اور بے کاری میں تھوڑا بہت شغل ہوتا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے......''

''تمہاری یہ بلانوشی تمہیں لے ڈوبے گی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کے قہر بار لہجے میں کہا۔

''میرے خلاف کون تمہارے کان بھر رہا ہے؟ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' مجھے غصہ آگیا ''یہ باتیں تمہاری والدہ سے معلوم ہوئی ہیں۔''

''والدہ؟'' اس کی تحیر زدہ آواز ابھری ''انہیں تو مرے ہوئے بھی مدت ہوگئی۔''

''میں اس کی بات کررہا ہوں جسے تم پچھلی رات

اپنے پاس بلانے کے لیے مرے جا رہے تھے۔"

"ہاں...... آں...... کچھ یاد تو آیا۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ شاید کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑایا۔ "رات کو کسی لڑکی نے انگریزی میں فون تو کیا تھا۔ وہ کون تھی؟"

اس نے بے ساختہ انداز میں انگریزی میں فون کرنے کی جو ترکیب استعمال کی تھی اس پر میں اپنی بے ساختہ ہنسی نہ روک سکا البتہ میری وہ ہنسی بے آواز ہی رہی۔

"وہ بنکاک کی ایک گھٹیا عورت تھی جسے میں نے تمہارا نمبر ملا کر دیا تھا۔" میں نے ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

ایک طرف میں نے اسے یہ تاثر دیا تھا کہ میں مغرب کے بجائے مشرق کی سمت میں نکلا ہوا تھا۔ دوسری طرف دیرا اور غزالہ کی طرف سے اس کا ذہن ہٹانا چاہا تھا۔

میرے جواب سے اسے تھوڑا سا حوصلہ مل گیا اور اس نے کہا "خود بنکاک میں گھٹیا عورتوں کے ساتھ عیاشیاں کرتے پھر رہے ہو اور مجھے گھر میں پینے پر لعنت ملامت کر رہے ہو۔"

"میں کسی عیاشی کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں۔ تم میری مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی میرے خون کے پیاسے میرا سراغ لگانے کے لیے تمہاری طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔"

"اوہ...... یعنی پھر کوئی بڑی گڑبڑ ہونے کا خطرہ ہے۔" اصل صورت حال کا ادراک ہوتے ہی اس کی آواز میں گہری سنجیدگی عود کر آئی۔

"تمہارے پاس کسی کا کوئی مشتبہ فون تو نہیں آیا تھا؟" میں نے ناگواری سے پوچھا۔

"مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" اس کی تفکر آمیز آواز ریسیور میں سنائی دی۔

"تمہارے ساتھ ساری خرابی یہی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں رونما ہونے والی کوئی بات تمہیں یاد نہیں رہتی۔ اس حالت میں کوئی بہت آسانی سے تمہاری گردن تک اتار سکتا ہے۔"

"تم یقین کرو کہ اب میں سارا اسٹاک ٹھکانے لگانے کے لیے مجبوری کے عالم میں پی رہا ہوں۔ دن پہلے میں خود اپنے بھولے بھٹکے ذہن سے تنگ آ کر، بلکہ شرمندہ ہو کر شراب نوشی سے توبہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ قسمت خراب تھی کہ میں اس فیصلے پر عمل نہ کر سکا۔"

"تم جھوٹے ہو۔ فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اس پر عمل کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟"

فون پر اس کے ایک گہرے سانس کی آواز آئی پھر وہ بولا...... "میں قسم کھا کر بتا رہا ہوں کہ میں شراب نوشی ترک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس وقت میرے پاس اسکاچ، جن اور برانڈی کی بیالیس ملی جلی بوتلیں تھیں۔ میں نے ایدھی سینٹر والوں سے فون پر کہا کہ وہ آ کر عطیے کے طور پر یہ ساری بوتلیں لے جائیں تو فون سننے والا بوکھلا کر توبہ استغفار کرنے لگا کہ وہ شراب کا کیا کرے گا......"

"وہ تمہارا بہانہ تھا۔ ایدھی والے اس شراب کا کیا کرتے۔ تم نہیں سدھر سکتے...... تمہاری......"

اس نے میرے بات درمیان ہی سے اچک لی "میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھ سے عطیے میں لے جا کر وہ خود شراب نوشی شروع کر دیں۔ میری نیت بالکل صاف تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ آج کل ڈی لکس اسکاچ کتنی مہنگی ہو گئی ہے۔ میرا مطلب تھا کہ وہ ساری بوتلیں فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والی رقم اپنی مرضی کے کسی بھی فلاحی استعمال میں لا سکتے تھے۔"

"لعنت ہو تم پر۔ اچھا ہی کیا کہ اس شخص نے تمہارے چکر میں آنے سے انکار کر دیا۔ وہ تم سے عطیہ لے کر جاتے اور ایدھی کے مخالفین اگلے ہی دن طوفان کھڑا کر دیتے کہ وہ لوگ شہر میں اسمگل کی ہوئی ولایتی شرابیں فروخت کر رہے ہیں۔ اس حرام کاری سے بہتر تھا کہ تم وہ بوتلیں تلف کر دیتے۔"

"میری بات سنو!" اس کی آواز مدافعانہ ہو گئی "وہ سب اسٹینڈرڈ سے لے کر ڈیلسٹرنگ کی بوتلیں ہیں اور ان کی مالیت ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ اگر میں یہ رقم ایک نیک کام میں لگانا چاہ رہا تھا تو میرا کیا قصور تھا؟ مجھ سے تعاون کیوں نہیں کیا گیا؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ شراب حرام ہے۔ بوتلیں بیچنے سے ان کی شہرت داغ دار ہو جاتی اور پھر نیک کاموں کے لیے کیا حرام کا پیسہ ہی رہ گیا ہے؟ تم چاہتے تو وہ بوتلیں توڑ کر ان کی رقم نقد بھی دے سکتے تھے۔"

"مجھ سے حرام اور حلال کی یہ باتیں مت کرو۔" اس بار جہانگیر کا لہجہ ترش ہو گیا "اسمگلنگ، رشوت اور چور بازاری کی آمدنی سے کمائی ہوئی رقمیں کیا حرام نہیں ہوتیں؟ لمبی لمبی رقموں کے چندے دینے والوں سے تو کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ حلال ہے یا حرام...... پھر میری بیالیس بوتلوں پر اعتراض کیوں کیا گیا؟ وہ بھی نقد رقم ہی تھی۔ نقد رقم کے دام آئے دن گرتے رہتے ہیں۔ اس غیر ملکی جنس کے دام تو بڑھتے ہی بڑھتے ہیں۔ مجھے اس نیک کام سے روک دیا گیا اور اب میں نے احتجاج کرتے ہوئے وہ ساری بوتلیں خود ہی خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس کے بعد ایک قطرہ بھی نہیں خریدوں گا۔"

"مفت کی مل جائے گی تو پیتے رہو گے؟" میں نے جلے کٹے لہجے میں پوچھا۔

میرے کانوں میں اس کا ہلکا سا قہقہہ گونجا پھر وہ بولا "منی بیگم کی غزلیں سن لو۔ پتا چل جائے گا کہ مفت کی ٹھکرانے کا عذاب کتنا سنگین ہوتا ہے۔" بات کرتے کرتے وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا "مگر یار، اس شہر میں مجھ کو تمہارے سوا اور کون مفت کی پلا سکتا ہے۔ اب تو شاید تم ہی میرے اکلوتے دوست رہ گئے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم واپس کب آ رہے ہو؟"

"میں سنگین الجھنوں سے دوچار ہوں۔ ہم میں سے کوئی بھی فلیٹ پر نہیں ہے۔ ہم اپنی جانیں بچاتے پھر رہے ہیں۔" میں نے اسے احساس دلانے کے لیے اصل صورت حال میں کچھ رنگ آمیزی کرتے ہوئے کہا "اپنی بیالیس بوتلیں تم بعد میں بھی ختم کر سکتے ہو۔ آج کل ذرا ہوش میں رہنے کی کوشش کرو۔ اپنی غفلت یا مدہوشی میں تم مارے گئے تو تمہارے یہ اثاثے بے کار پڑے رہ جائیں گے۔"

"کیوں مجھے ڈرا رہے ہو؟" خوف زدہ سی ہنسی کے ساتھ اس کی آواز آئی۔

"میں نے حقیقت تمہارے گوش گزار کر دی ہے۔ اب عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ اس وقت میں اس بری طرح گھرا ہوا ہوں کہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"تو کیا دوسرے لوگ بھی تمہارے ساتھ بنکاک گئے ہوئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میں اکیلا ہوں...... یوں سمجھ لو کہ جس کے جدھر سینگ سمائے وہ اسی طرف بھاگ نکلا۔ آپس میں رابطہ ہوگا تو ایک دوسرے کی کوئی خیر خبر ملے گی۔"

"اگر حالات اسی قدر ابتر ہیں تو سمجھ لو کہ میں نے اسی وقت سے شراب چھوڑ دی۔ مجھے بتاؤ کہ میں شہر میں تمہارے ساتھیوں اور غزالہ کی تلاش کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" وہ جوش میں آ گیا۔

"فی الحال اپنے گھر میں مسلح اور چاق و چوبند رہو۔ دوستوں یا دشمنوں کی طرف سے کوئی رابطہ کیا جائے تو پوری ذہانت سے کوئی فیصلہ کرنا۔ اس وقت بس اول خان اور اس کے آدمی ہی تمہارے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں اسے یہ سب بتا چکا ہوں۔ وہ تم سے بات کرے گا۔"

"ہاں، میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ صبح اس کا فون آیا تھا۔ وہ بھی اسی قسم کی کچھ گول مول باتیں کر کے مجھے مشورے دے رہا تھا۔ میں نے اسے [illegible] دیا تھا۔"

"اس کے مشوروں پر عمل نہ کر کے تم زبردست خسارے میں رہو گے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے غور سے سنو اور اس پر حرف بحرف عمل کرو۔ اس وقت پورے شہر میں وہی تمہارا اکلوتا ہمدرد اور غمگسار ہے جس سے تم کسی آڑے وقت میں مدد کی امید کر سکتے ہو۔"

وہ ان دنوں جس رفتار سے مے نوشی کر رہا تھا اس کی بنا پر دن کے کسی بھی حصے میں اس کے ذہن کا الکحل کے اثرات سے آزاد رہنا ممکن نہیں تھا۔ غنیمت تھا کہ اس وقت وہ اثرات معقولیت کی حد تک کم تھے اور اس نے کسی جھڑپ یا زیادہ تکرار کے بغیر میری بات سمجھ لی تھی۔

حقیقت یہ بھی کہ ان دنوں حالات بہت زیادہ ناسازگار اور غیر یقینی تھے۔ گفتگو کے اختتام تک میری بتائی ہوئی تصویر نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے

اول خان کے گھر کا نمبر ملایا تو خود اسی نے فون اٹھایا۔
اول خان نے روایتی پرتپاک انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا وہ اضمحلال بڑی حد تک کم ہو چکا تھا جو سلطان شاہ کے پُراسرار اغوا کے بعد سے اس پر طاری تھا۔

"تمہارے لیے میرے پاس بس ایک ہی خبر ہے کہ کل ہم یونائیٹڈ ائر لائن کی پرواز سے نیویارک روانہ ہو رہے ہیں۔ ہم سے پہلے بدری وہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"یونائیٹڈ!" اول خان کی تحیر زدہ سی آواز ابھری "تمہاری ساری سفری دستاویزات میں نے ہی بنوائی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ امارات کے مسافر یونائیٹڈ سے نہیں، ورجن اطلانتک ائر لائن سے بحر اوقیانوس عبور کرتے ہیں۔ ذرا ایک مرتبہ پھر دیکھ لینا۔ ایسا نہ ہو کہ پرواز نکل ہی جائے۔"

"میں دیکھ لوں گا۔" میں نے بے اطمینانی کے ہلکے سے احساس کے ساتھ جواب دیا "امارات والوں نے مجھے اس پرواز کا صرف نمبر اور وقت بتایا تھا۔ پتا نہیں میرے ذہن میں کیوں یونائیٹڈ جم گیا۔ میں ہوٹل واپس جا کر دوبارہ دیکھوں گا۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے اس کے بارے میں تم سے بات کر لی۔"

"آئزک بیل کے آدمی سفارتی مراعات کی آڑ میں سلطان شاہ کو یہاں سے نکال لے گئے ہیں مگر پھر بھی امریکیوں میں صفِ ماتم سی بچھی ہوئی ہے۔ پاکستان میں موجود ہر امریکی کو تابوت کی صورت میں اپنی واپسی کا خوف دہلائے دے رہا ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں بیس تجربے کار امریکی کمانڈوز کی بیک وقت موت کا تصور ان لوگوں کو مدتوں تک آسیب بن کر ڈراتا رہے گا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ ان وحشیوں کو یہ آسیب میرے ملک کی سرزمین پر نظر آیا ہے ورنہ دنیا کا کون سا خطہ ہے جہاں انہوں نے دہشت گردی اور دھاندلی نہ مچائی ہو۔"

"مجھے ان پر ترس آرہا ہے۔" اول خان کی آواز واقعی ترحم آمیز تھی "وہ بیس کمانڈوز برے عزائم کے ساتھ یہاں آئے تھے اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے لیکن ہمارے ملک میں دوسری تحقیقی اور پیداواری سرگرمیوں میں مصروف امریکیوں کا کیا قصور ہے؟ ان بے چاروں کے اس ذہنی عذاب کا تصور کر کے ہی مجھے ایک مجرمانہ سی خلش ستانے لگتی ہے۔"

"یہ تمہاری طفلانہ سوچ ہے۔" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "تحقیقی اور پیداواری سرگرمیوں میں مصروف امریکی ہماری محبت میں یہاں نہیں آتے۔ ہمیں امریکا اور دوسرے عالمی مالیاتی اداروں سے بھاری سود پر جو امداد ملتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ یہ بندر اپنی مراعات اور تنخواہوں کی صورت میں یہاں سے سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور ہماری گردنوں میں پڑے ہوئے قرضوں کے طوق کا وزن روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان بدمعاشوں پر خرچ ہونے والی رقوم کا صرف آدھا حصہ بھی ہمارے اختیار میں ہو تو اس ملک سے بے روزگاری جیسے ہولناک عفریت کا خاتمہ ہو جائے۔"

"تمہاری یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے لیکن میرا نکتہ دوسرا ہے۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک کیوں روندے جاتے ہیں۔ یہ حکومتوں کی لڑائیاں ہوتی ہیں جو ان ہی کے اقتصادی معاہدوں کے ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہیں۔ اس میں بے گناہ پاکستانی اور امریکی ماہروں کا کیا قصور ہے؟"

"آج کے دور میں حکومت اور عوام الگ نہیں کیے جا سکتے۔" میں نے اس کی کج فہمی پر بل کھاتے ہوئے تلخی سے کہا "جمہوری حکومتیں عوام کی رائے سے اقتدار میں آتی ہیں۔ اگر غلط حکومت منتخب کر لی جائے تو اس کا خمیازہ عام لوگوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔"

"ملکی سطح پر تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔ جو بوؤ گے وہ کاٹو گے مگر یہ بتاؤ کہ پاکستان میں یونین ٹکساس، آئی سی آئی، لاسمو، پروکٹر اینڈ گیمبل جیسے اداروں کے غیر ملکی ماہروں کا کیا قصور ہے کہ وہ یہاں خوف و ہراس کے عالم میں اپنا وقت گزاریں اور انہیں خواب میں بھی پھولوں سے سجے ہوئے اپنے تابوت نظر آتے رہیں۔ وہ اپنے پاکستانی شرکاء سے کیے ہوئے بین الاقوامی معاہدوں کے نتیجے میں یہاں آتے ہیں اور حکومتوں کے کسی بھی

اختلاف سے قطع نظر انہیں سکون سے یہاں رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔"

"بالکل ہے۔" میں نے پرزور لہجے میں اس کی تائید کی "اور ہونا چاہیے لیکن اس مقدس تصور کو سفاک امریکی حکمرانوں نے ہی مجروح کیا ہے۔ طاقت کے زعم میں یہ خون آشام درندے بن گئے ہیں، اسی لیے ان کے شہریوں کو دنیا بھر میں خطرات لاحق ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ حکومتوں کو شہری جنم دیتے ہیں۔ انہوں نے جو بویا ہے، اسے کاٹے بغیر نئی فصل اگانی ممکن نہیں ہے۔"

"امریکا میں آج تک کسی بڑے نسلی یا لسانی سانحے کی خبر نہیں آئی۔" اول خان نجانے کیوں اس وقت امریکا کی مدافعت پر تل گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "وہاں بے شمار افراد مارے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے جرائم ہوتے ہیں لیکن ان میں عصبیتوں کا یہ رنگ نہیں جھلکتا۔"

"اس کی ایک بڑی وجہ ہے۔ امریکا وہاں کے اصل باسیوں کا وطن نہیں ہے۔ انہیں بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا آج وہ ریڈ انڈین بن کر تاریک اور پسماندہ جنگلوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اس ملک پر پورے یورپ سے آئے ہوئے پناہ گزینوں اور جلا وطنوں کا تسلط ہے اور وہی اس ملک پر حکمران ہیں۔ اس سرزمین پر صرف اس کی آزادی کی جنگ لڑی گئی ہے۔ اس کے بعد امریکا نے ہر جنگ پرائی زمینوں پر لڑی اور جیتی یا ہاری ہے۔ اس ملک کے باسیوں نے نئی جنگوں میں سے کسی جنگ کا مزہ نہیں چکھا، اسی لیے وہ اپنے ہر دشمن کو پوری طاقت سے کچل دینے کے لیے حکومت کے حق میں نعرے لگاتے ہیں۔ جس دن امریکا کے شہریوں کو عملی طور پر کسی جنگ کی تباہ کاریوں کا اندازہ ہو گیا [illegible] دن پورے کرہ ارض پر امن قائم ہو جائے گا۔"

"یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ امریکی حکومت کے جرائم کی سزا امریکیوں بلکہ عام اور بے گناہ امریکیوں کو دینی جائز ہے۔" اول خان نے ایک نتیجے پر پہنچ کر مجھ سے تصدیق چاہی۔

"یہ اصول میرا نہیں، خود امریکیوں کا بنایا ہوا ہے۔" میں نے اس کی کسی گرفت سے بچنے کے لیے مدافعانہ انداز میں کہا "آج وہ خدائی فوجدار ہیں۔ ہمیں ان کے بنائے ہوئے اصولوں کا احترام کرنا چاہیے۔"

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان لوگوں نے اپنی تمام تر بدمعاشیوں کے باوجود کبھی ایسے کسی نظریے کا اعلان کیا ہو۔" اول خان نے بہت شائستگی سے میری رائے سے اختلاف کیا۔

"وہ اعلان نہیں، عمل کرتے ہیں۔ کیوبا، ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا اور افغانستان کے بعد عراق ان کی درندگی کا تازہ ترین شاہکار ہے۔ انہوں نے اپنی من مانی بمباری اور تباہی کے لیے اپنی ہی نہیں، نجانے کتنی قوموں کے شانے استعمال کیے۔ دنیا کی ساری بڑی قومیں ایک سی قوم کو کچلنے کے لیے یوں ہم آواز اور صف آرا ہو گئی تھیں جیسے کرہ ارض پر فتنہ دجال ظہور میں آچکا ہو۔"

"عراق!" اول خان کی توانا آواز اس بار اس کے حلق میں پھنس گئی "اس کے ساتھ واقعی زیادتی ہوتی چلی آرہی ہے۔ پورا ملک کھنڈر کر دیا گیا۔ فصلیں اجاڑ دی گئیں، بدلہ لینا جرم اور [illegible] دیا گیا ہے۔ [illegible] مولود و موجود شہریوں کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، ہزاروں نومولود اپنی ماؤں کی خشک چھاتیوں اور خشک دودھ سے محرومی کی وجہ سے آغوشِ اجل میں جا سوئے۔ بے شمار نومولود اس بمباری کے نتیجے میں اپنی ماؤں کی کوکھ میں سوکھ کر رہ گئے...... ان سب کو سزا صرف اس لیے دی جا رہی ہے کہ وہ صدام حسین کے حامی ہیں حالانکہ براہِ راست ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"اور یہی میری سوچ ہے۔" میں نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا "جب ان سیاسی آمیزشوں میں امریکا کا صدر بغداد سے موصل تک بے شمار عراقیوں کی ہلاکت کا فیصلہ کر سکتا ہے تو امریکیوں کے رسوائے زمانہ عزائم کے مقابلے میں پاکستان کا کوئی اول خان یونین ٹکساس یا کسی اور کمپنی کے اہل کاروں کے بارے میں ہمدردانہ سوچ کیوں کر رکھ سکتا ہے۔"

"تمہاری باتوں میں وزن ہے۔ جب وہ صدام حسین سے اختلافات کی سزا پورے عراق کو دے سکتے ہیں

تو پھر اسی اصول کا اطلاق ان پر بھی ہو سکتا ہے لیکن انسانی ہمدردی کے لحاظ سے سوچو تو یہ دونوں طریقے غیر منصفانہ اور بالکل غلط ہیں۔"

"تم یہ سوچتے رہو وہ اپنا کام کرتے رہیں گے۔ جسے اپنا حریف یا دشمن تصور کرتے ہیں، اسے بے دریغ ٹھکانے لگاتے چلے جائیں گے۔"

"یہ وہی بات ہے جو میں کل کہہ رہا تھا۔ وہ زبردست ہیں۔ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ اب یہی دیکھو کہ سلطان شاہ کو یہاں سے بالکل مجرمانہ انداز میں لے جایا گیا ہے لیکن ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے بارے میں حرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتے کیونکہ ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ شکایت کی جائے تو جھوٹی الزام تراشی کے جرم میں وہ ہمارے خلاف کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"ان باتوں کو تم سے زیادہ کون جانتا ہے۔ مجھے بھی تو حیرت تھی کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آج تم ان امریکیوں کے ہمدرد و ہم نوا کیوں بنے ہوئے ہو۔"

"جذبات کے وقتی دھارے میں بہہ کر انسان بہت کچھ کر گزرتا ہے لیکن ہمیشہ پنپنے والے اصول اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن پر ان ہی اصولوں کی یلغار ہو رہی تھی۔"

اس کا وہ مدافعانہ انداز مجھے بہت پسند آیا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر انسان دنیا بھر میں نجانے کیا کچھ کر گزرتے ہیں لیکن ان کی ان غیر ذمے دارانہ حرکتوں سے آفاقی اصول کبھی نہیں بدلتے۔ وہ اپنی جگہ ہمیشہ اٹل رہتے ہیں اور پھر آنے والے وقتوں کا مورخ ہی ان غیر ذمے دارانہ حرکتوں اور خونریزیوں کے بخیے ادھیڑتا ہے۔

"ہم اور تم عمل کی دنیا کے آدمی ہیں۔ اگر یہ نمائشی آدرش ہمارے ذہنوں پر سوار ہونے لگے تو پھر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ کل ہم ان کی سرزمین پر ہوں گے۔ دیکھو وہاں کیا ہوتا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت شاید تم نے روانگی کی اطلاع دینے کے لیے ہی فون کیا ہے؟"

"اسے بھی ایک سبب کہہ سکتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے غزالہ سے بات کرنی ہے۔"

"وہ تمہاری آواز سننے کی آرزو میں تڑپتی رہتی ہے۔" اول خان کی حسرت زدہ آواز میرے کانوں میں گونجی "مگر اس وقت وہ گھر پر نہیں ہے۔ میری بیوی کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہے۔"

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر کہا "وہ آئے تو اس سے یہ کہہ دینا کہ مجھ سے گفتگو ہونے تک ویرا سے براہ راست بات کرنے سے گریز کرے۔ اس کے ذہن پر کچھ شرارت سوار ہو رہی ہے۔"

اول خان میری بات سن کر ہنس پڑا "اور تم ویرا کی شرارت سے خوف زدہ ہو...... بہت خوب! چاہو تو تم مجھے پورا پیغام دے سکتے ہو۔ میں غزالہ کو سنا کر ہر بات بھول جاؤں گا۔"

"ویرا کو اچانک یہ فکر لاحق ہو گئی ہے کہ ہم اب تک صاحب اولاد کیوں نہیں ہوئے ہیں۔" میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد اول خان کو اس راز میں شریک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"استغفر اللہ!" اول خان کی زبان سے بے ساختہ نکلا "اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے بھی کبھی وہ بہت بد ذات نظر آنے لگتی ہے۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ ان میں تم کیا کہہ سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ ویرا ہے۔ وہ میرے حوالے سے جھوٹ سچ بول کر کسی بھی وقت غزالہ کو پریشان کر سکتی ہے۔ اسے بتا دینا کہ میں نے اس موضوع پر ویرا کو لتاڑ دیا تھا۔"

"ضرور بتا دوں گا مگر تمہاری اجازت سے مجھے اپنی بیوی کو اعتماد میں لینا ہو گا۔" اول خان نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "یہ عورتوں کی باتیں ہیں اور ان ہی کو بھلی لگتی ہیں۔ میں اس موضوع پر غزالہ سے دو تین فقرے بھی نہ بول سکوں گا۔"

"یہ تمہاری صوابدید پر منحصر ہے۔" میں نے برجستہ کہا۔ "تمہاری بیوی تم سے زیادہ سمجھ دار ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔ تمہارا پیغام غزالہ تک پہنچ جائے گا۔ ویرا نہایت بے وقوف عورت ہے۔ اسے معلوم ہونا

چاہیے کہ ایسے نازک معاملات پر یوں کھل کر گفتگو نہیں کی جاتی۔ یہ معاملات اللہ کی رضا پر منحصر ہوتے ہیں۔ ان کو چھیڑنے سے بعض اوقات دل آزاری تک سرزد ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں نیویارک پہنچنے کے بعد ہی تم سے رابطہ کروں گا۔"

فون بند کر کے میں ہوٹل کی طرف واپس ہو لیا۔

ویرا مجھ سے پہلے ہوٹل کے کمرے میں موجود تھی۔ اس کے دروازہ کھولنے پر میں اندر داخل ہوا تو مسہری پر ایک بڑا سا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ ویرا شاید اسی پر مغز زنی کر رہی تھی۔

"یہ کیا لیے بیٹھی ہو؟" میں نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لندن کے مضافات میں سو میل کا نقشہ ہے اور کام کی چیز ہے۔"

"تمہیں اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ لندن میں آج ہماری آخری رات ہو گی۔"

"نقشہ دیکھ کر میں یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آج شام کو راما کارو زینی کو کس طرف نکلنے کی دعوت دی جائے۔" اس نے دوبارہ مسہری پر چڑھ کر جواب دیا۔

"اس کے لیے اتنی عرق ریزی کی کیا ضرورت تھی؟ ہر موٹر وے کچھ دیر کے بعد مضافاتی ویرانوں میں جا نکلتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک اس سے بات نہیں کی۔"

وہ میرے آخری سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی "برائٹن بیچ یہاں کا مشہور ساحلی علاقہ ہے۔ اے تھیس نامی سڑک کرائیڈن اور گیٹ وک کے راستے وہیں ختم ہو جاتی ہے۔"

"حیرت ہے کہ اتنی مغز زنی کے بعد تم نے ایسا احمقانہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا "شاید تمہیں علم نہیں کہ اس ساحل کا ایک حصہ ننگوں کے کلب کے لیے مخصوص ہے جہاں مرد اور عورتیں مادر زاد حالت میں سمندر کی لہروں اور سورج کی تمازت سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ان تماشوں کی وجہ سے یہ علاقہ نظریں سینکنے والے سیاحوں میں بہت مقبول ہے۔ ایسی بھیڑ بھاڑ کی جگہ ہمارے لیے موزوں نہیں رہے گی۔"

"میں لندن کی گلی کوچوں سے خوب واقف ہوں لیکن مضافات کے بارے میں زیادہ باخبر نہیں ہوں۔" اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا "یہ بھی آج ہی سن رہی ہوں کہ برائٹن پر ننگوں کا کوئی کلب بھی ہے۔"

"حیرت ہے کہ تم اتنی معصوم اور بے خبر ہو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "ایسی باتیں تو پہلی بار لندن آنے والوں کو بھی معلوم ہوتی ہیں۔"

"اگر برائٹن بیچ موزوں نہیں ہے تو پھر کدھر جانا مناسب رہے گا؟" ویرا نے پوچھا۔

"لندن سے شمال کی طرف چل دو۔ اس کے لیے موٹر وے ایم ون سب سے بہتر رہے گی۔"

ویرا دوبارہ نقشے پر جھک گئی۔ شاید وہ ایم ون کا جائزہ لے رہی تھی۔

برطانیہ میں موٹر ویز بہت منصوبہ بندی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ ہر شاہراہ دو رویہ ہے جس کے درمیان میں لگی ہوئی آہنی رکاوٹوں کی وجہ سے کہیں بھی واپس گھومنا ممکن نہیں ہے۔ ایک مرتبہ موٹر وے پر چڑھ آنے کے بعد اس پر سے مخصوص نکاس کے ذریعے ہی اترا جا سکتا ہے۔ ان موٹر ویز کو کہیں بھی کوئی سڑک کراس نہیں کرتی۔ سڑک کے اطراف میں واقع آبادیوں کو ملانے والی سڑکیں نکاس یا ایگزٹ سے ملی ہوئی ہیں یا پھر اوپر سے گزرتی ہیں۔ راستے میں مسافروں کی سہولت کے لیے بنے ہوئے سروس ایریاز میں ریستوران، بار، پٹرول پمپ، اسٹور اور غسل خانے وغیرہ قائم ہیں۔ دونوں طرف کے مسافروں کی سہولت کے لیے سڑک پر بالائی پل بنا کر یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ مسافر سڑک عبور کر کے دوسری طرف واقع سہولتوں سے استفادہ کر سکیں۔

سرسبز دیہی علاقوں میں جہاں مویشی پالے جاتے ہیں اور چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں وہاں موٹر وے کے کناروں پر ایسی باڑھ لگائی گئی ہے کہ مویشی سبزہ زاروں سے اتر کر سڑک پر نہ آ سکیں اور ٹریفک کی روانی میں رکاوٹ کا سبب نہ بنیں۔

اپنے جائزے سے فارغ ہو کر ویرا نے پھیلا ہوا نقشہ تہ کیا اور فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔

انٹر کام پر راما کارڈزینی کے کمرے کا نمبر ملا کر ویرا نے صرف ایک ہی فقرہ ادا کیا جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

اس مختصر سی گفتگو پر میرے دل میں تجسس جاگ اٹھا مگر میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ویرا بتانے لگی ”اس وقت اس کی بیوی کمرے میں ہے۔ اسے روانہ کر کے وہ خود ہی مجھے فون کرے گا۔“

”ایسا نہ ہو کہ فون کرنے کے بجائے وہ تمہارے دروازے پر ہی آ پہنچے۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”آنے کا ارادہ ہوتا تو وہ تمہارے بارے میں ضرور پوچھتا۔ وہ فون ہی کرے گا۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ راما کارڈزینی اطالوی مافیا کے ایک ڈان کا بیٹا ہے؟“ چند ثانیوں کے توقف کے بعد میں نے پرخیال لہجے میں ویرا سے پوچھا۔

”میرے کہنے سے زیادہ حقیقت بھی یہی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”پھر وہ اب تک تمہارے بارے میں اتنا بے خبر کیوں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”تم کس بے خبری کی بات کر رہے ہو؟“

”وہ اب تک تمہیں سیکا ہی سمجھ رہا ہے۔ اسے آج تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ سیکا کے روپ میں اس سے ملنے والی ویرا الائیڈ تھی۔ اس جیسے آدمی کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔“

”معلوم تو اس وقت کرتا جب اسے شبہ ہوتا کہ میں دہری زندگی گزار رہی تھی۔ اس زمانے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ میں ویرا الائیڈ ہوں۔“

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ میں سوچ رہا تھا کہ راما کا ..... اپنی بیوی کے مقابلے میں خاصی جارح طبیعت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ اسے اپنی بیوی کو ہوٹل کے کمرے سے رخصت کر کے ویرا سے رابطہ کرنے میں

”تم مجھے اس کے ساتھ سیر پر جانے کا مشورہ تو دے بیٹھے ہو مگر تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ آخر ویرا نے ہی چونک کر کمرے کی فضا میں چھایا ہوا سکوت توڑا۔

”ویلنے میں سیر کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”یہ اندازہ میں لگا ہی چکی ہوں کہ تم اسے ختم کرنا چاہتے ہو لیکن یہ قدم اٹھانا کیا ضروری ہے؟ صرف آج رات تک کے لیے کہیں الجھا دینے سے بھی کام بن سکتا ہے۔ کل صبح وہ پورے شہر کی خاک چھان ڈالے تب بھی اسے ہمارا سراغ نہیں مل سکے گا۔“

”زخمی سانپ بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور راما تو ویسے ہی بہت کینہ پرور آدمی ہے۔ روم میں تم کو کھو دینے کی خلش تمہیں دوبارہ پہچانتے ہی اس کے دل میں پوری شدت سے تازہ ہو چکی ہے اور اب وہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے مار ڈالنے پر بھی آمادہ ہے۔ اگر اس بار ہم اسے جل دے کر نکل گئے تو اس کی جھنجلاہٹ اسے پاگل کر دے گی۔ ہو سکتا ہے کہ بدلہ لینے کے لیے وہ سب کچھ بھول بھال کر ہم دونوں کی تلاش میں لگ جائے۔ میں اسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔“

وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی پھر تائیدی انداز میں بولی۔ ”پہلے اس نے صرف مجھے دیکھا تھا اور اب وہ تم کو بھی پہچانتا ہے۔ ہمارے موجودہ کوائف اسے ہوٹل کے ریکارڈ سے مل سکتے ہیں۔ اگر وہ لندن میں ڈان کارڈزینی کے آدمیوں سے مل بیٹھا تو واقعی بہت کچھ معلوم کر لے گا۔“

”ہم اب مزید خطرات مول نہیں لے سکتے۔ راما کا قصہ یہیں ختم ہونا ضروری ہے۔“

”تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مافیا کے ایک بااثر ڈان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بہت خراب ہے۔ روم میں بھی ہر ایک اس سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اس کے منہ لگنے والے پُراسرار حالات میں جلد ہی مار دیے جاتے ہیں یا پھر کسی حادثے میں زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتے ہیں۔ اس جیسے سفاک دشمن کو ڈھیل نہیں دی جا سکتی۔“

”میں نے بھی یہی سب سوچ کر ایک فیصلہ کیا تھا اور ابھی تک اس پر قائم ہوں۔“

”اگر میں اس کے ساتھ نکل گئی تو تم ہمارا ساتھ کیسے دو گے؟“ ویرا نے پوچھا۔

”تم اس کے ساتھ پروگرام طے کر کے مجھے بتا دینا۔ میں ٹرین کے ذریعے مقررہ مقام پر پہنچ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ موقع ملتے ہی ہم دونوں اس سے چھٹکارا حاصل کر کے لوٹ آئیں گے۔“

”تمہاری یہ تجویز قابلِ عمل نہیں ہے۔“ ویرا نے فیصلہ صادر کر دیا ”اس منصوبے پر اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب سارا علاقہ ہم دونوں کا دیکھا بھالا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایم ون کے مضافاتی علاقوں سے واقف ہو مگر میں اس معاملے میں بالکل کوری ہوں۔ پتا نہیں راما کا مجھے ساتھ لے کر کہاں جا نکلے۔ میں نے اسے کسی خاص سمت میں چلنے پر مجبور کیا تو وہ چوکنا ہو جائے گا۔“

راما کا ایک بہت بڑے مجرم کا بیٹا تھا اور مجرم بھی ایسا جو اپنے پیشے کے اظہار میں ایک شان محسوس کرتا تھا۔ اسے موروثی طور پر خطرات کو بھانپ لینے کی صلاحیت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ وہ ویرا کو لے کر اپنی مرضی کے کسی راستے پر چل پڑتا تو میرا پورا منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔

”تمہاری بے خبری کی وجہ سے گڑبڑ ہونے کا امکان ہے۔“ میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

”جب ہم نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر اتنے لمبے بکھیڑے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ کام میں خود بھی انجام دے سکتی ہوں۔ تمہارے نکلنے کی ضرورت نہیں۔“

”جسمانی طور پر وہ تم سے بہت مضبوط ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”اگر تمہارا وار اوچھا رہا تو تم خود سمجھ سکتی ہو کہ کیا ہو گا۔“

”میں اس سے کشتی لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ گیتا کا بھرا ہوا ریوالور ہمارے پاس موجود ہے۔ بارودی ہتھیار کے ذریعے دس برس کا بچہ بھی بڑے سے بڑے شہ زور کو زیر کر سکتا ہے۔“

”مگر پھر بھی میں ناکامی کا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ تم دونوں کے آس پاس میرا موجود رہنا نہایت ضروری ہے۔“ میں نے اصرار کیا ”اس کے خاتمے کے ساتھ اس کی لاش کو کسی ایسی جگہ ٹھکانے لگانا ہو گا جہاں وہ کم از کم ایک دو روز تک کسی کی نظروں میں نہ آ سکے۔“

”اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے۔ یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ یہ کہتے ہوئے ویرا کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ ”سب کچھ اسی طرح ہو گا جیسا تم چاہتے ہو۔“

میں اس بارے میں اس سے کوئی سوال نہیں کر سکا کیونکہ اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ریسیور اٹھاتے ہی ویرا نے مجھے آنکھ ماری اور پھر نرم اطالوی زبان میں بولنے لگی۔

میری توقع کے مطابق راما کا نے اپنی بیوی سے پیچھا چھڑانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

ویرا اور راما کا کی گفتگو ہوتی رہی اور مجھے بیم گن یاد آنے لگی۔ ہمارا وہ ہتھیار کوئی شور یا آواز پیدا کیے بغیر پلک جھپکتے میں دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے لاثانی تھا۔ ویرا کے پاس گیتا کا ریوالور ضرور موجود تھا مگر وہ بے آواز نہیں تھا۔ اس کے فائر کی گونج ویرا کو مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔

اطالوی زبان میرے لیے اجنبی تھی لیکن ویرا کے لب و لہجے کو میں خوب سمجھتا تھا۔ وہ اپنے دوست نما دشمن کو بہت کامیابی سے شیشے میں اتار رہی تھی۔

ان دونوں کی باتیں کافی دیر تک جاری رہیں۔ فون بند کر کے ویرا میری طرف متوجہ ہوئی تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”تم نے اسے راستے سے ہٹانے کا بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔“ ویرا بولی ”وہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ تیزی سے کام لے رہا ہے۔ تمہارے اغوا کے لیے مافیا کے دو کارندے اس وقت ہوٹل میں منڈلا رہے ہیں۔ راما کا انہیں تمہاری شناخت کرائے گا اور وہ اپنا کام شروع کر دیں گے۔“

”اوہ!“ میں تحیر زدہ انداز میں اپنے ہونٹ سمیٹ کر رہ گیا۔ وہ خبر سنتے ہی میرے بدن میں سنسنی کی ایک

لہری دوڑ گئی تھی "کیا یہ اسی نے بتایا ہے؟"

"ہاں، فون کرتے ہی اس نے دو باتیں جاننی چاہی تھیں، اول یہ کہ میں نے اس کے بارے میں تمہیں کیا بتایا ہے اور دوم یہ کہ مجھے طلاق دینے کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔"

"تمہارا جواب اس کے لیے حوصلہ افزا ہی رہا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"غنیمت ہے کہ میرا جواب زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے شوہر کے لیے وہ میرا ایک پرانا دوست ہے اور یہ کہ طلاق کے معاملے میں اسے چند روز انتظار کرنا ہوگا۔ میں موقع محل دیکھ کر ہی کسی بہانے سے اپنے شوہر سے علیحدگی کی بات کروں گی۔ انتظار کے ذکر پر اس نے مشتعل ہو کر خود ہی اپنا راز اگل دیا۔ اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔"

"مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔" میں نے بے چینی سے کہا "اگر اس ہوٹل میں خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو ہم اسی وقت کہیں اور منتقل ہو سکتے ہیں......"

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے بات سنبھالنے کی پوری کوشش کی ہے۔" وہ جلدی سے بولی "وہ بھڑک کر کہہ بیٹھا کہ اب وہ ایک دن بھی انتظار نہیں کرے گا۔ اس نے ڈان روزینی کی اجازت سے مافیا کے دو آدمی ہوٹل میں طلب کر لیے ہیں جو کسی بھی وقت تمہیں اٹھا لے جائیں گے اور تم نہ مانے تو تشدد کے ذریعے تم سے طلاق کے کاغذات پر دستخط لے لیے جائیں گے۔ میں نے یہ سنتے ہی اپنا پلان بدل دیا اور نرمی سے اسے سمجھایا کہ اس وقت وہ سسلی میں نہیں، لندن میں ہے۔ جب میں اس کے ساتھ ہوں تو اس کو جوش یا عجلت میں کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنے شوہر سے خوش نہیں ہوں۔"

"اس وقت تمہارا یہی جواب اسے ٹھنڈا کر سکتا تھا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو وہ مافیا والوں کو واپس بھیج دے گا۔ شام کو وہ ہم دونوں کو اپنی گاڑی میں لندن کے مضافات کی سیر کرانے لے جائے گا۔"

"پہلے وہ میرے اغوا پر تلا ہوا تھا اور اب سیر کرانے لے جائے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

ویرا کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی "میں نے اسے پیشکش کی ہے کہ اسے تمہارے ساتھ زبردستی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم گھومنے پھرنے کے شوقین ہو۔ میں تفریح کے بہانے کسی بھی وقت تمہیں اس کے ساتھ باہر لے جا سکتی ہوں۔ اس نے خود ہی آج شام کا وقت تجویز کیا جو میں نے مان لیا۔ اس ترکیب سے تمہاری یہ خواہش پوری ہو گئی کہ اس کے انجام میں ہم دونوں شانہ بشانہ رہیں۔"

"یہ نہ بھولو کہ بات ڈان روزینی تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے آدمی اس کا پیچھا کریں گے۔ ایسا ہوا تو اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ہم بری طرح پھنس سکتے ہیں۔"

"نہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔" ویرا نے پر اعتماد لہجے میں کہا "شام کو اس کا کوئی آدمی اس کی گاڑی کا پیچھا نہیں کرے گا۔ اسے خوشی ہوئی کہ اب وہ اپنے باپ کے آدمیوں کی مدد لیے بغیر خود ہی اپنا یہ معاملہ نمٹا لے گا۔ ڈان روزینی کو اس نے اپنے عناد کا کوئی پس منظر نہیں بتایا تھا۔ اس سے صرف اتنی اجازت لی تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر اس کے ایک دو آدمیوں سے کوئی کام لے سکے۔"

اس کی دی ہوئی دلیل اس کے لہجے کے اعتماد سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں کہا "تم کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"کسی کسی وقت تم سے سچ چھپانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر کسی بحث کے بغیر بولی "وہ کچھ تکلیف دہ باتیں ہیں۔ ان کا دہرایا نہ جانا ہی اس وقت بہتر ہوگا۔"

"یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو......؟ اب تک تم کھل کر ہر بات مجھے بتاتی رہی ہو۔ اب میرے یا تمہارے لیے کوئی بات تکلیف دہ نہیں ہونی چاہیے۔ میرے لیے سب سے اذیت ناک بات یہ ہے کہ اسی ہوٹل کی چھت کے نیچے

ایک ایسا درندہ موجود ہے جو تمہاری مرضی کے خلاف خود کو تمہارے سر پر مسلط کرنے پر تلا ہوا ہے اور میں اپنی مصلحتوں کی وجہ سے اسے برداشت کرنے پر مجبور ہوں۔

''تمہیں وہ باتیں سن کر دکھ ہوگا۔ میں خود بھی تصور نہیں کرسکتی تھی کہ کبھی مخض اوپری دل سے ہی مجھے تمہارے بارے میں ایسی باتیں کرنی پڑیں گی مگر اس وقت میں حالات کے شکنجے میں بے بس تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ میری اور اس کی گفتگو اطالوی زبان میں ہو رہی تھی......''

''اگر ان باتوں کا تعلق میری ذات سے ہے تو ان وضاحتوں کو بھول کر وہ باتیں بتا ڈالو۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا...... ''میں اندھیرے میں رہنا پسند نہیں کروں گا۔''

وہ زبان سے کچھ کہے بغیر چند ثانیوں تک شکایت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی ''وہ آج شام تمہارے اغوا کے بجائے تمہارے قتل کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے......''

میں بے اختیار ہنس پڑا ''اور تم یہ بات بتاتے ہوئے اس طرح جھجک رہی تھیں جیسے تم نے اس کے ساتھ مل کر واقعی مجھے مار ڈالنے کا ارادہ کرلیا ہو۔''

''اسے ٹٹولنے کے لیے مجھے اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑ رہی تھی۔ وہ خوش تھا کہ اب وہ اپنے رقیب کو اپنے باپ کے آدمیوں کی مدد کے بغیر خود مارے گا۔ اس کی وحشیانہ فطرت اور اس خوشی کی بنا پر مجھے پورا یقین ہے کہ شام کو ہم تینوں کا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔''

''ہاں۔ اب یہ بات قابل فہم معلوم ہوتی ہے۔ تم اس کے ارادے کا ذکر نہ کرتیں تو میری بے خبری کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوسکتا تھا۔''

''میں اسے کسی قیمت پر ایسا موقع نہ دیتی۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''اب اسے تم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے میرے پہلو میں کوئی زہریلی سوئی گھونپ کر پل بھر میں میرا کام تمام کردے تو تم کیا کرسکو گی؟''

''یہ خطرہ تو اب بھی موجود ہے۔'' اس نے جھرجھری لے کر کہا۔ وہ واقعی کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''نہیں، اب یہ خطرہ بہت کم ہوگیا۔ اس کے مکروہ عزائم سے باخبر ہونے کے بعد اب میں شروع سے ہی چوکنا رہوں گا، اس کے ہاتھوں پر نظر رکھوں گا، اس سے دور رہوں گا۔ میری کھوپڑی میں صرف اغوا کی بات چلی رہتی تو ان میں سے کوئی احتیاط ممکن نہیں تھی۔''

میں محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں ہماری لندن سے روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا، صورت حال کشیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ پچھلی رات ناگہانی طور پر راما کا کسی آسیب کی طرح سامنے آگیا۔ غنیمت یہ تھا کہ ویرا کی دانش مندانہ حکمت عملی کی وجہ سے مافیا کے ان دونوں گرگوں سے جان چھوٹ گئی تھی جو میرے اغوا کی نیت سے ہوٹل میں پہنچے ہوئے تھے۔ اب ہمارے سامنے صرف ایک ہی حریف رہ گیا تھا جو شاید شام تک کا مہمان تھا۔

ویرا نے راما کا کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے طور پر مجھ سے اس کا ذکر کرچکی ہے اور پھر شام کو ہمیں اس کے ساتھ ایک خوں ریز تفریح کے لیے بھی نکلنا تھا۔ میں نے ویرا کو مشورہ دیا کہ اسے مزید اعتماد میں لینے کے لیے وہ اسے کمرے میں مدعو کرلے۔ اس طرح میرا اور اس کا براہ راست تعارف ہو جاتا اور میں قریب سے اس کا جائزہ بھی لے لیتا مگر ویرا نے میری وہ تجویز سختی سے مسترد کردی۔

راما کا اس سے طلاق کے بارے میں بہت تجسس کے ساتھ باز پرس کرچکا تھا لیکن ویرا کے پوچھنے پر بھی اس نے اپنی بیوی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں بتایا تھا۔ ہم دونوں کو یہ اندازہ ہوچکا تھا کہ راما کا نے ویرا کے معاملے کو اپنی بیوی سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا اور شاید شام کی سیر کے لیے بھی اس نے کوئی بہانہ سوچا ہوا تھا۔

ہوٹل میں جاری اس کھیل میں ساری سرگرمیاں مکمل راز داری کے ساتھ جاری تھیں۔ بظاہر ہم تینوں فریقوں کے سوا کسی چوتھے کو اس قصے کی ہوا نہیں لگی تھی۔ ان حالات میں راما کا کا ہمارے کمرے میں آنا جانا مناسب نہیں تھا تاکہ اس کی یکایک گمشدگی کے بعد کسی کی توجہ ہماری طرف مبذول نہ ہوسکے۔

راما کا شام کے لیے اپنی بیوی سے جو بہانہ بھی کرتا، اس کی واپسی نہ ہونے پر اس کا جواز ختم ہو جاتا اور اس کی بیوی اپنے گم شدہ شوہر کی تلاش کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کردیتی۔

رات گئے سے صبح سویرے تک کے وہ چند گھنٹے ہم دونوں کے لیے صبر آزما اور اعصاب شکن ثابت ہوئے۔ اس قلیل سی مدت میں کسی اتفاق کے سوا ایسی کوئی صورت نہیں تھی کہ کسی کے ذہن میں راما کا کے قتل کا اندیشہ سر اٹھاتا اور ہم وہ راز فاش ہونے سے پہلے لندن سے پرواز کر جاتے۔

ویرا کو شام کے لیے کچھ تیاری کرنی تھی۔ میں اسے مصروف چھوڑ کر فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اول خان نے لندن سے نیویارک تک پرواز کے لیے یونائیٹڈ اور رومن اطلانتک کا قضیہ کھڑا کر کے مجھے الجھن میں ڈالا ہوا تھا۔ ہوٹل چھوڑنے سے پہلے یہ قصہ صاف ہونا بھی ضروری تھا۔

امارات ائرلائن کے دفتر فون کر کے میں نے بکنگ کے شعبے سے بات کی اور اپنا کمپیوٹر نمبر دے کر ائرلائن کے بارے میں پوچھا تو اول خان کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ میرے سوال سے متعلقہ شخص کو گمان ہوا کہ میں شاید ائرلائن کی تبدیلی کا خواہاں ہوں تو اس نے اپنے طور پر وضاحت کی کہ امارات کے مسافر اس سیکٹر پر رومن اطلانتک کے ذریعے ہی سفر کرتے ہیں۔ ٹکٹ میں تبدیلی کے بغیر کوئی رد و بدل ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون بند کردیا۔

حفاظت اور احتیاط کی خاطر شام تک ہم دونوں اپنے کمرے میں ہی محصور رہے۔ ویرا نے روم سروس کے ذریعے ہوٹل کے ریستوران سے دوپہر کا کھانا کمرے میں ہی منگوالیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں اخبار سنبھال کر بستر پر دراز ہوگیا۔ ویرا کمرے کا دروازہ بولٹ کر کے گیتا کا ریوالور لے بیٹھی۔

چار بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میرے اشارے پر ویرا نے ہی ریسیور اٹھایا۔ ویرا کے اطالوی بولنے کی وجہ سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ کال راما کا کی تھی۔

''ٹھیک پانچ بجے وہ ایک کمرشل پارکنگ لاٹ کے دروازے پر ہمارا انتظار کرے گا۔'' فون بند کر کے ویرا نے مجھے آگاہ کیا ''ہمیں صحیح وقت پر وہاں پہنچنا ہوگا۔''

''ضرور پہنچیں گے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا ''ہمارا شکار خود ہی ہماری تمام سہولتوں کا خاص خیال رکھ رہا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ ہوٹل سے ہم الگ الگ نکلیں گے۔''

''تمہاری سہولت سے زیادہ اسے اپنی چمڑی بچانے کا خوف دامن گیر ہوگا۔ وہ اپنی دانست میں تمہیں مارنے جا رہا ہے اس لیے تم سے دور دور رہے۔''

''مجھے مارنے کے لیے اس نے کیا طریقہ سوچا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے لیے یہ موضوع ناگوار تھا۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ راستے میں وہ خود ہی بتاتا چلا جائے گا۔'' ویرا نے منہ بنا کر کہا ''بولتا ہے تو بس بولتا ہی چلا جاتا ہے۔''

''تم نے خود ہی بتایا تھا کہ اطالوی عورتوں کے معاملے میں بہت ندیدہ ہے، خوشامدی اور باتونی ہوتے ہیں پھر وہ تمہارے سامنے کیسے خاموش رہ سکتا ہے؟''

''وہ ایک عذاب کی طرح میرے ذہن پر سوار رہا ہے۔ اس کے حوالے سے تمہاری یہ چھیڑ چھاڑ مجھے زہر لگ رہی ہے۔ وہ ہمارا دشمن ہے، اسے دشمن ہی رہنے دو۔''

ساڑھے چار بجے ہم دونوں نے پوری تیاری کے ساتھ کمرا چھوڑ دیا۔ ویرا کے پاس پارکنگ لاٹ کا نمبر موجود تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ عمارت ہوٹل سے چند منٹ کی مسافت پر تھی۔

وقت گزاری کے لیے قریبی بازار میں آکسفورڈ اسٹریٹ کی عقبی دکانوں کی کھڑکیوں میں جھانکتے ہوئے ہم خراماں خراماں ایک طویل چکر کاٹ کر مطلوبہ پارکنگ لاٹ تک پہنچے تو پانچ بجنے میں کئی منٹ باقی تھے لیکن راما کا ہم سے پہلے ایک چمکتی ہوئی سرخ بی ایم ڈبلیو فٹ پاتھ کے کنارے لیے کھڑا تھا۔

اس نے دور ہی سے ہمیں دیکھ کر اپنی کار کی کھڑکی میں سے ہاتھ لہرایا اور نیچے اتر کر کھڑا ہوگیا۔

”یہ سیر کے لیے ہم سے زیادہ بے چین ہے۔“ ویرا نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”اور رقابت کی یہ جنگ جیتنے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ آیا ہے۔ گہرے نیلے سوٹ میں خاصا شاندار لگ رہا ہے۔ گاڑی بھی تمہارے شایان شان لایا ہے۔“

ویرا زبان سے کچھ کہے بغیر مجھے گھور کر رہ گئی۔

راماکا نے اپنی کار کے قریب بہت تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ اندرونی مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ ویرا سے گرم جوشی سے ہاتھ ملانے کے بعد اس نے مسکرا کر مجھے ہیلو کہا اور مصافحہ کرتے ہوئے اتنی طاقت کا مظاہرہ کیا کہ میں تیار ہونے کے باوجود اپنے قدموں پر بل کر رہ گیا۔

میں خود کو اس کے لیے آسان شکار ثابت کرنے کے موڈ میں تھا اس لیے میں نے جواب میں طاقت کا اظہار کرنے کے بجائے نرمی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

میں خاموشی سے عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ ویرا نے پسنجر سیٹ سنبھال لی۔ ویرا کا دروازہ بند کرنے کے بعد راماکا... پھرتی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا اور فوراً ہی انجن چلا دیا۔

کار کے طاقت ور انجن کی دبی دبی اور مربوط غرابٹ اس وقت میرے کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی کیونکہ آج یہ کار میرے دشمن کا مدفن بننا تھا۔

ایک شوخ ہچکولے کے ساتھ کار کے حرکت میں آتے ہی راماکا کی زبان بھی چل پڑی۔

کار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی کیونکہ سڑکوں پر ٹریفک بہت زیادہ تھا مگر پھر بھی شہر کا بارونق اور پرہجوم حصہ تیزی کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس وقت میری توجہ باہر سے زیادہ ان دونوں پر مرکوز تھی جو میرے آگے والی نشستوں پر موجود تھے۔

پھر ویرا اچانک ہی گردن گھما کر اردو میں مجھ سے مخاطب ہوگئی۔ ”یہ اپنی بیوی سے کل تک واپسی کا عذر کر کے آیا ہے۔ ہر کام آسان ہوتا چلا جا رہا ہے۔“

”مجھے بھول کر اسی کو بہلائے رکھو۔ وہ سلگ گیا تو کہیں حادثہ کر بیٹھے گا۔“

”اس نے خود ہی کہا ہے کہ میں تمہیں نظر انداز نہ کروں ورنہ تم راماکا کی طرف سے بدگمان ہو جاؤ گے۔“ اس نے مجھے آنکھ مار کر کہا۔

”جب دو حریف ایک دوسرے کو ذرا سی دیر کا مہمان سمجھنے لگتے ہیں تو ایسی ہی ستم ظریفیاں وجود میں آتی ہیں۔“ میں نے لہجے سے کوئی خوشی ظاہر کیے بغیر کہا ”یہ پوچھا کہ میرے بارے میں اس نے کیا سوچا ہے؟“

”لیک ڈسٹرکٹ کے حسین علاقے میں گولی مار کر تمہاری لاش کسی جھیل میں پھینکنے کا ارادہ کر کے آیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ میں بتاؤں گی کہ تم بہت خوش ہو رہے ہو۔“

”ایسے دلفریب علاقے میں موت پر کون خوش نہ ہوگا!“ میں نے دھیرے سے کہا ”ہمیں واپس بھی آنا ہے۔ موٹر وے پر آنے کے بعد کہیں اسے نیچے لے جانا، کہہ دینا میں وہ علاقہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ویرا دوبارہ راماکا کی طرف متوجہ ہوگئی جو بہت دھیمے سر میں سیٹی پر کوئی دھن الاپ رہا تھا۔

راماکا نے اپنا پروگرام بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا۔ ایک لمبی ڈرائیو کے بعد وہ لیک ڈسٹرکٹ کی رومان پرور فضاؤں میں کسی دیکھی بھالی جگہ پر مجھ سے چھٹکارا حاصل کرتا پھر ویرا کے ساتھ جائے واردات سے محفوظ فاصلے پر کسی ہوٹل میں رات بسر کرتا، اپنی کامیابی پر دل کھول کر جشن مناتا اور اگلے دن واپس لوٹ جاتا۔

[illegible] میرے ذہن میں ایک خیال نے بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ راماکا نے ویرا کو اپنی بیوی سے علیحدگی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ خود اسے بھی ویرا سے شادی کرنے کی شاید شدید آرزو نہیں تھی۔ اس کی خواہش بس اتنی تھی کہ وہ ویرا سے روم میں ہونے والی اپنی توہین کا انتقام لے سکے۔

وہ اندر سے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس آگ کے سرد ہونے کی ایک ہی صورت تھی کہ ویرا اس کے خلوت کدے میں اس کی آرزوؤں کی تکمیل پر آمادہ ہو جائے۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ویرا شادی کے بغیر اسے اپنے قریب بھی نہیں آنے دے گی۔ اس ضد کا

توڑ کرنے کے لیے اس نے شادی کا ڈراما رچانے کا ارادہ بھی کر لیا اور ویرا کو بھی اس پر مجبور کرنے لگا۔

یہاں وہ ویرا کی بھرپور اداکاری سے دھوکا کھا گیا۔ ویرا کی طرف سے میرے اغوا میں اعانت کی تجویز کو اس نے مکاری سے قتل کے ارادے میں بدل دیا۔ ایک بار وہ مجھے ٹھکانے لگا دیتا تو ویرا اس کے سامنے بے بس ہو جاتی۔ راماکا اس سے شادی کیے بغیر اپنا انتقام لے سکتا تھا اور ویرا اس ظلم کے خلاف کہیں زبان نہیں کھول سکتی تھی کیونکہ میرے قتل میں وہ خود بھی راماکا کی شریک کار ہوتی۔

اس نے اپنی ازدواجی زندگی میں کوئی بگاڑ پیدا کیے بغیر انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے بہت چالاکی سے اپنا آخری منصوبہ بنایا تھا۔ وہ بدنصیب اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا بچھایا ہوا جال آخرکار اسی کی گردن کا طوق بننے والا تھا۔

میں وہی سب سوچتا اور اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس وقت تک ویرا کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا تھا مگر میں یہ سوچ سوچ کر کھول رہا تھا کہ ویرا سے باتیں کرتے ہوئے راماکا کے دل میں اس کے بارے میں کیسے کیسے مکروہ اور رذیل خیالات سر ابھار رہے ہوں گے۔

شہر کے مرکزی علاقے سے نکلنے کے بعد سڑکوں پر ٹریفک مزید بڑھ گیا۔ راستے میں جابجا کئی علاقائی بازار آئے اور گزر گئے۔ آخرکار کافی دیر بعد راماکا کی گاڑی موٹر وے پر آگئی۔

موٹر وے بہت وسیع اور یک طرفہ تھی۔ سیلن پہلے جنکشن کے بعد سڑک پر گاڑیوں کی کثیر تعداد رواں تھی۔ یہ سب غالباً وہ لوگ تھے جو کاروبار یا ملازمت کے لیے ایم دن کے مضافات سے روز لندن آتے جاتے تھے۔ گاڑیوں کے اس سیل رواں کا نظم بہرحال مثالی تھا اور تمام ڈرائیور ہارن بجائے یا بے صبری کا کوئی مظاہرہ کیے بغیر سکون سے اپنی اپنی قطار میں چلے جا رہے تھے۔

”اس کے پاس کوئی زہریلی سوئی وغیرہ نہیں ہے۔“ ویرا اچانک دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوگئی ”تمہارے مارنے کے لیے یہ بھی وہی ہتھیار لایا ہے جو ہم لیے پھر رہے ہیں۔“

”مجھ سے نجات حاصل کرنے کے بعد یہ تمہارے ساتھ رات کہاں بسر کرے گا؟“

”اپنے ذہن میں سے یہ زہر نچوڑ پھینکو۔“ ویرا ہموار آواز میں بولی ”میں تمہارے چہرے سے دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت کچھ سوچ رہے ہو۔ ایسی باتوں پر خود کو ہلکان مت کرو جو ہونے والی نہیں ہیں۔ یہ ہوٹل سے بہت کچھ سوچ کر نکلا ہے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ہونا کچھ اور ہی ہے۔“

”میں کچھ نہیں سوچ رہا۔“ میں نے جواب دیا ”بس اس کے وجود سے گھن آ رہی ہے۔“

”کہو تو میں اگلے ایگزٹ پر ہی گاڑی مڑوا لوں۔“

ویرا پریشان ہو رہی تھی۔

”ابھی چلنے دو۔ ذرا دھندلکا ہو جائے تو سوچوں گا۔ تم میری فکر مت کرو۔“

اچانک راماکا نے پرجوش لہجے میں کچھ کہا۔ ویرا نے اس کے مترجم کا فرض ادا کرتے ہوئے بتایا۔ ”الو کا پٹھا کہہ رہا ہے کہ لیک ڈسٹرکٹ دیکھ کر تمہارے شوہر کا دل خوش ہو جائے گا۔ سفر ذرا لمبا ہے لیکن دسویں ایگزٹ کے بعد بھیڑ کم ہوگی تو رفتار بڑھانے کا موقع مل جائے گا۔“

اس وقت تک ہم پانچویں ایگزٹ سے گزر چکے تھے۔ میں نے جواب دیا ”اگر اس نے واقعی یہی کہا ہے تو اس منحوس کا شکریہ ادا کر کے ہو رہ [illegible] ہونے کے بعد میں کسی دیہی پب میں رک کر ٹھنڈی بیئر کا ایک گلاس پینا چاہتا ہوں۔“

ویرا نے اس کے لیے میرے پیغام کا ترجمہ کیا اور اس کا جواب سن کر بولی ”وہ تمہاری خواہش سن کر خوش ہوا ہے۔ تمہیں مارنے سے پہلے بیئر پلانے کا آئیڈیا اسے پسند آیا ہے۔“

”یہ آنے والا وقت بتائے گا...... جب یہ موٹر وے سے اترے تو یہ گاڑی چلانے کا شوق ظاہر کر کے تم اس کی جگہ لے لینا۔“

گاڑی سبک رفتاری سے ہموار سڑک پر دوڑتی رہی۔ مطلع پہلے ہی ابر آلود تھا۔ رفتہ رفتہ ہر طرف کالی

بدلیاں سی پھیلنے لگیں اور پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ راماکا نے سوئچ آن کر دیا اور گاڑی کی ونڈ اسکرین پر وقفے وقفے سے وائپر چلنے لگے۔

نکاس کے بارہویں راستے سے راماکا نے موٹر وے چھوڑی تو دھندلکا اتنا گہرا ہو چلا تھا کہ ہیڈ لیمپس جلانے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

ویرا اور راماکا میں زور و شور سے باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر راماکا نے بی ایم ڈبلیو بائیں طرف کنارے سے لگا کر روکی اور اپنی سیٹ سے اتر گیا۔ ویرا نے سرک کر اس کی جگہ لے لی۔

دوسرے دروازے سے ویرا کی خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھتے ہوئے راماکا نے ایک دوستانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی جوابی منافقت کا مظاہرہ کیا۔ ویرا نے کار آگے بڑھا دی۔

وہ کوئی چھوٹی سی آبادی تھی مگر آثار بتا رہے تھے کہ اس سے آگے بڑے قصبات بھی ضرور آباد ہوں گے۔ میں نے گہری نظروں سے قرب و جوار کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

راماکا کو ٹھکانے لگانے کے لیے میرے پاس دو ہتھیار تھے۔ ایک گیتا کا بھرا ہوا ریوالور اور دوسرا ابھی ابھی ناتھ سے کراچی میں حاصل کیا ہوا، تلوار جیسی دہری اور مڑی ہوئی دھار والا چھوٹا چاقو مگر میں ان دونوں کے استعمال میں متذبذب تھا۔

اس وقت راماکا میری طرف سے تقریباً غافل تھا۔ ڈرائیونگ سے نجات ملنے کے بعد اس کے ذہن پر ویرا کی ہم نشینی کا خمار گہرا ہونے لگا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے وہ اس کے بدن سے منتشر ہو رہا تھا بھی مارتا جا رہا تھا جسے ویرا برداشت کر رہی تھی۔ اگر وہ اگلی نشست پر ہونے کی وجہ سے حفاظتی بیلٹ میں نہ پھنسا ہوا ہوتا تو شاید اس کی شوخیوں میں اس سے زیادہ اضافہ ہو سکتا تھا۔

ایسی حالت میں، میں بہت آسانی سے اسے گولی مار کر ختم کر سکتا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا نہیں تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بظاہر ویرانے میں سے گزرنے والی سڑک پر کتنے فاصلے پر کوئی پولیس افسر یا کوئی اور موجود تھا۔

فائر کے نتیجے میں راماکا کی موت یقینی تھی مگر تمام تر احتیاط کے باوجود فائر کی آواز سن لیے جانے کا خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ کوئی اس طرف دھیان دے کر دوڑ لگا دیتا تو ہم سخت مشکلات سے دوچار ہو جاتے۔ دوسری طرف چاقو کے استعمال میں نشانہ خطا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اگر میں پیچھے سے راماکا کے دل کے مقام پر وار کرتا تو اس کا وہ پہلو گاڑی کے دروازے کے قریب تھا۔ میرے لیے اس طرف آزادی سے وار کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر چاقو کا پھل براہ راست دل میں پیوست ہونے کے بجائے کسی پسلی پر پڑ کر اچٹ جاتا تو چلتی ہوئی گاڑی میں زخمی راماکا سے ہولناک دست بدست لڑائی شروع ہو جاتی یا شاید وہ خود بھی اپنا پستول یا ریوالور نکال لیتا۔

اور کچھ ہوتا یا نا ہوتا، ہم تینوں ہی گھیر لیے جاتے اور ہمارا امریکا جانے کا خواب بکھر کر رہ جاتا۔

ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر جو کام بہت آسان نظر آ رہا تھا، میدان عمل میں اترنے کے بعد یک لخت مشکل ہو چکا تھا۔

میں ویرا کی طرح مارشل آرٹس میں اتنا ماہر نہیں تھا کہ کراٹے کی کوئی ضرب لگا کر میش اگروال کی طرح اس کی گردن توڑ دیتا۔ وہ وار خطا ہونے کی صورت میں بھی نتیجہ خطرناک ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن راماکا کی گردن میں پھندا لگانے کی طرف بھٹک گیا۔ اگر میرے پاس کوئی مضبوط ڈوری یا تار کا ٹکڑا بھی ہوتی تو میں پیچھے سے اس کی گردن اس میں کس کر کسی شور یا خوں ریزی کے بغیر اس کا کام تمام کر سکتا تھا۔ اس طرح بی ایم ڈبلیو کی نشستوں پر چڑھے ہوئے سفید براق سیٹ کور بھی اس کے غلیظ خون کے داغ دھبوں سے محفوظ رہتے اور اس فتنے سے بھی نجات مل جاتی۔

وقت دھیمے دھیمے سرک رہا تھا۔ ہیجان کے ساتھ میرا دوران خون بھی تیز ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے اضطراری طور پر پچھلے سیٹ کور کے نچلے حصے کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اگر اس میں مضبوط ڈوری پڑی ہوئی ہوتی تو میں اندھیرے میں خاموشی سے اسے کاٹ سکتا تھا۔

ایک دشمن کے لیے تیسرے ہتھیار کی بے تابانہ تلاش اس وقت مایوسی میں بدل گئی جب میری انگلیوں نے ڈوریوں کے بجائے سیٹ کور میں الاسٹک محسوس کیا۔

کار اس وقت آبادی سے تقریباً باہر آچکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف تاحد نظر تاریکی کا راج تھا۔ اس مکمل اندھیرے میں کہیں بھی روشنی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ویرا نے میری طرف مڑے بغیر اردو میں پوچھا "اس کی چھیڑ چھاڑ اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔"

میں ویرا کے مخاطب ہونے سے پہلے ہی اپنی اندرونی جیب میں سے گیتا کا ریوالور نکال چکا تھا اور اس کی سرد آہنی نال میری گرفت میں تھی۔

میں نے کار کی تاریک کیبن میں اپنا ہاتھ بلند کرکے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے راماکا کی داہنی کنپٹی پر رسید کردیا۔ ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ بیلٹ پر پھنسا ہوا اس کا جسم قدرے اچھلا اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

"یہ کیا کیا؟" ویرا نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کیا اسے زندہ رکھ کر پالنے پوسنے کا ارادہ ہے؟"

"میں نے شدید ذہنی کشمکش کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بہت دیر اور ناامیدی کے بعد یہ ویرانہ نظر آیا ہے۔ اب گاڑی روک لو۔"

"یہاں؟ اس وقت خاصی تیز بوندا باندی ہورہی ہے۔" وہ چونک کر بولی۔

"یہاں میدان صاف ہے۔ اسے ڈکی میں ڈال کر یہیں اس کا قصہ ختم کردوں گا۔" میں نے جواب دیا "یہ کار اندر سے اتنی خوب صورت اور آرام دہ ہے کہ میں اسے سفید نشستوں پر ذبح کرنا نہیں چاہتا۔"

"کچھ پتا نہیں چلتا کہ تم کب کیا کرنا چاہتے ہو۔" ویرا نے بڑبڑاتے ہوئے کار روک کر اس کی ساری روشنیاں گل کردیں اور لیور کھینچ کر ڈکی کا قفل کھول دیا۔

میں نیچے اتر کر پھرتی سے پسنجر سیٹ پر جا پہنچا۔ میرے دروازہ کھولنے تک ویرا اس کے بدن کو بیلٹ کی قید سے آزاد کرکے میرا ہاتھ بٹانے کے لیے نیچے آچکی تھی۔

اس وقت آسمان پر گہری تاریکی کا راج تھا۔ کہیں کوئی بھولا بھٹکا تارہ تک نظر نہیں آرہا تھا اور آسمان سے بے آواز بوندیں دھرتی کے سینے میں اترتی چلی جارہی تھیں۔ اس کھلے علاقے میں موسم خاصا خنک تھا۔ اس خنکی میں بدن اور چہرے کے کھلے ہوئے حصوں پر پڑنے والی بوندیں بہت ناگوار محسوس ہورہی تھیں۔ میں اس فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہ رہا تھا۔

ویرا ارے ارے کرتی ہی رہ گئی۔ میں نے جھک کر راماکا کا جھولتا ہوا داہنا ہاتھ تھام کر اس کا ڈھیلا بدن اپنی پشت پر گرایا اور پھر اسے پیٹ کے بل اپنے کندھے پر لاد کر سیدھا ہوتا چلا گیا۔

راماکا دراز قامت ہونے کے ساتھ ہی ٹھوس اور کسرتی بدن کا مالک تھا لیکن میں حالات کے دباؤ میں اس سے کہیں زیادہ مشقت سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔ میں اسے لادے تیزی سے کار کے پیچھے گیا۔ ویرا ڈکی کھول چکی تھی۔ میں نے راماکا کو بے رحمی سے اندر ڈال دیا۔

کار اس کے بوجھ سے اپنے اسپرنگوں پر جھول کر رہ گئی۔ اس کے لیے ڈکی کی چوڑائی ناکافی تھی۔ ویرا اس کی ٹانگیں سمیٹ کر ڈکی میں ٹھونسنے لگی۔ میں نے جیب سے بدری ناتھ کا چاقو نکالا اور پوری قوت سے اس کا پھل راماکا کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست کردیا۔

راماکا کے ہونٹوں سے بے ہوشی کے عالم میں ایک تیز ہچکی آزاد ہوئی، اس کے بدن کو بہت تیز جھٹکا لگا اور میں نے چاقو نکالے بغیر ڈکی زور سے بند کردی۔

وہ ایک طویل اور ہولناک کارروائی تھی لیکن بس ڈیڑھ دو منٹ میں ہی مکمل ہوگئی اور ہم دونوں ہلکی بارش میں زیادہ بھیگے بغیر دوبارہ کار میں روانہ ہوگئے۔

"شاید عجلت میں تم نے اپنا چاقو اس کے سینے میں چھوڑ دیا ہے۔" چند لمحوں کے بوجھل سکوت کے بعد ویرا نے تیز تیز سانسوں کے درمیان کہا۔

"میں نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ چاقو نکالتا تو شاید زخم سے اتنا خون بہتا کہ ڈکی کے کسی نہ کسی سوراخ سے باہر

نکل لگتا۔ اب خون اندر ہی اندر بھرتا رہے گا۔"

"خون ٹپکے گا تو برسات اسے بہا دے گی۔" ویرا پر ...ن آواز میں بولی "گندے خون کی صفائی کے لیے آج ...درت نے یہ خاص انتظام کیا ہوا ہے۔"

"تم نے درست ہی کہا تھا کہ اطالوی جواری اور ...ورتوں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اس نے تمہارے حصول کے لیے ایک اندھا جوا کھیلا اور اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔ ...ہاری اس کامیابی کا پورا سہرا تمہارے سر جاتا ہے۔ تمہاری اداکاری کی وجہ سے اسے آخر تک اپنے خلاف کسی سازش کا شبہ نہیں ہوسکا اور وہ دو قسطوں میں جہنم واصل ہوگیا۔"

"موسم خراب ہے...... یہ بتاؤ کہ اب کہاں تک جانے کا پروگرام ہے؟"

"جہاں جگہ نظر آئے، وہیں سے گاڑی واپس گھما لو۔ ہمیں جلد از جلد ہوٹل پہنچ جانا چاہیے۔" میں نے دو سگریٹیں سلگا کر ایک ویرا کی طرف بڑھا دی۔

"اسے کہاں پھینکو گے؟" سگریٹ کا ایک گہرا کش لینے کے بعد اس نے پوچھا۔

"یہ اپنی اس بیش قیمت گاڑی میں ہی زیادہ محفوظ رہے گا۔" میں نے بے فکری سے کہا۔

"ہم اس کی لاش سمیت لندن واپس پہنچیں گے؟" میرے جواب نے ویرا کو حیران کردیا۔

"لاش کہیں بھی پھینکی جائے، صبح کا اجالا پھیلتے ہی اسے دریافت کرلیا جائے گا۔ ویسے بھی اندھیرے میں اس کی خون آلود لاش سے زیادہ چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں۔ ہمارے کپڑوں پر خون کے دھبے پڑ گئے تو مشکل ہوجائے گی۔"

اس دوران میں مخالف سمت سے یکے بعد دیگرے دو گاڑیاں نمودار ہوکر تیزی سے آگے نکلتی چلی گئی تھیں۔ پیچھے دور تک سڑک صاف تھی۔

"اور یہ گاڑی تم لندن میں کہیں بھی چھوڑ دو گے۔ اگر راستے میں کہیں چیکنگ کے لیے ہمیں روک لیا گیا تو کیا ہوگا؟" ویرا نے ایک مسطح کنارے سے گاڑی کو واپس گھماتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کراچی نہیں ہے جہاں آئے دن ناکا بندیاں کرکے گاڑیوں کے ساتھ مسافروں تک کی جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔ ٹریفک کے ضوابط کی خلاف ورزی کرو گی تو ضرور روکی جاؤ گی لیکن وہاں بھی بات لائسنس سے آگے نہیں بڑھے گی جو تمہارے پاس موجود ہے۔"

"شاید تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ یہ خطرہ مول لیا جاسکتا ہے۔"

"اور گاڑی بھی تم ہی چلاتی رہو گی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دلفریب سفید فام چہرہ دیکھ کر کوئی متعصب افسر بھی تمہیں نہیں روکے گا۔ رنگ دار لوگوں کو بعض افسر شک کی بنا پر بھی روک لیتے ہیں۔"

"خطرناک حالات میں تمہارا ذہن ایسے تخریبی راستے پر چل نکلتا ہے کہ تم ذرا ذرا سی باتوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے لگتے ہو۔ میں ہر مرتبہ تم سے کوئی نئی بات سیکھتی ہوں۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ اس وقت تم اتنی آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کررہی ہو۔ راماکا کا داؤ چل جاتا تو شاید وہ آج رات ہی عملی طور پر تمہیں مسز راماکا روزینی بنا ڈالتا۔"

"ہوں...... اس کے عزائم کچھ ایسے ہی تھے مگر مجھے ذرا بھی پریشانی نہیں تھی۔"

"یہ ڈان مرسیانو کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ مردوں کے معاملے میں تم اتنی بے خوف ہو۔"

"مجھے بس یہ فکر تھی کہ ہم لندن میں الجھے رہ گئے تو امریکا میں سلطان شاہ برے حال کو پہنچا دیا جائے گا ورنہ میں راماکا کو سسکا سسکا کر بھی مار سکتی تھی۔"

سلطان شاہ کا نام سنتے ہی میں دل ہی دل میں نادم ہوکر رہ گیا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے ایک بار بھی اس کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

باہر بارش کا زور بندھ گیا تھا۔ ونڈ اسکرین پر وائپر مسلسل چل رہے تھے۔ بند شیشیوں کے باوجود گیلی سڑک پر ٹائروں کی آواز کار میں سنائی دے رہی تھی۔ ایک کمال کی بات یہ تھی کہ میں نے پچھلے دنوں میں بارہا بارش اور پھوار کا سامنا کرنے کے باوجود ان مغربی بادلوں میں گرج یا بجلی کی کڑک کبھی نہیں سنی یا دیکھی تھی۔ عجیب بادل تھے جو

ہمیشہ چپکے چپکے اور دھیرے دھیرے بجتے رہتے تھے۔
کھڑکی کے شیشے سے باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں جگمگاتی ہوئی روشنیوں سے آبادی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے بھی میں سلطان شاہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرے دل میں اس کی قدر و منزلت کم ہوگئی تھی۔ اس کے لیے میرے احساسات وہی تھے جو اپنے کسی چھوٹے بھائی کے لیے ہوسکتے ہیں۔ بات صرف یہ تھی کہ راماکا روزینی کے خطرے نے اس قدر بھیانک اور طوفانی انداز میں سر اٹھایا تھا کہ اس کے سامنے ہر تشویش ماند پڑ گئی تھی۔
جو شخص صرف ایک رات میں میرے اغوا کے لیے دو پیشہ ور مقامی باشندوں کا بندوبست کرسکتا تھا، اسے ذہن سے کھرچ پھینکنا کسی بھی طرح آسان نہیں تھا۔
''سلطان شاہ کے ذکر پر تم خاموش کیوں ہوگئے؟'' نسبتاً گنجان آبادی کی طرف بڑھتے ہوئے ویرا نے چبھتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔
''تمہاری کہی ہوئی کچھ باتیں یاد آگئی تھیں۔ سانپ کا کاٹا بچ سکتا ہے مگر عورت کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ میری دعا ہے کہ خدا اسے صنف نازک کے وار سے محفوظ رکھے۔''
''تم پھر میری باتوں کو توڑ مروڑ رہے ہو۔ میں نے سلطان شاہ کے لیے کسی عورت کی محبت یا شفقت کا ذکر کیا تھا اور تم نے اسے منافقت میں بدل دیا تھا۔ یہ سراسر.....''
''تمہاری یہ صفائی لاحاصل ہے۔'' میں نے اس کی قطع کلامی کرکے جواب دیا۔ ''نسوانی محبت اور شفقت کا ایک تازہ ترین شاہکار اس وقت اس کار کی ڈکی میں بھی موجود ہے۔ وہ آخر تک تمہاری منافقت سے ہی فریب کھاتا رہا کہ آخر کار تم اس پر مہربان ہوگئی ہو۔''
اس برجستہ حوالے پر ویرا لاجواب ہوگئی اور جل کر بولی ''اپنی یہ اوٹ پٹانگ باتیں اپنے دماغ تک ہی محدود رکھو۔ میرا دماغ سنک گیا تو اپنی منافقت کا شاہکار تھنے میں تمہیں سونپ کر یہیں کسی گھر میں رات بھر کے لیے پناہ لے لوں گی۔''
میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ میرے معاملے میں وہ اسی قدر سنکی تھی کہ ایک بار پھیل جاتی تو پھر اسے منانے میں، میں خود ایک تماشا بن کے رہ جاتا۔
ویرا نے اس بار اپنا غصہ کار کے انجن پر اتارا اور اس کی رفتار یک لخت تیز کردی۔ میں سکون اور خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا اور آبادی بہت تیزی کے ساتھ پیچھے رہ گئی۔
بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ کار مسلسل دوڑ رہی تھی۔ راستے میں آنے والی اکا دکا بستیوں سے گزرنے کے سوا سفر ویرانے میں ہی جاری تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔
میرے خیال میں واپسی کے لیے ہم کافی دیر سے سفر کررہے تھے لیکن موٹر وے کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ غصے کے باعث ویرا نے شاید اہم روڈ سائن نظر انداز کرکے راستہ کھو دیا تھا۔
ڈیش بورڈ کی روشنی کے انعکاس میں، میں نے کن انکھیوں سے ویرا کا جائزہ لیا تو اس کے چہرے پر بھی تشویش کی پرچھائیاں نظر آئیں۔
میں نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور آہستگی سے پوچھا ''جان کی امان ہو تو کچھ پوچھ لوں؟''
اندھیرے میں ویرا کی کھسیائی ہوئی ہنسی کی آواز گونج اٹھی۔ ''کیوں مجھے زچ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ شاید تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ اتنی دیر سے چلتے رہنے کے باوجود ایم ون ابھی تک غائب ہے۔ شاید ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔''
''میں بھی اس وقت یہی عرض کرنا چاہ رہا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''جب راماکا کو مارنے کے لیے ویرانوں کی ضرورت تھی تو تم آبادی میں جا گھسی تھیں۔ اب لندن واپسی کی عجلت ہے تو تم ویرانوں میں تیز رفتاری کی مشق کرتی پھر رہی ہو۔''
''میں نے ایم ون کی نشاندہی کرنے والے کسی اشارے کو نظر انداز کردیا تھا تو تم کیا کررہے تھے؟ تم مجھے ٹوک نہیں سکتے تھے؟'' اس نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔
''خاموشی کا حکم ملنے کے بعد میں سامنے کے بجائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اب دیکھو کہ سڑکوں کے اس جال سے نکل کر ہم کب لندن پہنچتے ہیں۔''

''چبا چبا کر زہر اگلنے کے بجائے اپنی جون میں لوٹ آؤ۔'' گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے وہ غصیلی آواز میں بولی ''ان مضافاتی سڑکوں پر بہت زیادہ روڈ سائن نہیں ہوتے۔ اس مرتبہ کسی سائن بورڈ سے ہی ہمیں اپنے سفر کی سمت کا اندازہ ہوسکے گا۔''
''سلیس اردو میں اسے کسی زود پشیماں کا پشیماں ہونا کہتے ہیں۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔
''کہتے ہوں گے۔ تم رہنما اشاروں کا دھیان رکھو۔ تمہارے دیدے الو کی طرح تیز ہیں۔''
''راماکا سے تم نے میری مادہ ہونے کا اعتراف کیا تھا، خود کو کیا کہوگی؟''
''الو کی پٹھی!'' وہ ایک مرتبہ پھر بے بسی سے ہنس پڑی ''میں نے تم کو الو نہیں کہا تھا، تمہاری بینائی کی تعریف کی تھی۔''
''اور میں تمہاری دانائی کا اعتراف کررہا ہوں۔ ہوٹل والی لڑکی بتا ہی چکی ہے کہ مغرب میں الو دانائی کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔
''شاید اس علاقے کی ہوا تمہاری دانائی و بینائی کو خوب راس آرہی ہے، تمہیں اعتدال پر لانے کے لیے یہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔''
خاموشی کے مقابلے میں نوک جھوک کرتے ہوئے وقت تیزی سے گزرنے لگا اور آخر کار ہم ایک ایسی سڑک پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جو کوئی موٹر وے تو نہیں تھی لیکن اسے مضافاتی شاہراہ کا درجہ دیا جاسکتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ویرا نے اتنے موڑ کاٹے تھے کہ میں سمت کا احساس تک کھو بیٹھا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد ہمیں اے فائیو کا نشان نظر آیا۔ ویرا نے کار اسی راہ پر ڈال دی۔
ہم نے موٹر وے تیرہویں ایگزٹ پر چھوڑ دی تھی اور ایک ذرا سی غلطی سے اندر ہی اندر دور تک بھٹکنے کے بعد پندرہویں جنکشن پر دوبارہ وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور لندن واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔
اس وقت تک بارش کا سلسلہ بالکل موقوف ہوچکا تھا لیکن مطلع بدستور ابر آلود تھا۔
راماکا کی لاش کے ساتھ ایک موٹر وے پر سفر کا وہ تجربہ بہت خوف آور اور سنسنی خیز تھا۔ راستے میں کہیں کہیں پولیس کی گشتی گاڑیاں ٹریفک کی تیز رفتاری یا بے قاعدگی کی پڑتال کے لیے موجود تھیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی ہر بار میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی رہیں لیکن ہمیں کہیں کسی روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔
''شہر میں داخل ہوکر گاڑی کا رخ یوسٹن ریلوے اسٹیشن کی طرف موڑ لینا۔'' شہر کی حدود قریب آنے پر میں نے ویرا کو ہدایت کی اور وہ سر ہلا کر رہ گئی۔
یوسٹن لندن شہر میں برٹش ریل کا ایک مرکزی اسٹیشن ہے جو ٹیوب کے ذریعے پورے لندن سے منسلک ہے۔ شہر میں وکٹوریا اور کنگز کراس سمیت ایسے کئی اسٹیشن ہیں جہاں ٹیوب چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں کے لیے آسانی سے ٹرین پکڑی جاسکتی ہے۔
ایسے اسٹیشنوں میں یوسٹن کی مرکزیت کی وجہ سے وہاں ایک پارکنگ ایریا ہے جہاں لمبے سفر پر جانے والے بے فکری سے اپنی گاڑی چھوڑ سکتے ہیں۔
لندن کی حدود میں داخل ہوتے ہی کار پھر رینگنے لگی۔ ہمارے سفر کا وہ حصہ سخت ذہنی کشیدگی اور اعصابی تناؤ کے عالم میں گزرا۔ آخر کار پارکنگ ٹوکن خرید کر ہم مطلوبہ پارکنگ میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔
وہاں ڈرائیوروں کی رہنمائی اور دیکھ بھال کے لیے ایک باوردی سپاہی کو دیکھ کر میرے فرشتے کوچ کرگئے۔ طویل کار پارکنگ کے لیے وہ کار کی ڈکی دیکھنے کا مطالبہ کرسکتا تھا۔
ان دنوں دنیا بھر میں دہشت گردی کی یہ وبا پھیلی ہوئی تھی کہ بھیٹر بھاڑ کے مقام پر چھوڑی ہوئی کسی بھی بے نام و نشان گاڑی میں چھپایا ہوا ٹائم بم یا ریموٹ کنٹرولڈ بم مقررہ وقت پر ہولناک دھماکے سے پھٹتا اور ہر طرف بڑے پیمانے پر جانی و مالی تباہی پھیلا دیتا۔
غنیمت تھا کہ اس وقت تک وہ وبا انگریزوں کے وطن میں نہیں پھیلی تھی۔ آئرش ری پبلکن آرمی کے دہشت گرد دوسرے طریقوں سے انہیں نقصان پہنچاتے رہتے

تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہاں موجود سپاہی کچھ قنوطی اور بیزار بیزار سا نظر آرہا تھا۔ اس نے ہماری رینگتی ہوئی گاڑی کو ذرا بھی قابل توجہ نہیں سمجھا اور ویرا نے ایک خالی جگہ میں گاڑی پارک کردی جہاں روشنی کم تھی۔

انجن بند کرکے ویرا نے پھرتی کے ساتھ اسٹیئرنگ وغیرہ پر رومال پھیر کر اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور رومال کی مدد سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

دروازے مقفل کرتے ہی ہم دونوں تیزی سے وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ راستے میں ویرا نے بی ایم ڈبلیو کی چابی ایک ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

یوسٹن کے ٹیوب اسٹیشن سے وکٹوریا لائن کی ٹیوب نے مختصر سا زیر زمین سفر طے کرکے محض ایک اسٹیشن کے بعد ہمیں آکسفورڈ سرکس پہنچا دیا۔

بظاہر ہم دونوں نے وہ مشکل کام بہت خوش اسلوبی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ راما کا سے مکمل ترین نجات حاصل کرلینے کے بعد میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ اس وقت صرف ساڑھے آٹھ بجے تھے اور آکسفورڈ اسٹریٹ کی رونق میں کوئی نمایاں کمی نہیں آئی تھی۔

ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے مگر لندن کی روایت کے مطابق ایک دوسرے سے تقریباً چپکے ہوئے آکسفورڈ سرکس سے بونڈ اسٹریٹ کی طرف ہولیے۔

راستے میں ڈیپ پین پنزا کا ریستوران نظر آتے ہی ویرا اندر گھس گئی۔ اس طویل بھاگ دوڑ کے بعد اسے بھی کھانے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

راما کا کو ٹھکانے لگا۔۔۔ دینے کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے لندن میں کوئی کام ہی نہ رہا ہو۔ واش روم میں ہاتھ دھوتے ہوئے مجھے اس بات کا قلق تھا کہ مجھے بدری کا نادر چا تو اپنے حریف کی لاش کے ساتھ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔

بہت اطمینان سے پنزا ختم کرنے کے بعد ہم وہاں سے نکلے تو ویرا نے کسی بوتھ سے غزالہ کو فون کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب وہ پہلی فرصت میں اسے چھیڑنے کی کوشش کرے گی۔

''ذرا اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھ لو۔ پاکستان میں آدھی رات ہوچکی ہوگی۔''

''کوشش کرلینے میں کیا حرج ہے؟ وہ سب دیر سے سونے کے عادی ہیں۔ دو گھنٹیوں پر جواب نہ ملا تو میں فون بند کردوں گی۔'' وہ مصر ہوگئی۔

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ اس سڑک پر لوگوں کی سہولت کے لیے جابجا ٹیلی فون بوتھ موجود تھے۔ ویرا ایک خالی بوتھ کی طرف لپکی تو میری نگاہ قریبی اسٹال پر رکھے ہوئے ایک اخبار کی شہ سرخی پر اٹک گئی۔

''امریکی سی ون تھرٹی ہائی جیک کرلیا گیا۔'' اس چنگھاڑتی ہوئی سرخی کے آگے ایک سوالیہ نشان تھا۔ میں نے ریزگاری دے کر وہ اخبار خریدا اور تہ کرکے جیب میں اڑس لیا۔

کراچی سے امریکی کمانڈوز کی لاشوں کے ساتھ سلطان شاہ کو بھی اسی ساخت کے طیارے میں لے جایا گیا تھا۔ وہ بھاری ٹرانسپورٹ طیارے تھے جو صرف فوجی استعمال کے لیے مخصوص تھے۔ امریکا اور اس کے حلیف ملکوں میں یہ طیارے اپنی کارکردگی کی بناء پر کافی مقبول تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ خاص فوجی استعمال میں رہنے والا وہ طیارہ کیسے اغوا ہوسکتا ہے۔

اخبار خرید کر میں فون بوتھ کے پاس پہنچا تو ویرا نمبر ملا کر بات شروع کرچکی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے فون کا ریسیور میری طرف بڑھا دیا ''اول خان بات کرے گا۔'' یہ کہہ کر وہ برا سا منہ بناتی ہوئی الگ جا کھڑی ہوئی۔

''اچھا ہوا کہ ویرا نے اس وقت فون کرلیا۔ تم وہ حیرت ناک خبر تو سن ہی چکے ہوگے۔'' میری آواز سنتے ہی اول خان نے کسی تمہید کے بغیر پرجوش لہجے میں کہا۔

''کس خبر کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے قدرے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

''کراچی سے سلطان شاہ کو لے جانے والا سی ون تھرٹی جنوبی قبرص کے ایک فوجی ہوائی اڈے پر سخت محاصرے کی حالت میں رکا ہوا ہے۔ افواہیں ہیں کہ اسے

اغوا کرلیا گیا ہے مگر اس ہوائی اڈے کے امریکی حکام ان افواہوں کی تردید کر رہے ہیں۔''

وہ خبر سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا ''ابھی ابھی میں نے ایک اخبار میں یہی سوالیہ سرخی دیکھی ہے۔ وہ اخبار میری جیب میں ہے۔ ہوٹل جا کر دیکھوں گا کہ پوری خبر کیا ہے۔''

''شیڈول کے مطابق اس جہاز کو دو گھنٹے قیام کے بعد قبرص سے پرواز کر جانا تھا مگر کل رات سے وہ مسلسل وہیں رن وے پر کھڑا ہوا ہے۔ بیس کمانڈر پرواز کی آگے روانگی میں تاخیر کو فنی وجوہ کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔''

''یہ افواہ کیسے پھیلی کہ طیارہ اغوا کرلیا گیا ہے؟'' میرے لیے وہ خبر حیران کن تھی۔

''میرین کمانڈوز کی لاشوں کی وجہ سے امریکا میں اس طیارے کا بے چینی سے انتظار کیا جارہا ہے۔ اسے پچھلی رات ہی امریکا پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مرنے والوں کے لواحقین کی تشویش اور پریشانی کی وجہ سے کچھ نامہ نگاروں نے ترکی کے زیر انتظام شمالی قبرص کی سرحد پر پرواز کرکے طاقت ور دوربینوں سے یہ کھوج لگایا ہے کہ وہ سی ون تھرٹی بھاری محاصرے میں رن وے پر کھڑا ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ اس پر کوئی ہائی جیکر قابض ہے مگر امریکی ان خبروں کی تردید کر رہے ہیں۔''

''تمہیں یہ خبر کب اور کیسے ملی؟'' میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

''انٹر سروسز انٹیلی جنس سروس والوں کو اپنے ذرائع سے رات دس بجے یہ اطلاع ملی ہے۔ میں ان لوگوں کو سلطان شاہ کے اغوا کے بارے میں تمہاری کہانی سے آگاہ کرچکا ہوں۔ ان ہی کے ایک ونگ ۔۔ سربراہ نے مجھے فون پر یہ اطلاع دی ہے۔''

''اور تم نے اس سے کچھ نتائج بھی اخذ کیے ہوں گے۔'' میرا اضطراب بڑھتا ہی جارہا تھا۔

''یہ سیدھی سیدھی دو اور دو چار والی بات ہے۔'' خوشی سے اول خان کا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا ''اگر ہائی جیکنگ کی خبر میں ذرا سی بھی صداقت ہے تو یہ سلطان شاہ کا کارنامہ ہے۔''

کراچی کے ہوائی اڈے سے پرواز کرنے والے اس سی ون تھرٹی میں عملے کے پانچ قابل اعتماد افراد اور چھ مردہ کمانڈوز کے تابوتوں کے سوا بس سلطان شاہ ہی ایسا مشتبہ قیدی تھا جو اس طیارے اور اس کے عملے کے لیے کوئی خطرہ پیدا کرسکتا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ جہاز کا عملہ یقیناً بہت چالاک اور تجربے کار تھا جبھی سلطان شاہ کو خاموشی سے پاکستان سے نکال لے گیا تھا۔ جہاز پر کسی مردے کے ساتھ سلطان شاہ کو بے ہوش کرکے تابوت کا قیدی بنایا گیا تھا۔ وہ بالکل غیر مسلح رہا ہوگا پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ سلطان شاہ ان پانچوں کو یرغمال بنا کر جہاز پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کوئی غیبی معجزہ ہی اس کی ایسی ناقابل یقین بالادستی کا سبب بن سکتا تھا۔

''تم اس خبر یا افواہ کی تصدیق کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے پوچھا۔

''ناممکن!'' اس کا جواب مایوسانہ تھا ''اگر یہ افواہ سو فیصد درست اور حقیقت پر مبنی ہو تب بھی امریکی حکام اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔''

''پھر وہ فنی وجوہ کی آڑ میں کب تک پناہ لے سکیں گے۔ آزاد پریس ان کی زندگیاں اجیرن کردے گا۔ مرنے والوں کے منتظر لواحقین کو پورے ملک کی حمایت اور ہمدردی حاصل ہوگی۔''

''اگر وہ ہائی جیکنگ کا اعتراف کرلیں تو پھر طیارے پر بارہویں فرد کی موجودگی کا کیا جواز دیں گے؟ اس اعتراف میں ان کی شدید بدنامی مضمر ہے۔ ان کی سیاسی ساکھ تباہ ہوجائے گی کہ وہ ڈپلومیٹک کارگو کی آڑ میں دوست ملکوں کے شہریوں کو اغوا بلکہ اسمگل کرتے ہیں۔''

''پتا نہیں سلطان شاہ نے کیا سوچ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔'' وہ امکانات واضح ہوتے ہی میری خوشی تشویش میں بدل گئی ''اگر ان کی سوچ یہی ہے تو وہ سلطان شاہ کا مطالبہ ہرگز نہیں مانیں گے۔''

''ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان شاہ نے اپنا کیا مطالبہ پیش کیا ہے۔''

''اسے معلوم ہے کہ وہ کن لوگوں کا قیدی ہے۔ ان

سے وہ اپنی رہائی کے سوا اور کیا چاہ سکتا ہے۔“

”وہ قبرص میں اپنی رہائی چاہتا ہے تو طیارے سے باہر موت اس کی گھات لگائے بیٹھی ہوگی۔ طیارے کو وہ کسی قیمت پر زمین چھوڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“ اول خان بولا۔

”یہ ہڈی سلطان شاہ کے گلے میں پھنسی ہوئی نظر آرہی ہے۔ وہ ایک ایک کرکے ان پانچوں کو مار دے گا تو پھر اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ یہ معاملہ اس قدر سنگین اور رازداری کا متقاضی ہے کہ وہ پانچ جانوں کا اتلاف خاموشی سے سہہ لیں گے اور پھر سلطان شاہ کا حشر خراب کردیں گے۔“ وہ باتیں دہراتے ہوئے میں خود کو شدید ذہنی اذیت میں محسوس کررہا تھا۔

”اتنا بڑا خطرہ مول لینے کے بجائے وہ خاموشی سے امریکا چلا گیا ہوتا تو تم وہاں پہنچ کر اس کی بازیابی کے لیے بہت کچھ کرسکتے تھے۔ اس وقت وہ ایک بند گلی میں محصور ہے جس کے دہانے پر اس کے خون کے پیاسے قابض ہیں۔“ اول خان کی آواز متاسفانہ ہوگئی۔

راما کا روزینی کے خلاف مثالی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ خبر میرے لیے اندوہناک تھی۔ ملال اور دل گرفتگی کے عالم میں میں نے کہا ”تم سے کچھ پس پردہ باتیں معلوم ہوگئیں۔ باقی تفصیل میں اخبار میں تلاش کروں گا۔ اس وقت سلطان شاہ تن تنہا رہ گیا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ قید کی اذیتوں نے شاید اسے اس قابل بھی نہ رہنے دیا ہو کہ وہ بروقت صحیح فیصلے کرسکے۔“

”اب تم اس سے پہلے امریکا پہنچ جاؤ گے۔“ اس کی آواز خالی خالی سی تھی۔

”اس وقت میرے لیے امریکا اور پاکستان، دونوں برابر ہیں کیونکہ وہ درمیان میں بری طرح گھرا ہوا ہے۔ ذہن میں کوئی بات آئی تو اب صبح ایئر پورٹ سے فون کروں گا۔“

”ویرا اس وقت غزالہ سے بات کرنی چاہ رہی تھی مگر میں نے اسے نیند سے جگانا مناسب نہ سمجھا تو وہ کچھ ناراض ہوگئی اور میرے سوال کا جواب دیے بغیر تمہیں ریسیور دے دیا۔ ذرا اسے سمجھا دینا۔“ گفتگو ختم کرنے سے پہلے اول خان نے آخری بات بھی کہہ ڈالی۔

میں نے پلٹ کر فٹ پاتھ پر نظر ڈالی تو ویرا غائب تھی۔ میں نے معلومات کی فراہمی پر اول خان کا شکریہ ادا کیا اور فون رکھ.... کر متجسسانہ انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔

ویرا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ شاید وہ میری طویل ہوتی ہوئی گفتگو سے بیزار ہوکر اکیلی ہی ہوٹل کی طرف چل پڑی تھی۔ میں بھی سر جھکا کر اسی طرف ہولیا۔

اول خان سے ہونے والی گفتگو اتنی بھرپور تھی کہ اب میرے لیے جیب میں پڑے ہوئے اخبار کی اہمیت صفر ہوکر رہ گئی تھی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور سلطان شاہ کے متوقع انجام کے تصور سے میرے بدن میں پھریریاں سی دوڑ رہی تھیں۔

سلطان شاہ اپنی عارضی بالادستی کے گھمنڈ میں بری طرح امریکیوں کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ جیسے معجزے نے اسے وہ حیران کن بالادستی دلائی تھی، ویسا بھی کوئی دوسرا معجزہ اسے قبرص کی سرزمین سے زندہ نکال سکتا تھا۔

میرے ذہن میں ایک ایک کرکے نام آتے رہے۔ نک موڈلے شروع سے اس معاملے سے الگ رہا تھا اور وہ کوئی موثر کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس وقت لے دے کر صرف آئزک بیل ہی کام کا آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے کھل کر سلطان شاہ کے اغوا پر بات کی تھی اور تقریباً بروقت مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اسے ایک تابوت میں بند کرکے امریکا پہنچایا جارہا ہے۔

اس وقت میں نے مصلحت کی خاطر اس کے اغوا کرائے ہوئے آدمی سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا تھا مگر اب وقت کے تقاضے بدل چکے تھے۔ سلطان شاہ نے کسی رو میں آکر حالات کو اتنا بگاڑ لیا تھا کہ میری کوئی بھی صحیح یا غلط کوشش ان حالات کو مزید نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

اپنے پسندیدہ ٹیلی فون بوتھ کے قریب میں آئزک بیل سے بات کرنے کے بارے میں اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ بوتھ خالی تھا۔ میں اس پر قابض ہوگیا۔

امریکا میں وہ شام کا وقت تھا۔ پہلی ہی گھنٹی پر فون

اٹھالیا گیا۔ ”مجھے توقع تھی کہ کسی بھی وقت تمہارا فون آئے گا۔“ میرے کانوں میں آئزک بیل کی سرد آواز گونجی۔ اس نے میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لیا تھا۔

”میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی توقعات پر ہمیشہ پورا اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا تم یہ بتانا پسند کروگے کہ اس وقت تمہیں یہ توقع کیوں تھی؟“ میں نے بھی اپنا لہجہ سرد اور سپاٹ رکھا۔

”اس وقت تمہارے سامنے صرف ایک ہی بات ہے۔ تمہارا آدمی ایسی بھیانک آگ سے کھیل رہا ہے جو اس کا وجود تک چاٹ جائے گی۔“ آئزک بیل نے کسی اشتعال کے بغیر جواب دیا۔

”یہ بات وہ بھی جانتا ہے مگر یہ یاد رکھو کہ وہ اپنے ساتھ تم لوگوں کی ساکھ سمیت بہت کچھ لے جائے گا اور تمہیں پچھتاووں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“ وہ اعصابی لڑائی تھی۔ میں نے مضبوط لہجے میں ایک کھوکھلی دھمکی اس تک پہنچادی۔

”پہلے تم اسے اپنا آدمی ماننے سے انکار کررہے تھے اور اب اس کے حوالے سے اتنا بڑا دعویٰ کررہے ہو۔ کہیں یہ تبدیلی تمہاری کسی کمزوری کا نتیجہ تو نہیں ہے۔“

”کمزوری نہیں، یہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی ہے۔ شروع سے اب تک تمہارے آدمی ہر لمحے میری نظروں میں رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وقت ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ آگے تھے اور ہم ان کا مسلسل پیچھا کررہے تھے۔ چاہو تو میں تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس بار تم نے نک موڈلے کو بری طرح نظر انداز کیا ہے۔ سارا کام اپنے ان دو آدمیوں سے لیا ہے جو سی ون تھرٹی کے پانچ نفری عملے میں شامل ہوکر کراچی پہنچے تھے۔ تمہاری یہ سازش اب تمہارے گلے پڑ گئی ہے۔“

”وہ بہت تیزی کے ساتھ اپنے بچاؤ کی راہیں مسدود کرتا جارہا ہے۔ اس نے میرے دونوں آدمیوں کو ہلاک کرکے ان کی لاشیں جہاز سے رن وے پر پھینک دی ہیں۔ اب امریکی ایئر فورس کے تین آدمی اس کے قبضے میں ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے اعصاب ٹوٹنے اور بکھرنے لگیں گے۔ مایوسی کے عالم میں وہ ان تینوں کو ختم کرکے اپنی کنپٹی میں گولی مارلے گا اور تمہارا کھیل ختم ہوجائے گا۔ اس انجام کے لیے مزید تین آدمیوں کا نقصان زیادہ بڑی قیمت نہیں ہے......“

”ان پانچوں کا خون کس نے کیا؟ جہاز پر بارہویں آدمی کی موجودگی کا اعتراف تم سب کو رسوا کردے گا۔ یہ کوئی آسان یا سرسری فیصلہ نہیں ہے۔“

اس کی ہلکی سی استہزائیہ ہنسی کی آواز ابھری پھر وہ بولا ”ہم اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ دنیا کے چند بہترین دماغوں نے سارا نقشہ تیار کرلیا ہے۔ اخبار والوں کی حرکتوں کی وجہ سے یہ واقعہ دبایا نہیں جاسکے گا۔ اس بارے میں واشنگٹن سے کسی بھی وقت ایسا چونکا دینے والا پریس ریلیز جاری ہونے والا ہے جسے پڑھ کر تمہاری کھوپڑی بھق سے اڑ جائے گی۔“

”جو ہوگا، دیکھ لیا جائے گا۔ میں بھی کراچی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا ہوں۔ چاہو تو دوسرے فون پر معلوم کرسکتے ہو کہ میں لندن کے ایک پبلک بوتھ سے بات کررہا ہوں۔“ میں نے لب و لہجہ بگاڑے بغیر پورے سکون سے اسے چیلنج دے ڈالا۔

”تم سے بات شروع ہونے کے چند ثانیوں کے اندر اندر ایکسچینج سے یہ بات معلوم کرلی گئی تھی۔ تم اتنے ہی فعال اور مستعد ہو تو اس وقت تمہیں قبرص میں ہونا چاہیے تھا۔“

”اپنے فیصلوں کے اسباب میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ چند روز بعد میں امریکا بھی آرہا ہوں۔“

”اس وقت تک تمہاری کمر ٹوٹ چکی ہوگی۔ تمہارے بہترین آدمی کا نام و نشان یوں مٹایا جائے گا جیسے وہ زمین پر کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ سی ون تھرٹی پر کوئی بارہواں آدمی بھی سوار تھا۔“

”پھر وہ پانچ لاشیں؟ ان کا قاتل کہاں سے پیدا کروگے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اس بار وہ معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے بھنچی بھنچی آواز میں بولا ”پریس ریلیز ویت نام سنڈروم کی کہانی سنائے گا۔ جہاز کے سہ نفری عملے میں ویت نام سے لوٹا ہوا ایک فوجی بھی شامل ہے۔ ویت نام سنڈروم حال ہی میں

دریافت ہونے والی ایک خوفناک دماغی بیماری ہے۔ جو وہاں کے جنگلوں میں لڑنے والے امریکی فوجیوں میں پائی گئی ہے۔ یہ بیماری مریض کا دماغ الٹ کرا سے ہذیانی اور جنونی کیفیت میں مبتلا کردیتی ہے اور اس دیوانگی میں وہ کچھ بھی کرگزرتا ہے۔ سی ون تھرٹی کی پرواز کے دوران میں اس پر ویت نام سنڈروم کا حملہ ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو یرغمال بنالیا اور یوں قبرص کا المیہ رونما ہوا۔ جہاز امریکی اڈے پر ہے۔ وہاں سے وہی خبر باہر نکلے گی جو ہم چاہیں گے۔"

مجھے پسینے چھوٹ گئے۔ اپنے ایک جرم کی پردہ داری کے لیے وہ بہت سنگدلانہ کہانی تھی۔ ہائی جیکنگ کی واردات میں سے ایک غیر ملکی مغوی کا کردار حذف کرنے کے لیے واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں نے سارا الزام اپنے ہی ایک بے گناہ فوجی کے سر تھوپنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کے اعلان کے لیے مناسب وقت کا انتظار کررہے تھے۔

آئزک بیل سے اس وقت ایک کڑی لفظی جنگ چل رہی تھی۔ میرے پاس سوچنے کے لیے ذرا بھی مہلت نہیں تھی میری طرف سے جواب میں ذرا سی تاخیر کو بھی وہ میری کمزوری پر محمول کرتا۔ میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا "معاملہ صرف جہاز کے عملے کی قربانی کا نہیں ہے۔ میرے آدمی کی جان پر بن آئی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ جہاز اور چھ تابوتوں سمیت سب کچھ ایک دھماکے کے ساتھ جل کر رن وے پر ہی راکھ کا ڈھیر ہوجائے گا۔ تمہاری کہانی کچھ بھی ہو، تمہاری قوم زندوں کا خون شاید معاف کردے لیکن چھ مردوں کی بے امان چتا ایک طوفان کھڑا کردے گی۔ تم اپنی تدبیریں کرتے رہو۔ میرا آدمی اپنا کام کرگزرے گا۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہوسکے گا کہ کون ہارا ہے اور جیت کس کی ہوئی ہے۔"

چند ثانیوں کے لیے لائن پر سکوت چھا گیا۔ میری آخری ذہنی قلابازی میں اس کے لیے غور و فکر کا خاصا سامان پوشیدہ تھا۔

"میری پہلی پیش کش اب بھی برقرار ہے۔" آخر کار اس کی وہی سخت آواز ابھری "تم چاہو تو اسے اب بھی آزادی دلا سکتے ہو اور یہی اس کا اصل مطالبہ ہے۔"

"اس کی آزادی کے ساتھ اس ڈھول کی بھی فکر کرو جو تمہارے گلے کی زینت بننے والا ہے۔" اس کی پسپائی سے میں شیر ہوگیا۔ مجھے مرعوب یا خوف زدہ کرنے کے لیے وہ جان بوجھ کر یہ بھی بتاتا چلا گیا تھا کہ سلطان شاہ نے اپنی رہائی کے مطالبے کی شدت واضح کرنے کے لیے اس کے بھیجے ہوئے دونوں اغوا کنندگان کو بے رحمی سے مار ڈالا تھا۔

"تم مجھے اپنا نمبر دے دو۔ میں وائٹ ہاؤس کے کچھ ذمے دار افسروں سے بات کرنے کے بعد ہی تم سے مزید بات کروں گا۔" میرے سخت موقف کے سامنے اس نے ہتھیار ڈالنے کی صداکاری کرتے ہوئے پھر ایک چال چل دی جو غیر واضح نہیں تھی۔

میں نے اس کی چال بازی کا کوئی حوالہ دیے بغیر رسانیت سے کہا "میں لندن میں بہت مصروف ہوں۔ کچھ پتا نہیں کہ کب کہاں ملوں گا۔ تم وقت بتادو۔ میں خود تم سے رابطہ کرلوں گا۔"

"تم ڈر رہے ہو کہ فون نمبر کے سہارے میرے آدمی تم تک نہ پہنچ جائیں۔"

"اچھا ہوا کہ تم نے یہ خطرہ بھی یاد دلایا۔ اصل وجہ میری مصروفیت ہے۔"

"وقت بہت کم ہے۔ چار گھنٹے بعد تمہارے آدمی کی دی ہوئی مہلت ختم ہورہی ہے۔" بولتے بولتے وہ یک لخت خاموش ہوگیا۔ چند ثانیوں بعد وہ بولا تو اس کی آواز غضب ناک ہوچکی تھی "اس فاتر العقل قاتل کو روکو۔ وہ تباہی کے راستے پر چلا جارہا ہے۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اس نے معاون ہوا باز کی لاش بھی رن وے پر پھینک دی ہے۔"

"میں اسے کیسے روک سکتا ہوں؟ وہ تمہارا قیدی ہے۔ اس سے میرا رابطہ ہوتا تو شاید میں اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوسکتا تھا۔ اس وقت وہ خود ہی اپنا باس ہے۔"

"وہ پاگل ہوگیا ہے۔ خود مرنا چاہتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچاسکتی۔ اس نے تم سے مصالحت کے سارے راستے بند کردیے ہیں۔ اب کچھ نہیں

ہوسکتا۔"

"تو پھر میں کتنی دیر بعد تم سے فون پر رابطہ کروں؟" اس کے بگڑے ہوئے موڈ کا اندازہ کرکے میں نے معصومیت سے پوچھا اور ریسیور پر چنگھاڑتی ہوئی آواز میں اس کی گالیاں گونجنے لگیں۔

میں نے ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگا کر فون بند کردیا اور بوتھ سے باہر آگیا۔

وہ قہقہہ میں نے آئزک بیل کو سلگانے کے لیے لگایا تھا ورنہ اندر سے میں بہت دل گرفتہ تھا۔ سلطان شاہ کی طرف سے مجھے کوئی امید نہیں رہی تھی۔

کمرے کی چابی ریسیپشن پر موجود نہیں تھی۔ اوپر پہنچا تو ٹیلی وژن چل رہا تھا اور ویرا شب خوابی کے حریری لبادے میں آچکی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اول خان سے راز و نیاز کچھ زیادہ ہی طویل ہوگئے۔" وہ میری اداسی اور مایوسی پر دھیان دیے بغیر بولی۔

"یہاں کی پولیس نے خاکوں کی بنیاد پر دو افراد کو حراست میں لیا ہے۔ دیکھو ان بے چاروں کی کیا درگت بنتی ہے۔"

دروازہ کھول کر وہ بستر کی طرف چل دی تھی اور اس کی پشت میری جانب ہوگئی تھی۔ وہ مسہری پر بیٹھی تو میں نے تہ کیا ہوا اخبار اپنی جیب سے نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے خاکوں پر کسی نے ضمیمہ چھاپ ڈالا ہے۔" وہ اخبار کھولے بغیر اسے مزید بل دیتے ہوئے بے پروائی سے بولی "اتنی سی بات پر تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

"اخبار دیکھو اور پھر ناچنا بھی شروع کردو۔ سلطان شاہ پر بہت برا وقت آیا ہوا ہے۔"

اس کے لیے وہ اطلاع کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس نے بہت تیزی سے اخبار کھولا اور سرخی پر نظر پڑتے ہی بے اعتباری سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ذیلی سرخیاں اور خبر کی چند سطریں پڑھ کر وہ استفسار طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "جہاز وہی ہے مگر اس میں کسی کا نام نہیں ہے۔"

"میں اخبار خرید رہا تھا اور اول خان مجھے اسی خبر کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ میرا اور اس کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ یہ حرکت سلطان شاہ کی ہے۔"

"کیا اس بات پر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ اکیلا ہونے کے باوجود اس نے اپنی آزادی کے لیے ایک راہ نکال لی ہے؟" ویرا نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"ابتدا میں اول کا بھی یہی ردعمل تھا لیکن اب ہم دونوں اس کے لیے فکر مند ہیں۔ اس کے بعد میں نے آئزک بیل سے بھی فون پر بات کی ہے۔ سب کچھ الجھ کر رہ گیا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

وہ فوری طور پر سنجیدہ ہوکر آگے جھک آئی "مجھے تفصیل بتاؤ۔ ہر کامیابی کے ساتھ ہمیں یہ صدمے کیوں سہنے پڑ رہے ہیں؟ ہم سے کہاں غلطی ہورہی ہے۔"

"پتا نہیں...... اب کچھ محیر العقول واقعات کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ سلطان شاہ کو تابوت میں [illegible] اور اب وہ بے ہوشی سے ہوشیار ہوتے ہی پانچ آدمیوں کو بے بس کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب تک وہ رن وے پر تین لاشیں پھینک چکا ہے۔"

"اتنے بے رحمانہ اختصار سے کام نہ لو۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "تھوڑی سی تفصیل بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ میں کوئی اچھا مشورہ دے سکوں۔"

میں نے اول خان اور آئزک بیل سے حاصل ہونے والی معلومات کو مختصر سے تسلسل میں دہرانا شروع کردیا۔ ویرا درمیان میں اِکّا دُکّا سوال کرتی رہی۔ اس کا آخری ردِعمل میری طرح گہری تشویش اور فکرمندی پر محیط تھا۔

"تم نے یہ برا کیا کہ اسے لندن میں اپنی موجودگی سے آگاہ کردیا۔ وہ اسی وقت اپنے ہرکاروں کو تمہاری تلاش پر مامور کردے گا۔" میرے خاموش ہونے پر ویرا نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"میرے بتانے سے پہلے وہ بات معلوم کرچکا تھا۔ میں اس سے اتنی بے خوفی سے بات نہ کرتا تو میرے فرشتوں کو بھی ان واقعات کی ہوا نہ لگتی جو قبرص کے امریکی

ہوائی اڈے پر پیش آ رہے ہیں۔"
"مگر سلطان شاہ کے ہاتھوں طیارے پر تیسرے قتل کی خبر ملتے ہی آئزک بیل کا دماغ الٹ گیا اور تمہاری ساری کوششیں برباد ہو گئیں۔" ویرا نے تائید طلب لہجے میں کہا۔
"یہ نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے قبل از وقت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قبرص کے واقعے پر واشنگٹن سے کیا رپورٹ جاری کی جائے گی۔ یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ سلطان شاہ کی دی ہوئی مہلت یہاں کے وقت کے مطابق رات کے تقریباً دو بجے ختم ہو جائے گی۔"
"لیکن یہ سب جاننے کے باوجود ہم بے بس ہیں۔ ان معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" وہ بستر سے اٹھ کر بے تابانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔
"ابھی ایک کارڈ باقی ہے۔ آئزک بیل کو فون کر کے میں اسے کھیل سکتا ہوں۔" خاموشی سے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد میں نے پرخیال انداز میں کہا۔
"ہو سکتا ہے کہ اب وہ تمہاری آواز سنتے ہی فون بند کر دے۔" ویرا نے خدشہ ظاہر کیا۔
"اسے میری بات سننی پڑے گی ورنہ وہ واشنگٹن کے بااثر حلقوں کا اعتماد کھو بیٹھے گا۔" میں نے زور دے کر کہا "وہ حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہے۔ اس کا یہ زعم ختم ہو گیا تو اس سے نمٹنا آسان ہو جائے گا۔ اب میں اسے خاک میں ملانے پر تل گیا ہوں۔"
"اس کی دشمنی میں الجھ کر تم سلطان شاہ کی زندگی کو لاحق خطرات کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو؟ ہمیں سر جوڑ کر اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔"
"تم سوچتی رہو۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ دکھنے لگا ہے۔ یہ طے ہے کہ اب ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ زندہ رہے یا اس مہم میں شہید ہو جائے، ہمیں آئزک بیل کو تہس نہس کرنا ہو گا۔ میں اس سے آخری بار بات ضرور کروں گا۔"
ویرا نے میری آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت وسفاکی کے پیش نظر زبان بند کر لی۔
"ان چکروں میں راما کا کو نہ بھولو۔" میں نے اس کی طرف گھوم کر نرمی سے کہا "فون کر کے دیکھ لو کہ اس کا کمرا آباد ہے یا اس کی بیوی کہیں اور منتقل ہو چکی ہے۔"
"کمرے میں واپس آنے تک مجھے سلطان شاہ کے بارے میں کوئی نیا اندیشہ نہیں تھا۔ میں نے آتے ہی اسے چیک کیا تھا۔ اس کی بیوی کے ساتھ کوئی مرد بھی موجود ہے جو اطالوی لب و لہجے میں خاصی روانی سے انگریزی بول لیتا ہے۔"
"دونوں میاں بیوی ایک جیسے ہی نکلے۔" تلخی سے یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل گیا۔
تھوڑی دیر بعد میں فون بوتھ میں کھڑا فون کی گھنٹیوں کی آواز سن رہا تھا۔ تیسری گھنٹی مکمل ہونے سے پہلے فون اٹھا لیا گیا۔ بولنے والا آئزک بیل ہی تھا۔
"میں نے لندن ٹائمز سے پوری کہانی کا سودا کر لیا ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ فون بند کرنے کا ارادہ کرتا، میں نے اپنی دانست میں دھماکا کر ڈالا۔
"سودا کر لیا ہے تو مجھے اطلاع کیوں دے رہے ہو؟" اس وقت وہ دوبارہ پرسکون ہو چکا تھا۔
"ابھی قبرص کی اصل کہانی پر صرف اصولی سودا ہوا ہے۔ ایک لاکھ پاؤنڈ معقول رقم ہوتی ہے۔"
"ایسی حقیر رقمیں میرے معمولی کارندے ایک دن میں اڑا دیتے ہیں۔ اپنا اصل مقصد بتاؤ۔ تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ زبان بند رکھنے کے لیے میں تمہیں ایک سینٹ بھی نہیں دوں گا۔"
"مشکل یہ ہے کہ واشنگٹن کے فیصلے کے حوالے سے کہانی میں تمہارا ذکر ضرور آئے گا۔ واشنگٹن کے اعلان سے پہلے یہ ساری رپورٹ لندن کے ایک بڑے اخبار کی شہ سرخیوں میں چھپے گی تو تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری حیثیت کس قدر مجروح ہو گی۔"
"اوغ۔" اس کی غراہٹ سنائی دی "اب تم مجھے بلیک میل کرو گے۔"
"تمہارے رتبے کے آدمی کو بلیک میل کرنا میرے لیے ایک اعزاز ہو گا جو میرا حوالہ بن سکتا ہے۔"
"کیا لندن ٹائمز والے اسی قدر ڈفر ہیں کہ ایک گمنام آدمی کی بے سروپا باتیں خرید لیں گے؟"

''دس ہزار پاؤنڈ کے عوض میری کہانی ان کے پاس محفوظ رہے گی۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا ''سرکاری پریس ریلیز جاری ہوتے ہی وہ میری رپورٹ چھاپ کر بقیہ نوے ہزار دے دیں گے۔ اتنی اہم اور بڑی خبر خریدنے کے لیے معمولی اخبار بھی دس پندرہ ہزار پاؤنڈ کا جوا کھیل سکتے ہیں۔''

''یہ رقم مل جائے تو تم کہانی بیچنے کا ارادہ ترک کردو گے؟'' وہ راہِ راست پر آگیا۔

''تم سے مجھے رقم لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس بڑے اسکینڈل سے بچنے کے لیے تمہیں میرے آدمی کی آزادی کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنا مدعا ظاہر کردیا۔

''جب وہ اپنے ساتھ پورے جہاز کو آگ لگانے پر تلا ہوا ہے تو تم اسے کیوں بچانا چاہ رہے ہو؟''

''مجھے اپنے ہر آدمی کی جان عزیز ہے۔ وہ خود کو ختم کرنے پر مجبور کردیا گیا ہے ورنہ کوئی بھی اپنی خوشی سے موت کو گلے نہیں لگاتا۔ تمہارے دوست ویت نام سینڈروم کا بہانہ کر کے کسی بے گناہ کو قربانی کا بکرا بنا سکتے ہیں۔ میرے لیے ایسی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کی رہائی کے بعد تم یہ کہانی کسی کو نہیں دو گے؟ میں تمہاری زبان پر بھروسا نہیں کرسکتا۔''

''قبرص کا ڈراما ختم ہونے کے بعد کسی پریس ریلیز کی ضرورت نہیں رہے گی اور یہ اسکینڈل جنم لینے سے پہلے ختم ہوجائے گا۔ ایسے میں کوئی ردی کے بھاؤ بھی کہانی نہیں خریدے گا۔''

''وہ اسی جہاز میں تابوتوں سمیت افغانستان جانے کا مطالبہ کررہا ہے۔ وہ علاقہ مخدوش ہے......''

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اچک لی ''اس کی دی ہوئی مہلت تیزی سے ختم ہورہی ہے۔ یہ کام اس سے پہلے مکمل ہوجانا چاہیے۔''

اس کی رضامندی کا اندازہ ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے آنے والے وقت میں مجھے کھوئی ہوئی جنت ملنے والی ہو۔

''پھر اس خطے میں ترکی ہی ایسا محفوظ ملک ہے جہاں یہ کام رازداری سے ہوسکتا ہے۔ وہاں سے میری ذمے داری ختم ہوجائے گی۔''

''اس کا مطلب یہ لوں کہ تم نے میری تجویز قبول کرلی ہے؟'' میں اپنی خوشی پر قابو نہ رکھ سکا۔

''ابھی میں اس تجویز پر غور کررہا ہوں۔ اس کی توثیق دوسرے ہی کریں گے۔ اس کے بعد بھی ایک بڑا مسئلہ برقرار رہے گا۔ کیا تمہارا آدمی ترکی جانے پر آمادہ ہوجائے گا۔''

''موجودہ حالات میں وہ تمہارے چنگل سے آزاد ہونے اور زندہ رہنے کا کوئی موہوم ترین موقع بھی ضائع نہیں کرے گا۔ مایوسی کی آخری حدوں پر وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔''

''تم انقرہ میں اپنے آدمی کی وصولی کا بندوبست کرو۔ میں اس تجویز کو منظور کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد تم دوبارہ مجھے فون کرو گے تو حتمی فیصلہ ہوجائے گا۔''

''گڈ......اس وقت تم بہت دانش مندی اور تدبر......سے کام لے رہے ہو۔ مجھے امید ہے کہ اپنی کوششوں میں تم وقت پر ضرور نظر رکھو گے۔'' میں نے پورے خلوص اور خوش دلی کے ساتھ کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میں جیتی ہوئی بازی ہار رہا ہوں۔'' اس کی آواز اچانک بہت تلخ ہوگئی ''کبھی کبھی آدمی اپنی غلطیوں کی اس سے بڑی قیمت ادا کرتا ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ معاہدہ ہونے کے بعد دشمنی ختم ہوجائے گی۔ تم جلد ہی فنا کردیے جاؤ گے۔''

''اپنی غلطی کو تسلیم کرلینے والے عظیم ہوتے ہیں۔ تمہاری تلخ نوائی کے باوجود میں تمہاری اس اخلاقی بڑائی کو سلام کرتا ہوں۔'' میں نے تشکر سے لبریز آواز میں کہا۔ ''کاش توثیق کرنے والے بھی اس نکتے کو سمجھ لیں تو یہ سنگین بحران آج رات ہی ٹل جائے گا۔''

''ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں اسی نمبر پر تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔'' اس نے فون بند کردیا۔

گفتگو ختم ہوتے ہی وفورِ مسرت سے میرا دل بھر آیا۔ مایوسی کے گھور اندھیروں میں مجھے اچانک ہی وہ سوجھی تھی۔ یہ خدا کے شکر و ممنونیت کا مقام تھا کہ میں سلطان شاہ سے ہزاروں میل دور اور لاتعلق ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ کر گزرنے میں کامیاب ہوتا نظر آرہا تھا۔

آئزک بیل کا دیا ہوا آدھا گھنٹا پورا ہونے سے پہلے مجھے انقرہ کے بارے میں ادل خان سے بات کرنی تھی۔ پھر میں نے وہ بوتھ چھوڑ دیا۔ تھوڑی سی دیر میں، میں نے اسی ایک بوتھ سے آئزک بیل کو دو مرتبہ فون کیا تھا۔ اگر اس نے دوسری بار یہ معلوم کرلیا تھا کہ میں اسے فون کرنے کے لیے ایک مخصوص بوتھ ہی استعمال کررہا تھا تو تیسری بار اس کے آدمی مجھے نرغے میں لے کر کوئی بھی من مانا سلوک کرسکتے تھے۔

ٹیکسی میں وہاں سے وکٹوریہ کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں آہستہ آہستہ یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ آئزک بیل نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی نہ اسکینڈل ٹالنے کے لیے وہ سلطان شاہ کو چھوڑنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اس نے یہ مکاری صرف اس لیے کی تھی کہ آدھے گھنٹے میں کسی کو ہدایات دے کر اس بوتھ کے گرد اپنے آدمیوں کا جال پھیلا سکے اور پھر مقررہ وقت پر وہ مجھے گھیر لیں۔ جگہ تبدیل کرنے کے بعد میں ایسے کسی خوف کے بغیر اس سے تیسری بار بھی رابطہ کرسکتا تھا۔

وکٹوریہ اسٹیشن کے باہر ٹیکسی چھوڑ کر میں اونچی چھت والے ہال میں داخل ہوا تو وہاں کئی بوتھ خالی تھے۔ میں نے ایک الگ تھلگ بوتھ منتخب کر کے ادل خان سے رابطہ کرلیا۔

''شاید تم اس وقت بھی وہاں کچھ کرتے پھر رہے ہو۔'' میری آواز سن کر ادل خان پرامید لہجے میں بولا ''کیا اس کے بارے میں کوئی نئی خبر ملی ہے۔''

''خبریں ہی خبریں ہیں۔ میں دوبار اسحٰق گھنٹی سے بات کرچکا ہوں۔ چند منٹ بعد آخری گفتگو ہوگی۔ ایک ہلکی سی امید پیدا ہوئی ہے کہ شاید سلطان شاہ کو انقرہ پہنچایا جائے......''

''یہ کیسے ہوگا؟ پتھر سے تیل نکلنے کی بات سمجھ میں آسکتی ہے مگر یہ......''

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ انقرہ میں کسی کا بندوبست کرو جو ضرورت پڑنے پر پوری ذمہ داری سے سلطان شاہ کی آزادی کی تصدیق کرسکے۔'' اس سے بات کرتے ہوئے میری نظریں بار بار اپنی رسٹ واچ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

''انقرہ میں ایوب آغا میرے مکمل بھروسے کا، میرے جیسا غیر سرکاری آدمی ہے۔ میں اس کی ڈیوٹی لگائے دیتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو وہ کچھ سفارتی رابطے بھی استعمال کر گزرے گا۔''

''مجھے ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ میرے پاس صرف چار منٹ رہ گئے ہیں۔ جلدی سے مجھے اس کا فون نمبر دو اور اسے میرے بارے میں بریف کردو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کام آج رات ہی ہوجائے۔''

ادل خان کے مبہم اشارے سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ ایوب آغا بھی ایس ٹی ایف کا کوئی آدمی تھا۔ مجھے لائن ہولڈ کرانے کے بعد ادل خان ذرا سی دیر کے لیے غائب ہوا پھر اس نے ایوب آغا کا فون نمبر بتایا جو میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر لکھ لیا۔

''اب صرف اتنا سن لو کہ سلطان شاہ اب تک ان کے تین آدمی مار چکا ہے اور قبرص سے افغانستان واپسی کا مطالبہ کررہا ہے۔ وہ رہا ہوگیا تو کل کے اخباروں میں سناٹا رہے گا ورنہ ہر طرف ایک بھونچال سا آجائے گا۔ دعا کرو کہ میں سرخرو ہوجاؤں۔''

''میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارا وقت ہورہا ہے۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔''

میں نے کریڈل دبا کر لائن منقطع کردی اور پھر فوراً ہی آئزک بیل کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجنے تک مقررہ وقت میں صرف چند سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ ایک ہلکی سی بزر ہوتے ہی آئزک بیل لائن پر آگیا۔

''میں نے تمہاری بات اوپر تک پہنچادی ہے۔ دوسرے فون پر وہاں سے کسی بھی وقت جواب آسکتا

ہے۔'' اس نے کہا'' پہلے تمہارا آدمی صرف میرا دردِ سر تھا لیکن سی ون تھرٹی کی وجہ سے ہر ایک نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ صرف ایک شخص میرا اہم خیال ہے اور وہی کچھ کام دکھا سکتا ہے۔''

''یہ وقت گزارنے کی کوئی کوشش تو نہیں ہے؟'' میں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ تمہاری تجویز پر پوری سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے...... یہ تو بتاؤ کہ کیا تم کسی نئے بوتھ سے فون کر رہے ہو؟ تمہاری آواز کچھ بھاری محسوس ہو رہی ہے۔''

میں اس ملعون کی مکاری پر نفرت اور تلخی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے ابتدائی گفتگو میں الجھا کر وہ اپنے ایکسچینج سے معلومات لے چکا تھا مگر مجھ سے آواز کے بھاری ہونے کا بہانہ کر رہا تھا۔

اسے سلگانے کے لیے میں نے بھی تجاہل سے کام لیتے ہوئے جواب دیا'' میں وہیں سے بات کرتا مگر اس بار وہاں کچھ مشتبہ افراد منڈلا رہے تھے۔ ان سے الجھنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے میں ادھر چلا آیا۔''

''تم اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ تمہیں ہر جگہ اپنے دشمن نظر آتے ہیں۔ میرے سوا اور کس کو معلوم ہوگا کہ اس وقت تم اس بوتھ پر آؤ گے؟''

''تو پھر وہ تمہارے ہی آدمی ہوں گے۔'' اس بار میں نے صاف شبہ ظاہر کر دیا۔

وہ تلخ انداز میں ہنس پڑا'' تم بہت چالاک بننے کی کوشش کرتے ہو۔ میں جلد ہی تمہارے پر کتر کر تمہیں اپنے عجائب گھر میں سجاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ انقرہ میں تم نے کیا بندوبست کیا ہے۔''

''میرا آدمی ہدایات کا منتظر ہے۔ تم طریقہ کار بتاؤ۔ وہ خود رابطہ کرے گا۔''

''کرنل فل برائٹ۔ نام نوٹ کر لو۔ وہ اب سے دو گھنٹے بعد انقرہ کے ملٹری ائر بیس کے کمانڈر کے پاس موجود ہوگا اور تمہارے آدمی کے ساتھ جہاز پر جائے گا۔ تمہارے آدمی کا کیا نام ہے؟''

''ایوب آغا۔'' میں نے نام دہرا دیا اور پوچھا'' کیا اوپر سے اتنی جلدی جواب آ گیا؟''

''اپنے کام سے کام رکھو۔ غیر ضروری سوالات مت کرو۔ یہ شوق اس وقت پورا کر لینا جب تم بے بسی کے عالم میں میرے روبرو لائے جاؤ گے۔''

''تم نے یہ اطمینان کر لیا ہے کہ یہ کام مقررہ مہلت ختم ہونے سے پہلے مکمل کر لیا جائے گا؟''

''قبرص والوں کو ہدایات دے کر کوشش کی گئی ہے۔ جہاز پر وزن نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ انقرہ پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لے گا۔ انقرہ والوں سے سارے معاملات وہ خود طے کر لیں گے۔''

''تم نے میرے پرانے بوتھ کے گرد منڈلانے والوں کے بارے میں کوئی جواب نہیں دیا۔''

''وہ کوئی بھی ہوں۔ میں انہیں نہیں جانتا۔ تم میری ایک بات لکھ لو کہ اب تمہاری آزادی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ میں نے اپنی پوری توجہ تم پر مرکوز کر دی ہے۔''

میں اسے کوئی سخت بلکہ منہ توڑ جواب دے سکتا تھا لیکن وہ میرے ہاتھوں میں موم کی ناک بنا ہوا تھا۔ اسے تاؤ دلانا میرے بلکہ سلطان شاہ کے حق میں ضرر رساں ثابت ہو سکتا تھا۔

''تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے اتنی توجہ کے قابل سمجھا۔ میں جلد ہی......'' باقی الفاظ میرے منہ میں ہی رہ گئے کیوں کہ آئزک بیل نے اچانک فون بند کر دیا تھا۔

بلی اور چوہے کا وہ روح فرسا کھیل دھیرے دھیرے ایک واضح اور روشن انجام کی طرف بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ موت کے دہانے سے سلطان شاہ کی واپسی کی امید بندھ جانے کے بعد میرے وجود میں توانائی کی ایک نئی لہر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ میں وہ بوتھ چھوڑ کر دوسرے بوتھ میں گھس گیا۔

آئزک بیل کی خباثت اور مکاری کے کھلے کھلے ثبوت سامنے آ جانے کے بعد میں ہر امکانی احتیاط سے کام لینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔

انقرہ کا نمبر ملاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ عجلت میں، میں نے ایوب آغا کی وطنیت کے بارے میں اول خان سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ نام کچھ ایسا منفرد تھا کہ

وہ ایرانی یا ترک بھی ہوسکتا تھا۔

ایوب آغا میرے فون کا منتظر تھا۔ میرا تعارف سنتے ہی سنجیدہ آواز میں احکام کا طالب ہوگیا۔

وہ پاکستانی ہی تھا اور شستہ اردو بول رہا تھا۔ اس کے گمبھیر لب و لہجے سے ظاہر ہورہا تھا کہ اول خان کی بریفنگ سے وہ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا چکا تھا۔

''ہمارے ٹائم زون مختلف ہیں۔ اب سے ایک گھنٹا پچاس منٹ بعد انقرہ کے ملٹری ائربیس کے کمانڈر کے پاس کرنل فل برائٹ پہنچے گا۔ اس کے ساتھ سی ون تھرٹی پر جاکر تم مغوی کو پوری احتیاط سے واپس لاؤ گے۔ یہ خیال رہے کہ جہاز چھوڑنے کے بعد تم دونوں پر کہیں بھی قاتلانہ حملہ ہوسکتا ہے۔ اسے انقرہ سے جلد از جلد کراچی بھیج کر تم اپنی ذمے داری سے بری ہوجاؤ گے۔''

''ائربیس کا کمانڈر میرا دوست ہے۔'' ایوب آغا کے اس انکشاف نے میرا دل خوش کردیا، وہ کہہ رہا تھا ''اگر یہ ملٹری ائربیس کا معاملہ ہے تو تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ میں ابھی سے وہیں ڈیرا ڈال دوں گا۔ اس قلعے میں کوئی میرے مہمان کا بال بھی بیکا نہیں کرسکے گا۔''

''میرا فون نمبر لکھ لو۔ سلطان شاہ آجائے تو مختصر سا پیغام دے دینا۔ ہوٹل میں میرا نام اسلم خان ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے ہوٹل کے کمرے اور ٹیلی فون کے نمبر بتادیے۔ نمبروں کی تصدیق کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی لیکن موسم خاصا سرد تھا۔ میں ٹکٹ خرید کر آکسفورڈ اسٹریٹ سے ہوکر جانے والی ایک سرخ ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہوگیا۔

روشنی میں نہائے ہوئے، شہر کے بارونق علاقوں سے گزرتے ہوئے بس نے مجھے آکسفورڈ سرکس پر اتار دیا۔ وہاں سے ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پیدل ذیلی سڑک پر ہولیا۔

راستے میں، میں نے دور سے اپنے پسندیدہ فون بوتھ کی طرف نظریں دوڑائیں تو اس وقت وہاں خلاف معمول چار تنومند نوجوان سر جوڑے کھڑے تھے اور ہر راہ گیر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ •

انہیں دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان چاروں کو یقینی طور پر کسی ڈیوڈ اسٹار نے ہی میرے لیے بھیجا تھا۔ انہیں دیا ہوا وقت بہت پہلے گزر چکا تھا مگر وہ پھر بھی کسی کامیابی کی امید میں وہیں جمع تھے تاکہ سرخرو لوٹ کر وہ اپنے یہودی آقا سے انعام کے طلب گار ہوسکیں۔

میں ویرا سے صرف ایک ٹیلی فون کا ذکر کرکے ہوٹل سے گیا تھا۔ وہاں چکر ہی دوسرا چل پڑا اور مجھے دشمن کو جل دینے کے لیے وکٹوریہ تک دوڑ لگانی پڑگئی۔ پل پل بدلتے ہوئے حالات میں میری اس تاخیر نے اسے پریشان کردیا تھا۔

میری صورت دیکھتے ہی وہ والہانہ انداز میں میرے سینے سے لگ گئی۔ ویرا کی وہ حرکت اس قدر بے ساختہ اور والہانہ تھی کہ میں نے ہولے سے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''مجھے اختلاج سا ہونے لگا تھا۔'' اس نے میرے سینے میں منہ چھپا کے شکوہ کیا ''تم کہاں رہ گئے تھے؟''

''آج میں نے سلطان شاہ کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ ہمارے بوتھ کے قریب اس وقت بھی چار سفید فام غنڈے میرا انتظار کررہے ہیں۔ اگر آج رات سلطان شاہ کو عذاب سے نجات مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری ساری محنت وصول ہوگئی۔''

ویرا نے میرے سینے سے ہٹ کر اپنی بڑی بڑی، تحیر زدہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں ''کیا واقعی ایسی کوئی مضبوط امید پیدا ہوچلی ہے؟''

''امید پر دنیا قائم ہے۔'' یہ کہہ کر میں تھکے ہارے انداز میں بستر پر گر گیا۔ ویرا نے فوراً ہی قالین پر بیٹھ کر میرے پیروں سے جوتے اور موزے اتارنے شروع کردیے۔

میں نے سرور کے عالم میں لمحہ بھر کے لیے آنکھیں موندیں تو میرے تصور میں غزالہ کا شکایتی چہرہ مجسم ہوگیا۔ اس کا چہرہ غم آلود اور آنکھیں نمناک تھیں۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور دونوں پیر ویرا سے دور سمیٹ لیے۔ میری خلوت کی وہ آزادیاں اور دوسری سرمستیاں غزالہ کی امانت تھیں۔ ویرا کو وہ قربت دے کر میں گھر بیٹھی

غزالہ کی امانت میں خیانتِ مجرمانہ کا مرتکب ہورہا تھا۔

''کیا ہوا؟ تم ایک دم ہی کیوں چونک پڑے؟'' ویرا قالین سے اٹھ کر مسہری پر میرے قریب بیٹھ گئی۔ میں کروٹ لے کر مسہری کے دوسرے سرے پر لڑھک گیا۔

''غزالہ کا خیال آگیا تھا۔ وہ شہر میں اکیلی اور بے گھر ہے۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''اس کی ایسی المناک منظرکشی نہ کرو۔ اول خان کا پورا گھرانا اس کی خبر گیری کررہا ہے اور وہ ان ہی کی میزبانی کے مزے لوٹ رہی ہے۔''

''یہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ شادی شدہ عورت اپنے مرد سے دور ہو تو ہزاروں کی بھیڑ میں بھی خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہے اور اس کے ساتھ اکیلی ہوکر بھی اکیلی نہیں ہوتی۔''

''اس وقت ہم سب میں سلطان شاہ سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ اس کے بعد غزالہ کی باری آتی ہے۔ تم مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ تم کیا تیر مار کر آئے ہو؟'' اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''میں جب سوچتا ہوں، کانپ کر رہ جاتا ہوں۔ اگر غزالہ اس رات فلیٹ پر ہی ہوتی تو اس پر کیا گزری ہوتی۔ اس کے ساتھ سلطان شاہ بھی بندھ کے رہ جاتا۔''

''وہ تو اب بھی بندھا ہوا ہے۔ تمہاری رائے تھی کہ سلطان شاہ نے سی ون تھرٹی پر قبضہ کرکے سنگین غلطی کی ہے اور اب وہ مارا جائے گا۔'' ویرا نے چڑ کر مجھے میری ہی بات یاد دلائی۔

''کچھ دیر پہلے ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔ یوں سمجھو کہ آئزک بیل نے میری بلیک میلنگ کے سامنے جھکنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

وہ جس بات کے پیچھے پڑ جاتی تھی اسے اگلوا کے رہتی تھی۔ اس سے سوال و جواب کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا اور معلومات میں تازہ ترین اضافوں کے ساتھ اس کا موڈ خوشگوار ہونے لگا۔

میرے جسم اور ذہن پر شدید تکان طاری تھی لیکن آنکھوں میں دور تک نیند کا پتا نہیں تھا۔ لاشعور میں بس ایک خیال بسا ہوا تھا کہ رات کے ایک اور دو بجے کے درمیان انقرہ سے سلطان شاہ کے بارے میں کوئی خبر آنی ہے اور اس وقت تک مجھے ہر حال میں جاگنا ہے۔

وقت گزارنے کے لیے ویرا کو چڑا چڑا کر اس کے سوالوں کے جواب دینا ایک اچھا مشغلہ تھا۔ وہ سلطان شاہ اور آئزک بیل کی طرف سے پوری تسلی ہوجانے کے بعد دوبارہ غزالہ کا ذکر نکال بیٹھی۔

''اب تمہیں غزالہ کیوں یاد آگئی؟'' میں نے غصیلے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''سلطان شاہ کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد اب ہم دنیا کے ہر موضوع پر بے فکری سے بات کرسکتے ہیں۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''اس وقت مجھے سب کچھ معلوم تھا اسی لیے مجھے غزالہ کا خیال آرہا تھا۔''

''تم جیسے شکی اور حاسد شوہروں سے دور رہ کر وہ پہلے سے زیادہ سکھی ہوگی۔''

''جس دن کسی معقول آدمی سے شادی کرلوگی تو یہ باتیں خود بخود سمجھنے لگوگی۔''

''یورپ کی شادیاں لڑکیوں کے لیے عمر قید کی سزا نہیں ہوتیں۔ مرد ذرا بھی بگڑتا ہے تو عورتیں خود ہی کوئی دوسری راہ تلاش کرلیتی ہیں۔ کوئی کسی کے بغیر خود کو اداس اور تنہا محسوس نہیں کرتا۔ یہ چونچلے بس مشرق ہی میں چلتے ہیں۔''

''عورتیں ساری دنیا میں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن تم جیسی خال خال ہوتی ہیں۔''

''دنیا کی عورتوں کا حال تمہارے سامنے ہے۔'' وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی ''راما کا روزینی بیوی کو دھوکا دے کر عیاشی کے ارادے سے نکلا اور اس کی معصوم سی بیوی اپنے شوہر کی موت سے بے خبر اس کے بستر پر کسی اور کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہے۔''

''فون پر ایک اطالوی مرد کی آواز سن کر تم نے اتنا بڑا الزام کیسے لگا دیا؟'' میں نے اسے چڑانے کے لیے اعتراض کیا ''ہوسکتا ہے کہ وہ اس کا بھائی رہا ہو۔''

''اونہہ۔'' ویرا نے حقارت سے اپنا سر جھٹکا ''یہاں

کوئی بھائی اپنی بہن کے لیے ایسی قربانیاں نہیں دیتا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سب اپنے اپنے گھر، مرضی اور تقدیر کے مالک ہوتے ہیں۔"

"تمہارے دماغ کے کیڑے جب زور کرنے لگتے ہیں تو تمہیں ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ اب میرے اوپر کیوں چڑھی چلی آرہی ہو۔ تم دور رہ کر بھی بات کرسکتی ہو۔"

"تمہاری ایسی کی تیسی!" ویرا نے جھلا کر بیڈ سوئچ پر ہاتھ مارا اور کمرا تاریک کردیا "اتنی دیر سے خود چھیڑ چھاڑ کررہے ہو اور الزام مجھ پر لگا رہے ہو۔ میں تمہارا دماغ درست کردوں گی۔"

وہ غراتی ہوئی بہت جارحانہ انداز میں میرے سینے پر سوار ہوگئی اور میرے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی میری دونوں کنپٹیوں کو اپنی نرم ہتھیلیوں میں دبا کر ایک خاص انداز میں زور زور سے مسلنے لگی۔

میں نے اسے اپنے سینے پر سے دھکیل کر نیچے گرانا چاہا مگر یوں محسوس ہوا، جیسے میرے بازو من من بھر کے ہوگئے ہوں، آنکھیں یک بیک بند ہونے لگی تھیں اور ذہن پر ہلکا ہلکا انجانا سا سرور طاری ہونے لگا۔

"مائی ڈارلنگ!" مجھے ویرا کی سرسراتی ہوئی سرگوشیانہ آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی "تم بار بار یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میرا نام ویرا ہے۔ میں جب چاہوں پلک جھپکتے میں تمہیں کسی کیچوے سے زیادہ بے ضرر بنا سکتی ہوں۔ اب تم کچھ دیر تک میرے ہی رحم و کرم پر رہوگے۔"

میری کنپٹیوں پر اس کی نرم و گداز ہتھیلیاں بدستور تھرک رہی تھیں پھر میری سماعت بھی جواب دے گئی اور میرے کانوں میں بس ویرا کی منمناہٹیں ابھرتی ڈوبتی رہ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے ویرا نے میرے لباس میں بے شمار گرم گرم اور لجلجے کیچوے چھوڑ دیے ہوں۔

پتا نہیں وہ کیفیت کتنی دیر قائم رہی۔ دوبارہ ہوش میں آتے ہی میں نے ہڑبڑا کر رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو میری کلائی خالی تھی۔ کمرا روشن تھا اور ویرا اپنے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ سجائے کرسی پر بیٹھی میری رسٹ واچ سے کھیل رہی تھی۔

"بوکھلانے کی ضرورت نہیں، ابھی ایک بجنے میں بھی کچھ دیر باقی ہے۔" ویرا نے میری کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟ مجھے کیا ہوا تھا؟ میں نقاہت محسوس کررہا ہوں۔" میں نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ اس وقت بھی میرا ذہن دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

ویرا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد ایک گرم گلاس گرم دودھ ساری نقاہت دور کردیتا ہے۔ یہ میرے مارشل آرٹ کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ جب الجھوگے، میں اسی طرح سمیٹ کر اپنا کھلونا بنالوں گی۔ ذرا سی دیر میں تم بالکل نارمل ہوجاؤ گے۔"

اس کی بات حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ کچھ دیر تک پلکیں جھپکانے کے بعد رفتہ رفتہ میری ساری توانائیاں بحال ہوگئیں اور میں نے بستر چھوڑ دیا۔

"یہ تمہاری بہت گھٹیا حرکت تھی۔" میں نے قدرے برہمی سے کہا "بے خبری میں تم نے مجھے دبوچ لیا ورنہ میں ذرا سی دیر میں تمہاری طبیعت صاف کردیتا۔"

"دشمن ہمیشہ بے خبری میں ہی دبوچتا ہے۔" وہ مسلسل تیکھے انداز میں مسکرائے جارہی تھی "آج میں نے تمہیں اس کمال کا ہلکا سا نمونہ دکھایا ہے۔ آئندہ یہ وقفہ بڑھ بھی سکتا ہے۔"

"تو اب تم مجھ سے دشمنی پر اتر آئی ہو؟" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"دوستی سے بھڑکتے ہو تو اب دشمنی سے ہی کام چلانا پڑے گا۔ جامد رہنا میرے لیے مشکل ہے۔"

میں دل ہی دل میں اس واقعے پر خفت اور شرمندگی محسوس کررہا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ مختصر سی بے ہوشی کے عالم میں ویرا نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ میں اس بارے میں اس سے کچھ پوچھتا تو وہ مجھے اپنے مذاق کا نشانہ بنالیتی۔ میں اس پر ملامت آمیز نظریں ڈالتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔

ویرا جب سے ماسٹر رابرٹ ہوٹل چھوڑ کر میرے ساتھ آئی تھی۔ مسلسل ایک اضطراب اور بے کلی میں مبتلا تھی۔ حالات کچھ ایسی نہج پر چل رہے تھے کہ مجھے خود بھی اس کی دل جوئی کا خیال نہیں رہا تھا۔ اس رات ویرا نے ایک طویل اعصابی شکست و ریخت کے بعد سلطان شاہ کی آزادی کا مژدہ سنا تھا اور ذہن سے وہ بوجھ اترتے ہی بے لگام ہوگئی تھی۔

اس نے میری کنپٹیوں کی کچھ مخصوص رگوں پر دباؤ ڈالنے کے بہانے اتنی دھینگا مشتی کرلی تھی کہ اس کے بعد وہ آسودہ اور پرسکون نظر آرہی تھی۔

باتھ روم سے میری واپسی پر ویرا نے رسٹ واچ مجھے لوٹا دی "ایک بج چکا لیکن ابھی تک انقرہ سے کوئی خبر نہیں آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اس کے چار آدمیوں کو دھوکا دیا اور اس نے تمہیں ساری رات انتظار کے عذاب میں مبتلا رکھنے کے لیے جھوٹی یقین دہانیاں کرادی ہوں۔"

"میں جو کچھ کرسکتا تھا، کرگزرا۔ اس سے کوئی بات بعید نہیں ہے۔ اب ہمیں صرف انتظار کرنا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو سلطان شاہ جہاز کو تباہ کردے گا۔ صبح ہونے تک یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل چکی ہوگی۔"

"رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی تو سفر سوتے ہوئے گزرے گا۔" ویرا بڑبڑا کر رہ گئی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر بستر پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ ویرا کمرے میں بکھرے ہوئے مختصر سے اسباب کو سوٹ کیسوں میں بھرنے لگی۔

دو بھی بج گئے لیکن کہیں سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ میری تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ پتا نہیں قبرص میں کیا ہو رہا تھا۔ کراچی میں اول خان، انقرہ میں ایوب آغا اور لندن میں ہم دونوں سخت بے چینی کے عالم میں کسی خبر کے منتظر تھے مگر ہر طرف سناٹا تھا۔

میں نے ایوب آغا کو مختصر پیغام دینے کی ہدایت کرکے غلطی کی تھی۔ اس جیسے زیرک آدمی کے لیے اس ہدایت کا ایک ہی مطلب تھا کہ غیر ضروری پیغام رسانی سے اجتناب برتا جائے۔ اگر میں نے اس پر ایسی کوئی پابندی عائد نہ کی ہوتی تو شاید وہ مجھے فون پر یہ بھی بتا دیتا

کہ مقررہ وقت پر کرنل فل برائٹ انقرہ ائربیس کے کمانڈر کے دفتر میں پہنچا تھا یا وہ بھی غائب تھا۔

کرنل فل برائٹ کے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی ابتدائی اطلاع سے ہی آئزک بیل کی اصل کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ بات اس وقت بھی معلوم کی جاسکتی تھی مگر اتنی رات گئے میرا ہوٹل سے نکلنا عملے کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرسکتا تھا۔ راما کا کے بعد ایسے ناوقت ہوٹل کا فون بھی استعمال نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

انسان کو جب وقت درکار ہوتو وہ پر لگا کر اڑنے لگتا ہے اور انتظار کی بے کیف گھڑیاں گزارنی ہوں تو کاٹے نہیں کٹتا۔ بار بار گھڑی پر نظر ڈال کر مجھے خواہ مخواہ یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس وقت گھڑیوں کی رفتار کچھ دھیمی ہوگئی تھی۔

میرے ذہن پر اونگھ سوار تھی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

آخر صبح کے چار بجے فون کی گھنٹی سن کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ میں نے پہلی گھنٹی سن کر ریسیور کو ہاتھ نہ لگایا تو ویرا ادھر لپکی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ میں آپریٹر کو یہ تاثر نہیں دینا چاہ رہا تھا کہ ہم اپنی نیند کو تج کر بے تابی سے اس کال کا انتظار کررہے تھے۔

دوسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر غنودہ آواز میں ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایوب آغا کی آواز آئی۔ آپریٹر شاید کال ہمارے فون پر منتقل کرکے خود اتنا غفیل ہوگیا تھا۔

''مہمان آگیا ہے۔ حال ابتر ہے مگر خطرے کی بات نہیں ہے۔'' ایوب آغا نے میری ہدایت کی پاسداری کرتے ہوئے بہت مختصر اور جامع الفاظ میں اپنی رپورٹ مکمل کردی۔

لائن پر آپریٹر موجود نہیں تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر بات آگے بڑھادی ''کیا بات ہے۔ پرواز آنے میں اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ یہ پرواز کئی گھنٹے پہلے آجانی چاہیے تھی۔''

''مہمان نے جہاز کے عملے میں کسی نئے آدمی کے اضافے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ بے خوابی اور تین ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے کے سبب کپتان کی حالت غیر تھی۔ اس کا معاون پھینک دیا گیا تھا۔ دوسرا آدمی غیرفنی سروس بوائے تھا۔ آخر کار مجبوری کے عالم میں اسی کو یہ پرواز لانی پڑی۔''

''مہمان کہاں ہے؟ کیا اس سے مختصر سی بات ہوسکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ زخمی تھا اور بخار میں پھنک رہا تھا۔ اسے جہاز سے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ اب میں بھی اسی طرف جاؤں گا۔۔۔ ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ کراچی چلا جائے گا۔'' وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا۔

''اب تم سے کہاں رابطہ ہوسکے گا؟ تم تو شاید اسپتال میں ہی رکے رہوگے۔''

''وہ فوجی اسپتال میں بہت محفوظ ہے۔ کسی کو پتا نہیں کہ اسے کہاں لے جایا گیا ہے۔ میں اس کی خبر گیری کرکے چلا جاؤں گا اور پھر اپنے نمبر پر موجود رہوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ۔ میں تمہارا احسان مند ہوں۔'' میں نے کہا۔ اس نے سلام کرکے فون بند کردیا۔

''میرا دل کہہ رہا تھا کہ تمہارا آخری کارڈ ضرور کامیاب ہوگا۔ آخر کار وہ موت کے منہ سے لوٹ ہی آیا۔'' فون بند ہوتے ہی ویرا خوشی سے ناچ اٹھی۔ اس نے میری باتوں سے کامیابی کا اندازہ لگالیا تھا۔

''شاید امریکا کی سیاحت اس کے نصیب میں نہیں ہے۔'' میں نے فرحت کے احساس کے ساتھ کہا ''کون سوچ سکتا تھا کہ سفارتی کارگو کے ساتھ اسمگل کیا جانے والا شخص بھی راستے سے لوٹ سکتا ہے۔''

''خدا اس طرح دشمن کو بھی امریکا نہ لے جائے۔ اگر میں تمہارا ساتھ نہ دیتی تو اپنے وطن کے عمل داروں کا یہ ڈراؤنا روپ کبھی بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ستھرے اور عادلانہ نقابوں کے پیچھے کیسے کیسے بھیانک چہرے چھپے بیٹھے ہیں جن کے لیے انسانی خون کی ذرا بھی حرمت نہیں ہے۔''

''بتی بند کردو اور ذرا ایک مرتبہ پھر میری کنپٹیاں سہلا دو تاکہ میں ایک دو گھنٹے کی نیند لے سکوں۔'' میں نے طویل انگڑائی لے کر کسل مندانہ لہجے میں فرمائش کی۔

وہ فوراً ہی میری طرف بڑھی اور میں نے بوکھلا کر

...روک دیا ''مجھے ہاتھ بھی نہ لگانا۔ تم تو مذاق مذاق میں ...یدہ ہوئی جارہی ہو۔ میں دس راتیں بھی جاگ کر ...اروں تو ایسی توڑ دینے والی مدہوشی کی آرزو نہیں کروں ...خدا کی پناہ...... یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟''

''چاہو تو تمہیں بھی سکھادوں گی۔ تم کو میری ...ردی اختیار کرنی ہوگی۔'' وہ ایک آنکھ دبا کے بولی۔

میں نے بتی بند کردی اور وہ مسہری پر آگری۔

☆☆☆

آٹھ بجے میں نے بستر چھوڑ کر ویرا کو بھی بیدار ...ردیا۔ ذہن سے سلطان شاہ کی پریشانی دور ہوتے اور ...رے میں اندھیرا پھیلتے ہی ہم دونوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ...گیا تھا۔ شاید میں بھی دیر تک سوتا رہتا لیکن میرے ...شعور میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ راما کا روزینی کی بے ...ور کفن لاش بی ایم ڈبلیو کی ڈکی میں بند اپنے کسی متلاشی ...منتظر تھی اور اس کے دریافت ہونے سے پہلے ہی ہمیں ...بل بلکہ شہر سے باہر نکل جانا چاہیے تھا۔

کہنے کو ہمارے پاس دو الگ الگ سوٹ کیس تھے ...لیکن ان میں سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ تیاری کے ...دوران میں ویرا نے ناشتا کمرے میں منگوانے کی تجویز ...پیش کی۔ میں نے اسے ٹال دیا۔ اجالا نمودار ہونے کے ...ساتھ ہی میرے اوپر وہاں سے نکل بھاگنے کی گھبراہٹ ...سوار تھی۔

''یہاں سے بھوکے نکل کر کیا اب جہاز پر ہی ناشتا ...کروگے؟'' میری ٹال مٹول پر ویرا نے احتجاج کیا۔

''ہماری پرواز دوپہر سے پہلے روانہ ہوگی۔ ایئر ...پورٹ پر ہمیں کافی وقت ملے گا۔ اس وقت اس وحشت ...کدے سے نکل بھاگنے کی فکر کرو۔ کل راما کا نے میرے ...لیے مافیا والے بلالیے تھے۔ آج ڈیوڈ اسٹا... کے غنڈے ...اس علاقے کو چھانتے پھر رہے ہوں گے۔ غنیمت یہ ہے ...کہ ان میں سے کسی کو بھی میری شناخت نہیں ہے۔''

''پولیس والوں کے شناختی خاکے کو تم فراموش ...کررہے ہو۔'' ویرا نے شوخی سے کہا۔

طویل سفر کے لیے تیاری مکمل کرکے ہم نے کمرے ...کی الماریوں اور دروازوں وغیرہ کا الوداعی جائزہ لیا۔

سفری دستاویزات اور کرنسی کو محفوظ کیا اور روم سروس والوں کو زحمت دیے بغیر وہاں سے چل دیے۔

کاؤنٹر پر ہمارے چیک آؤٹ ہونے کی کوئی پیشگی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے بل تیار نہیں تھا مگر رش نہ ہونے کی وجہ سے دونوں لڑکیاں پھرتی سے اس کام میں مصروف ہوگئیں۔

انٹر کام پر ہوٹل کے مختلف شعبوں سے تفصیلات معلوم کرکے کمپیوٹر پر ڈالی گئیں اور چند منٹ بعد بل ہمارے سامنے تھا جس کے مطابق ہمارے سوا بارہ پاؤنڈ ہوٹل پر واجب الادا تھے۔

"یہ رقم تم دونوں کی ہوئی۔" میں نے مسکرا کر ان دونوں کو نوید سنائی۔ مسرت اور بے یقینی سے ان کے چہرے کھل اٹھے۔ اس قسم کے ہوٹلوں میں ٹپ کے لیے وہ رقم غیر معمولی تھی۔

وہ دونوں ہی مشینی انداز میں بار بار ہمارا شکریہ ادا کرنے لگیں۔ اسی لمحے ایک لڑکی کو خیال آیا کہ اس کے دونوں معزز مہمان اپنے سوٹ کیس خود اٹھائے کھڑے ہیں۔ اس نے اشارے سے ایک پورٹر کو بلایا اور مجھ سے پوچھا "ٹیکسی منگوادوں؟"

گیتا اور جیمز پنڈت کے واقعے کے بعد ٹیکسی میرے لیے شجر ممنوعہ بن چکی تھی۔ پچھلی رات میں نے محض وقت کی کمی کی وجہ سے وکٹوریا جانے کے لیے وہ سواری منتخب کی تھی۔ مجھے رات والی بس کا روٹ نمبر یاد تھا۔ اس وقت بھی میں پچیس نمبر بس کے ذریعے وکٹوریا جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"ہم بازار سے کچھ خریداری کرکے آگے جائیں گے۔ شکریہ۔" لڑکی کا دل رکھنے کے لیے میں نے کہا، پورٹر کو بلاوجہ ایک پاؤنڈ دے کر ٹالا اور ہم اپنے اپنے سوٹ کیس لٹکا کر ہوٹل سے باہر نکلتے چلے گئے۔

"کیا گیٹ وک تک پیدل ہی جانے کا ارادہ ہے؟" نٹ پاتھ پر آکر ویرا نے طنز سے پوچھا۔

"بس اور پھر بس یا بس اور پھر نان اسٹاپ ٹرین۔ بولو، کیا چاہتی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"پہلے وکٹوریا پہنچو پھر ٹرین لیں گے۔ خالی پیٹ میں زیادہ دور نہیں چل سکتی۔"

"خرافات مت بکو۔" میں نے منہ بنا کر کہا "کنواری لڑکیوں کے پیٹ بھر جائیں تو لوگ انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ خاموشی سے چلتی رہو۔ بس اسٹاپ زیادہ دور نہیں ہے۔"

"خدا خیر کرے۔ آج صبح ہی صبح تمہاری زبان چل پڑی ہے۔ پتا نہیں دن کیسا گزرے گا۔"

"یہ بہت مبارک دن ہے۔ بدری امریکا جا چکا، راوا لے اپنے چہروں پر رمیش اگروال کی چتا کی راکھ مل رہے ہیں، تمہارا اپنا عاشق مارا گیا، سلطان شاہ تھوڑی سی ٹوٹ پھوٹ کے بعد زندہ لوٹ آیا اور اب ہم امریکا جا رہے ہیں۔ بہت عرصے کے بعد میں اپنے ذہن کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔"

"چاہو تو اگلی پچھلی ساری کامیابیوں کو بھی آج کے دن میں شمار کرلو۔"

"بازار میں سوٹ کیسوں کے ساتھ ہمارا یوں ایک ساتھ گھومنا مناسب نہیں ہے۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "میں آگے نکل رہا ہوں۔ تم تھوڑے فاصلے سے آتی رہو۔"

اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے میں نے اپنی رفتار تیز کردی اور آگے چلا گیا۔

اس وقت مجھے صرف اور صرف ان غنڈوں کی طرف سے تشویش تھی جو آئزک بیل کے ایما پر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا صورت آشنا نہیں تھا لیکن انہیں یہ بات ضرور بتادی گئی ہوگی کہ ویرا لائیڈ بھی میرے ساتھ ہوسکتی تھی۔ یہ بات پھر اسی نکتے پر آجاتی تھی کہ ایشیائی مرد اور سفید فام عورت پر مشتمل ہر جوڑا ان غنڈوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا۔ شہر میں ایک دوسرے سے الگ رہ کر ہم ایسے کسی بھی خطرے کو آسانی سے ٹال سکتے تھے۔

اس وقت شہر کے اس مرکزی حصے میں روزگار پر جانے والوں کے ہجوم تیزی سے حرکت میں تھے۔ ہر شخص ایسی عجلت میں تھا، جیسے اسے اپنی ٹرین چھوٹنے کا ڈر ہو۔ دور ہی سے نظر آرہا تھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے زیر زمین ٹیوب اسٹیشن سے لوگوں کے بڑے بڑے ریلے نکل کر اس رواں ہجوم میں شامل ہو رہے تھے۔

مطلوبہ بس میں سوار ہوکر میں ٹکٹ لے رہا تھا تو ویرا بھی آگئی اور ہم دونوں لندن کے الوداعی نظاروں کا لطف لینے کے لیے ڈبل ڈیکر کی اوپری منزل پر جا بیٹھے۔

لندن کی شہری ٹرانسپورٹ کی ایک خوبی یہ ہے کہ بسیں بالکل خالی ہوں یا بھری ہوں، وہ اپنے شیڈول سے چلتی ہیں۔ مسافروں کے انتظار میں رکا جاتا ہے، نہ مسافروں کو ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھنے کے بیہودہ احکام دیے جاتے ہیں۔ ٹکٹ خریدنے والا ہر مسافر خود کو پوری بس کا امانت دار تصور کرتا ہے۔ دوسروں کے لیے راستہ چھوڑ کر اپنی پسند اور سہولت کی جگہ بیٹھتا یا کھڑا ہوتا ہے۔ کوئی یہ توقع نہیں کرتا کہ اسے وہاں سے ہلانے یا ہٹانے کی کوئی کوشش کامیاب ہوگی۔

ریجنٹ اسٹریٹ اور پکاڈلی سے ہوتی ہوئی وہ بس تھوڑی ہی دیر میں وکٹوریا اسٹیشن پہنچ گئی جو مرکزی لندن میں چلنے والی بیشتر مقامی بسوں کا آخری اسٹاپ ہے۔ یہیں سے ملک کے دوسرے حصوں اور دور دراز مقامات کے لیے بیشتر کوچز شروع ہوتی ہیں۔

وکٹوریا اپنے نام کے مطابق قدیم طرز تعمیر پر بنا ہوا ہے۔ وہاں سے ایک مقررہ وقفے کے بعد لندن کے گیٹ وک ایئر پورٹ کے لیے نان اسٹاپ ٹرین روانہ ہوتی ہے جو اس سفر کا سب سے تیز رفتار اور یقینی ذریعہ ہے۔ بس اپنے روٹ پر کسی بڑے ٹریفک جام میں پھنس جائے تو پرواز نکل جانے کے خاصے روشن امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ بیشتر تجربے کار مسافر ٹرین ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

ٹرین کی طرف جاتے ہوئے میں نے گیتا کا اخبار میں لپٹا ہوا ریوالور احتیاط سے ایک بھرے ہوئے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ٹرین روانہ ہونے تک ہمارے ڈبے کی بیشتر نشستیں خالی رہیں۔ وہ سفر شاید چالیس منٹ تک جاری رہا۔ ٹرین رکنے پر ہم پلیٹ فارم پر اتر گئے۔

سہولتوں کے اعتبار سے لندن کا ہیتھرو ایئر پورٹ کی طرح کم نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ پرانا ہوائی اڈا ہے اور گیٹ وک اس سے کہیں بعد میں تعمیر ہوا ہے۔ اس نئے ہوائی اڈے کے دو ٹرمینل ہیں۔ اوپر نیچے آنے جانے کے لیے برقی سیڑھیاں اور لفٹ نصب ہیں۔ دونوں ٹرمینل ایک برقی شٹل سروس کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ شٹل کسی معاوضے کے بغیر مسافروں کو ان کی ضرورت کے مطابق سامان سمیت ایک سے دوسرے ٹرمینل تک پہنچاتی ہے۔

ٹرین چھوڑنے کے بعد جا بجا نظر آنے والے رہنما اشاروں اور الفاظ کے سہارے ہم دونوں اس اجنبی ایئر پورٹ پر اپنے مطلوبہ ٹرمینل کے چیک ان ایریا میں پہنچ گئے جہاں دور تک بہت سی ہوائی کمپنیوں کے روشن اور صاف ستھرے کاؤنٹر پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ خالی تھے۔ بیشتر پر باوردی لڑکیاں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ فضا میں بے شمار کی بورڈز کی مشینی ٹکاٹک کی ہلکی آوازیں رچی ہوئی تھی۔

پروازوں کے دیوار گیر شیڈول پر نظر ڈالتا ہوا میں امارات...... ایئر لائن کے کاؤنٹر کی طرف چل دیا۔ ویرا راستے بھر ناشتے سے محرومی پر احتجاج کرتی رہی تھی مگر میرے لیے ٹکٹ پر قبل از وقت اسٹکر لگوا کر نشستیں محفوظ کرانا زیادہ ضروری تھا۔

ہماری پرواز ورجن اٹلانٹک ایئر لائن کی تھی لیکن بکنگ امارات کے ذریعے ہوئی تھی۔ مجھے ورجن اٹلانٹک کا کاؤنٹر نظر آیا تو میں وہیں رک گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لڑکی کمپیوٹر نمبر اور ٹکٹ دیکھ کر مجھے امارات سے رجوع کرنے کا مشورہ دے گی مگر اس نے پیشانی پر شکن ڈالے بغیر اپنے کی بورڈ پر مخروطی انگلیاں گھمائیں اور چند ثانیوں تک انتظار کرتی رہی۔ اسکرین پر تفصیلات کے نمایاں ہوتے ہی اس نے مسکرا کر مجھ سے سامان کے بارے میں پوچھا۔ میں نے دونوں سوٹ کیس وزن کرنے والی مشین پر رکھ دیے۔

گز بھر قطر کے ڈائل پر سوئی ذرا سی جنبش کرکے رہ گئی تو لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ میں ان استفہامیہ نظروں کا مطلب سمجھ کر فوراً بول پڑا "کل یہی سامان ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔ ٹکٹ مشین میں ڈالر اندراجات کرنے کے بعد اس نے کوپن الگ کیے، کمپیوٹر پر بورڈنگ کارڈ بنانے سے پہلے نشستوں کے بارے میں بے لگے بندھے سوال پوچھے۔ جتنی دیر میں بورڈنگ کارڈ بنے، اس نے بیگیج ٹیگ سمیت ٹکٹ مجھے لوٹا دیے۔ پاسپورٹوں پر امریکی ویزا اس نے سب سے پہلے دیکھے تھے جو اس نے بورڈنگ کارڈ کے ساتھ واپس کر دیے۔ لوڈر سوٹ کیس ٹیگ لگا کر متحرک بیلٹ پر ڈال چکا تھا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے پلٹا ہی تھا کہ امارات کا بورڈ بھی نظر آیا۔ ویرا اس دوران میں الگ تھلگ کھڑی رہی تھی۔ اس کے چہرے سے بےزاری جھلک رہی تھی۔

''اب ناشتے کا بندوبست کرو ورنہ میں یہیں بیٹھ جاؤں گی۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''کام ختم ہوگیا۔ اب بس کھانا پینا یا فون کرنا ہے۔ آؤ اوپر لاؤنج میں چلتے ہیں۔''

چیک ان ایریا میں بھی ایک ریستوران نظر آرہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ لاؤنج میں ناشتا زیادہ بہتر رہے گا۔ اوپر کے روشن اور وسیع ہال میں زندگی کی رونقیں اپنے شباب پر تھیں۔

ہم دونوں ہال کے ایک سرے پر واقع ریستوران میں جا بیٹھے۔ چند منٹ بعد مجھے احساس ہوا کہ وہاں پھرتا ہوا باوردی عملہ صرف صفائی اور جھوٹے برتن سمیٹنے کے لیے مامور تھا۔ کھانے پینے کے لیے سیلف سروس کاؤنٹر پر پیشگی ادائیگی ضروری تھی۔

ویرا کو ناچار ایک مرتبہ پھر اٹھنا پڑا۔ اپنی پسندیدہ چیزوں کی رقوم ادا کر کے ہم دوبارہ اسی میز پر آ بیٹھے۔

''اس وقت تم بھرے ہوئے پیٹ والی عورتوں جیسی اداکاری کر رہی ہو۔'' اپنے ناشتے سے انصاف کرتے ہوئے میں اس پر وہ فقرہ کسے بغیر نہ رہ سکا۔

''مجھ میں ہنسنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ سکون سے ناشتا کر لینے دو۔''

میں نے بہت تیزی کے ساتھ اپنا مختصر ناشتا ختم کیا اور اٹھ گیا۔ ''تم یہیں میرا انتظار کرو۔ میں انقرہ والے کو فون کر کے واپس آتا ہوں۔ اس کے لیے میرے ذہن میں سوالوں کا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ دور ہی سے نظر آنے والے اشاروں سے میں فون کی جگہ دیکھ چکا تھا۔ وہاں متعدد بوتھ لگے ہوئے تھے جن میں سے کئی خالی تھے۔ اس وقت مجھے ساری گفتگو اردو میں کرنی تھی اس لیے رازداری کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے ایک خالی بوتھ پر قبضہ کر لیا۔

''مہمان اسپتال میں زیر علاج ہے۔'' میری آواز پہنچانتے ہی ایوب آغا نے بولنا شروع کر دیا ''اسے لانے والے ہواباز کی حالت بھی بگڑ گئی ہے۔ اسے انقرہ کے امریکن اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔''

''اس وقت تم اختصار سے کام لینے کے بجائے کھل کر بات کر سکتے ہو...... اگر ہواباز بیمار ہے تو وہ جہاز ابھی تک ائربیس پر ہی موجود ہوگا؟''

''نہیں، کرنل فل برائیٹ پہلے ہی متبادل کریو کا بندوبست کر چکا تھا۔ مہمان کو اتارنے کے نصف گھنٹے بعد وہ طیارہ کسی نامعلوم منزل کے لیے پرواز کر گیا تھا۔''

''کرنل فل برائیٹ کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ امریکی مشن میں سیکیورٹی چیف ہے۔ شبہ ہے کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔''

''مہمان کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ وہ کیسا ہے اور ڈاکٹر اس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کب تک پاکستان واپس آجائے گا؟''

''وہ کمزور اور بیمار ہے۔ اس کے پورے بدن پر تشدد کے نشانات ہیں جن سے کافی خون ضائع ہوا ہے۔ کمزوری اور تھکن کی وجہ سے وہ بخار اور ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس کے ذہن پر اغوا کی دہشت ایسی بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ غفلت اور مدہوشی کے عالم میں ایسے باتیں کرنے لگتا ہے جیسے وہ اب بھی جہاز پر قابض ہو اور دشمنوں سے لڑ رہا ہو۔ ڈاکٹروں نے اس سے چھیڑ چھاڑ سے منع کیا ہے۔ جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو جاتا، اسے ہوائی جہاز کی آوازوں سے دور رکھنا ہوگا۔ وہ آوازیں سنتے ہی اس پر دوبارہ دہشت کا حملہ ہو سکتا ہے۔ افاقے سے پہلے وہ جہاز میں سفر نہیں کرے گا۔''

''وہ اتنی بری حالت میں ہے تو اس نے جہاز اور قیدیوں پر کیسے قابو پایا تھا؟''

''یہ حیران کن بات ہے کہ اس نے آخر تک کوئی غلطی نہیں کی۔ شاید زندہ رہنے کی شدید خواہش اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔''

''انقرہ میں اسے یقین آگیا تھا کہ وہ رہا ہونے والا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے میگافون پر دیر تک اسے یقین دلایا۔ اردو میں گفتگو نے زیادہ اثر دکھایا اور اس نے مجھے ایک غیر مسلح آدمی کے ساتھ جہاز پر آنے کی اجازت دے دی۔''

''دوسرا غیر مسلح آدمی کون تھا۔''

''کرنل فل برائیٹ۔ بیس کمانڈر نے طیارہ اترنے سے پہلے ہی اسے غیر مسلح کرا لیا تھا۔''

''اور اس نے ہتھیار اتارنے میں کوئی حیل وحجت نہیں کی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس نے اسے اپنی توہین قرار دیا اور کافی شور مچایا لیکن بیس کمانڈر نے دوسری صورت میں اسے جہاز پر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔''

''جہاز پر اس کی کیا ضرورت تھی۔''

''جہاز پر موجود دونوں امریکیوں اور کارگو کی دیکھ بھال اسی کی ذمے داری تھی۔ اس کے ایما پر جہاز کو تازہ دم عملے کے ساتھ پرواز کی اجازت دی گئی تھی۔ اس دوران میں اس نے فون پر اپنے بڑوں سے کچھ خفیہ ہدایات بھی لی تھیں۔''

''یہ سب تمہارے سامنے ہی ہوتا رہا تھا؟'' میرے لیے وہ تفصیل دلچسپ ثابت ہو رہی تھی۔

''میں اس سے پہلے بیس کمانڈر کے دفتر میں موجود تھا۔ سرسری تعارف پر اس کا رویہ سرد اور مخاصمانہ تھا۔ تعارف کے بعد اس نے بیس کمانڈر سے تخلیہ چاہا تو اس نے معذرت کر کے تھوڑی دیر کے لیے انتظار گاہ میں بھیج دیا۔ اسی دوران میں اسے غیر مسلح کر دیا گیا۔''

''اور تم آخر تک مہمان خانے میں بیٹھے رہے؟'' میں نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں، نہتا ہونے کے بعد وہ بھی انتظار گاہ میں بھیج دیا گیا۔ دونوں میں برابری برقرار رکھنے کے لیے بعد میں بیس کمانڈر وہیں آ کر ہم دونوں سے بات چیت کرتا رہا۔''

''پھر یہ ہدایات لینے کا سلسلہ کب شروع ہوا؟''

''کمانڈر کے پی اے کے فون سے اس نے تین مرتبہ کہیں بات کی تھی۔ ہر بار گفتگو کسی نامانوس یا شاید خفیہ زبان میں ہوئی تھی۔ معاملے کی رازداری برقرار رکھنے کے لیے مشن کے بڑے...... ائربیس پر نہیں آئے تھے مگر سب کی نظریں اس پرواز پر لگی ہوئی تھیں۔''

''مہمان سے میری گفتگو کب تک ہونے کا امکان ہے؟'' میں نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

''اس کا انحصار ڈاکٹروں کی اجازت پر ہے۔'' اس کے لہجے سے معذوری عیاں تھی ''اول خان نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے کسی زبردست حکمت عملی سے کام لے کر اپنا آدمی موت کے منہ سے نکالا ہے۔ میں خود بھی اس کی کہانی سننے کے لیے بےچین ہوں۔''

''انقرہ میں تم ہی اس کے دوست اور خبرگیر ہو۔ اسے دشمنوں کے کسی جوابی وار سے بچانا اب تمہارا ہی فرض ہے۔ مجھے فخر ہے کہ ہمارے درمیان ابھی تم جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔''

''میں اپنی آنکھیں کھلی رکھوں گا مگر ترک بھی ہمارے خیرخواہ ہیں۔ قبرص سے انہیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ انقرہ میں ایک غیر قانونی پاکستانی مسافر اور مجرم کو آف لوڈ کرنا ہے مگر میں نے بیس کمانڈر کو پورا پس منظر بتا دیا تھا۔ اس کی پوری ہمدردیاں مہمان کے ساتھ ہیں۔''

''اگر میرا نام اس کے علم میں آچکا ہے تو میری طرف سے بھی اس کا شکریہ ادا کر دینا۔''

''تمہارا نام آئے بغیر کہانی ادھوری رہتی۔ وہ تم سے بات کرنے کا متمنی ہے۔''

''اب میں امریکا کی راہ پر ہوں۔ وہاں قدم جم گئے تو تم سے نمبر لے کر کمانڈر سے بھی بات کر لوں گا۔''

''امریکا؟'' اس کی بےساختہ تحیر زدہ آواز سنائی دی ''وہاں تم دشمنوں میں گھر جاؤ گے۔''

''ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو لگام دینے کے لیے یہ ضروری ہوگیا ہے۔''

''خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ یہ مغرور قوم کسی بڑی تباہی کے بغیر نہیں سدھرے گی۔''

''چند شیطانی دماغ فنا کے گھاٹ اتر جائیں تو ان کی بڑھتی ہوئی چیرہ دستیاں کم ہو سکتی ہیں۔ میں دامن بچا کر صرف ان ہی کو اپنا نشان بناؤں گا۔ تمہاری دردمندی میرے لیے باعثِ احترام ہے۔''

وہ مجھ سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن میرا گرویدہ ہو چکا تھا۔ گفتگو کرنے کی آزادی مل جانے کی وجہ سے وہ باتوں کو طول دیتا رہا اور آخرکار مجھے پرواز اناؤنس ہونے کا عذر کر کے فون بند کرنا پڑ گیا۔

آئزک بیل نے سلطان شاہ کی واپسی میں کلیدی کردار ادا کر کے میرے اوپر کوئی احسان نہیں کیا تھا بلکہ اپنی اور اپنے ملک کی ساکھ کو بچانے کے لیے ایک ناگوار فیصلہ کیا تھا جس سے گریز کی صورت میں اسے ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا رہا تھا۔

یہ وہ سوچ تھی جس کے بیج میں نے اس کے ذہن میں بوئے تھے حالانکہ میرے پاس اپنی کہانی کا کوئی گاہک تھا نہ خریدار۔ میں نے آئزک بیل سے جو کچھ کہا وہ اندھیرے میں چلایا ہوا ایک تیر تھا جو میری خوش نصیبی اور اس کی بدنصیبی سے بالکل ٹھیک نشانے پر جا بیٹھا تھا۔

میری باتوں کے مکروفریب میں الجھ کر وہ جو کچھ کر گزرا تھا، وہ میری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ ایک شریف دشمن کی طرح میری دلی خواہش تھی کہ آخر تک بے یقینی کے دھڑکوں میں مبتلا رہنے کے بعد حاصل ہونے والی اپنی کامیابی پر میں کھلے دل سے آئزک بیل کا شکریہ ادا کروں کہ اس نے مصالحت اور بیخ کنی کی راہوں پر بیک وقت پیش رفت کرتے ہوئے آخری لمحات پر بہت خوبی سے اپنا وعدہ وفا کیا تھا۔

میں وہاں کھڑا ذرا سی دیر تک سوچتا رہا۔ آئزک بیل میرا ایک زخم خوردہ دشمن تھا۔ مجھ سے مذاکرات کرتے ہوئے بھی وہ میرے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوششیں کرتا رہا تھا۔ اگر میں اس وقت تشکر کے اظہار کے لیے اسے فون کرتا تو وہ اپنے معمول کے مطابق یہ سراغ لگا لیتا کہ میں گیٹ وک کے کسی بوتھ سے بات چیت کر رہا تھا۔ یہ ذرا سا نکتہ میرا سارا کھیل بگاڑ سکتا تھا۔

میں نے اسے بتایا تھا کہ میں چند روز بعد لندن سے امریکا پہنچنے والا ہوں۔ گیٹ وک لندن کا کوئی عام شہری بازار یا علاقہ نہیں تھا۔ وہ صرف اور صرف ایک دور افتادہ فضائی مستقر تھا۔ گیٹ وک کا نام سامنے آتے ہی آئزک بیل سمجھ لیتا کہ میں کسی سفر پر تلا بیٹھا ہوں اور پھر امریکا میں میرے لیے رکاوٹیں پیدا کرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

میں نے نیویارک پہنچنے تک اسے فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر اول خان میرے دوستوں میں سے تھا۔ انقرہ کی سرزمین پر ایوب آغا جیسے بے لوث آدمی کی خدمات مہیا کر کے اس نے سلطان شاہ کی آزادی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا تھا لیکن وہ اس معاملے کی تفصیلات سے بے خبر تھا۔

وہ اس کے دفتری اوقات تھے۔ لندن کا آخری فون کارڈ وہیں ٹھکانے لگانے کے خیال سے میں نے اس کے دفتر کا فون ملایا تو اس کے اسٹینو کی آواز سنائی دی۔

اسے کبھی میرا نام پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میری آواز پہچانتے ہی اس نے بتایا کہ اول خان سفری دستاویزات کے بغیر سلطان شاہ کی انقرہ سے واپسی کا بندوبست کرنے کے لیے محکمہ داخلہ کے کسی افسر سے ملنے گیا ہوا تھا۔

''میں ہوائی اڈے سے بول رہا ہوں۔ اسے بتا دینا کہ اب میں نیویارک پہنچنے کے بعد فون کروں گا۔'' میں نے اسے پیغام دیا۔

''مگر سر......!'' وہ روانی میں کچھ کہتے کہتے اچانک ہی خاموش ہو گیا۔

''بولو، بولو۔ خاموش کیوں ہو گئے۔ تم سے تو آج کل ویسے ہی بہت کم بات ہوتی ہے۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ فطرت کے اعتبار سے میں اسے پسند کرتا تھا۔

''آپ سفر پر جا رہے ہیں۔ ایسے میں کوئی بدشگونی اچھی نہیں لگتی۔ کیا اس وقت آپ کا امریکا جانا بہت ضروری ہے؟''

اس نے بھی وہی بات کہی جو ذرا سی دیر پہلے ایوب آغا کہہ چکا تھا۔

''میں وہاں تفریح کے لیے نہیں ایک ناگزیر ضرورت کے تحت جا رہا ہوں۔ تم میری کامیابی کے لیے دعا کرتے رہنا۔'' میں توہم پرست نہیں ہوں لیکن آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک وسوسے نے سر ابھارا کہ کہیں ان کی زبانیں نقارۂ خدا بن کر مجھے آنے والے برے وقت سے آگاہ تو نہیں کر رہیں؟

کارڈ میں بائیس یونٹ باقی تھے۔ میں فون بند کر کے ریستوران کی طرف چل دیا۔

ویرا ناشتے سے فارغ ہو کر بہت فن کارانہ انداز میں سگریٹ نوشی سے محظوظ ہو رہی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی اس کی زبان چل پڑی۔ ''فون کر رہے تھے یا کونوں کھدروں میں تاک جھانک کرتے پھر رہے تھے؟''

''اپنی حرکتیں میرے سر نہ تھوپو۔ راما کا کی بیوی کی ٹوہ میں کون لگا ہوا تھا؟''

''اب اس کا نام نہ لینا۔'' اس نے سگریٹ کا دھواں میرے چہرے پر اگلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ''اس کا نام کسی بھی وقت اخبارات کی شہ سرخیوں کی زینت بن سکتا ہے۔''

''اگر تمہاری نقاہت دور ہو گئی تو لاؤنج کا چکر لگا لیں۔ یہاں لدی پھندی دکانیں نظر آ رہی ہیں۔''

''دکانیں ہی چھاننی ہیں تو ڈیوٹی فری الکحل شاپ میں چلو۔ وہاں سے کچھ بوتلیں ہی لے لیں گے...... اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس سے بات کر کے آئے ہو؟''

''ایوب آغا...... سلطان شاہ انقرہ کے فوجی اسپتال میں ہے اور اس کی حالت بہت خراب ہے۔''

''وہ جس حال میں بھی ہے، زندہ تو ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولی ''وہ لوگ اسے لڈو کھلانے کے لیے نہیں لے گئے تھے۔ اس کے ساتھ جو کچھ نہ ہوتا، کم تھا۔ غنیمت یہ ہے کہ وہ زندہ لوٹ آیا اور ہفتے عشرے میں صحت یاب بھی ہو جائے گا جسے آئزک بیل نہ مار سکا اسے چھوٹے موٹے زخم کیا ماریں گے۔''

بظاہر ویرا کی وہ باتیں سخت اور بے رحمانہ تھیں لیکن حقیقت سے بہت قریب تھیں۔

''پتا نہیں اس حالت میں وہ جہاز پر قبضہ کر کے اپنا کنٹرول برقرار رکھنے میں کیسے کامیاب رہا۔'' میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ''اس وقت وہ سفر کے بھی قابل نہیں ہے۔ بخار اور دہشت میں ہذیان بک رہا ہے۔''

''انسان میں زندہ رہنے کی امنگ ہر خوف اور بیماری سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ یہ زندہ ہو تو وہ ہر کارنامہ انجام دے دیتا ہے۔ جب تک اس کی جان کو خطرہ لاحق تھا اس کی یہ حیوانی قوت اس کی ساری کمزوریوں پر غالب رہی، پناہ اور سہارا ملتے ہی وہ بکھر کر اپنی اصل حالت میں آ گیا۔''

''یہ اچھا ہے کہ وہ کچھ دن کے لیے کراچی سے دور رہے گا۔ وہاں لوٹتے ہی اسے سازشوں اور جوابی حملوں سے بچاؤ کے لیے جدوجہد میں مصروف رہنا پڑتا۔ اسے آرام مل جائے گا اور کچھ عرصے کے لیے ہم ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔''

وہ اپنا پرس سنبھال کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں لاؤنج کی طرف چل دیے۔

لاؤنج بہت وسیع ہونے کے باوجود ملک ملک کے مسافروں اور ہوائی اڈے پر مختلف خدمات انجام دینے والے اداروں کے ملازمین سے بھرا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی دھن میں مگن تھا۔ کچھ لاابالی مسافر مرکزی نشستوں پر براجمان گرد و پیش کے تماشوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

گیٹ وک پر ہمیں ڈیوڈ اسٹارز کے کھوجیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ سگریٹ اور الکحل والے وسیع اسٹور میں پہنچ گئے جہاں مسافر مرد و زن پراشتیاق انداز میں اپنی اپنی پسند کے برانڈ خرید رہے تھے۔

ویرا کو امریکا کے لیے ان اشیاء کے ڈیوٹی فری الاؤنس زبانی یاد تھے۔ اس نے ہم دونوں کے کسٹم فری کوٹے کے حساب سے خریداری مکمل کی، کیش ٹلر پر بورڈنگ کارڈز دکھا کر رقم کی ادائیگی کی اور باہر آ گئی۔ اس

کے ہاتھ میں بیگ موجود تھا، میں نے وہ تھیلی سنبھال لی۔

''تمہیں خالی ہاتھ دیکھ کر عجیب سا لگ رہا ہے۔''

وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی'' لمبے سفر پر جانے والے مسافروں کے ہاتھ میں بریف کیس یا سفری بیگ کی موجودگی فیشن بن چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہیں سے کوئی اچھا سا بریف کیس یا بیگ خرید لو۔ یہ بوتلیں اس میں سما جائیں گی۔''

اس کی وہ تجویز غلط نہیں تھی۔ اسی فلور پر ایسی ہنگامی ضرورت کی اشیا سے بھری ہوئی ایک دکان موجود تھی۔ وہاں سے بریف کیس خرید کر میں نے سگریٹ کے کارٹن اور بوتلیں اسی میں جمالیں۔

ائرپورٹ کی انتظارگاہ میں بے فکری سے فاضل وقت گزارنے کا وہ تجربہ بہت خوش گوار رہا۔ اپنی مختصر سی خریداری کے بعد میں آرام دہ صوفے پر دراز ہوگیا۔ ویرا ٹہلتی ہوئی آگے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں اخبار دبا ہوا تھا۔

''یہ کام میں نے جہاز کے لیے چھوڑا ہوا تھا۔ تم دیکھ ہی چکی ہو کہ دوران سفر سونا میرے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے میں اسکاچ یا شیمپین کا گلاس اور ایک اچھا اخبار بہترین معاون ثابت ہوتا ہے۔''

''جب تک ہم یہاں ہیں، واقعات سے باخبر رہنے کے لیے اخبار ضروری ہیں۔''

''تھوڑی دیر بعد ہم یہاں نہیں ہوں گے۔ اخبار میں اب کیا رکھا ہوگا۔ ابھی تک ہمیں کہیں بھی نہیں روکا گیا۔ امیگریشن والی نے بھی بلاتعرض اخراج کی مہر لگادی تھی۔''

''بعض اوقات یہ خوش فہمیاں خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ خبروں پر سرسری نظر ڈال لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ ہوٹل کا اخبار تو کھولے بغیر وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔''

ویرا نے اخبار کا مطالعہ شروع کردیا اور میں سگریٹ سلگا کر ایک مسافر جوڑے کے دو بچوں کی شرارتوں سے محظوظ ہونے لگا۔ وہ اپنے ماں باپ سے بے پروا چمک دار فرش پر بیٹھے ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھوک میں مصروف تھے۔

کچھ دیر بعد ہی پروازوں کی روانگی کے خودکار بورڈ میں تیزی سے تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ وہ سلسلہ ختم ہونے پر حروف اور ہندسے ساکت ہوئے تو آخری سطر میں سے نکل کر ہماری پرواز کا نمبر کافی اوپر جا چکا تھا۔ اس کے آگے سبز بلب جل بجھ رہا تھا اور متعلقہ خانے میں بورڈنگ شروع ہونے کی اطلاع درج تھی۔

ویرا بدستور اخبار چاٹنے میں منہمک تھی لیکن اس وقت تک اس نے کسی خاص خبر کی موجودگی کا انکشاف نہیں کیا تھا۔

''بورڈنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔'' میں نے ویرا کو ٹھوکا دے کر کہا۔ ''کیوں نہ یہاں کے بجائے جہاز میں ہی بیٹھا جائے۔ یہاں سے پوری طرح نکل جانے کا احساس ذرا قوی ہو جائے گا۔''

''کیا تمہارے ذہن میں پھر کوئی فتور سر ابھار رہا ہے؟'' اس نے اخبار چھوڑ کر اشتباہ آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''فتور کی ابتدا ایوب آغا نے کی تھی۔ اسے تقویت تم نے دی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے بے پروائی سے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ ''یہ کس فتور کی بات کر رہے ہو؟''

''ایوآغا اور پھر اول خان کے اسٹینو نے مجھے امریکا کے سفر سے گریز کا مشورہ دیا تھا اور ابھی تم خطرناک خوش فہمیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ اخبار اس بارے میں کیا کہتا ہے؟''

''اخبار میں کوئی پر تشویش بات نہیں ہے لیکن تم یہاں بے آرامی محسوس کر رہے ہو تو جہاز ہی میں چلے چلتے ہیں کیونکہ اس......سرزمین سے اب ہمارا وہی آخری رابطہ رہ گیا ہے۔ ایک بار طیارے نے رن وے چھوڑ دیا تو یہاں کے سارے مسائل بھولی ہوئی کہانیوں میں بدل جائیں گے۔''

میں نے جیب سے بورڈنگ کارڈ نکال کر اپنی پرواز کا گیٹ نمبر دیکھا اور پھر ہم دونوں وہاں سے اٹھ

گئے۔

یورپ اور امریکا کے مشرقی ساحلوں کے درمیان طویل ٹرانس اٹلانٹک پروازوں کے لیے چھوٹے طیاروں کا تجارتی استعمال کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ کم طاقت والے انجنوں اور ایندھن کی ناکافی گنجائش ہونے کی وجہ سے ایسے جہاز بحراوقیانوس میں بکھرے ہوئے غیر معروف اور چھوٹے جزائر پر بار بار اترے اور وہاں سے مزید ایندھن لیے بغیر امریکا کی سرزمین تک نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے بورڈنگ کارڈز پر جہاز تک رسائی کے لیے جس گیٹ کا نمبر درج تھا وہاں صرف ایک حسین اور مسکراتی ہوئی باوردی خاتون کھڑی تھی۔ اس نے اپنے رنگ و روپ اور قامت و جسمات کو کچھ ایسے قرینے سے سنبھالا ہوا تھا کہ اسے لڑکی سے عورت تک کچھ بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ اوپر دروازے پر لگے ہوئے الیکٹرانک بورڈ پر ورجن اطلانتک کی پرواز کی تفصیلات درج تھیں لیکن وہاں کوئی بھیڑ بھاڑ یا قطار نہیں تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ شاید ہم کسی چھوٹے جہاز سے پیرس، ایمسٹرڈم یا فرینکفرٹ کی مختصر سی پرواز پر جارہے ہوں۔

ہم دونوں کو اپنی طرف پیش قدمی کرتے دیکھ کر اس عورت یا لڑکی کے پتلے پتلے اور گلابی مترنم ہونٹوں پر جمی ہوئی مسکراہٹ دعوت انگیز حد تک گہری ہوگئی۔

''گڈ مارننگ سر!'' اس نے میرے ہاتھ سے بورڈنگ کارڈز لیتے ہوئے مترنم انگریزی میں کہا۔ میں نے احتیاطاً دونوں پاسپورٹ بھی ہاتھ میں لیے ہوئے تھے لیکن اس خاتون نے ہمارے پاسپورٹ چھونے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ بورڈنگ کارڈز دیکھتے ہوئے خوش اخلاقی سے بولی ''میں ورجن کے مہمانوں کو خوش آمدید کہتی ہوں۔''

انگریزی میں کہا ہوا وہ فقرہ ذومعنی بھی ہوسکتا تھا۔ فوراً ہی ویرا کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور اس نے قدرے حیرت سے کہا ''ورجن؟ تو کیا تم ابھی تک غیر شادی شدہ ہو؟''

خوش اخلاقی اور بے تکلفی کے درمیان ایک نازک سی حد فاصل ہوتی ہے اور روایت پرست انگریز اس کا خیال رکھتے ہیں۔ ویرا کے سوال پر اس خاتون کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا رنگ آکر گزر گیا۔ اس کی پیشہ ورانہ تربیت اس کی ذاتی پسند اور ناپسند پر غالب آچکی تھی۔ اس نے نرمی اور شائستگی سے کہا۔ ''میں نہ صرف شادی شدہ ہوں بلکہ دو بچوں کی ماں ہوں۔ میں اپنے، اپنی ایئر لائن کے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی کیونکہ یہاں میں اسی کی نمائندگی کرتی ہوں۔''

''اوہ! کاش تم نے یہ وضاحت نہ کی ہوتی۔ خوش شکل اور زندہ دل لوگوں کا مہمان بن کر دل کو عجیب سی راحت ملتی ہے۔ ویسے بھی مہمان، صرف مہمان ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر آگے روانہ ہوجاتا ہے اور پھر جس مہمان کے ہاتھ میں بورڈنگ کارڈ ہو، وہ بلائے جان کبھی نہیں بنتا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

ویرا کے بونگے سوال کے نتیجے میں اس کے چہرے پر طاری ہونے والی خفت میرے مذاق سے کافور ہوگئی اور وہ شوخی سے بولی ''میں ورجن اطلانتک کی زمینی میزبان ہوں۔ دوران پرواز مجھ سے بہتر لڑکیاں تم دونوں کی دیکھ بھال کریں گی۔ میری میزبانی کے شوق میں تم امریکا جانے کے بجائے یہیں رک کے رہ جاؤ گے۔''

اس نے بورڈنگ کارڈز کا ایک حصہ پھاڑ کر بقیہ کارڈز ہماری طرف بڑھا دیے ''میں تمہارے محفوظ اور خوش گوار سفر کی متمنی ہوں۔''

وہ اس کا الوداعی فقرہ تھا جسے مکمل کرتے ہی وہ میرے شانوں کے پیچھے دیکھنے لگی۔ شاید اس پرواز کے کچھ اور مسافر گیٹ کی طرف آرہے تھے۔

ہم دونوں گیٹ سے گزر کر اس بند اور چوکور ٹیلی اسکوپک گینگ وے میں داخل ہوگئے جو لاؤنج کو براہ راست جہاز سے ملا رہا تھا۔

''اچھے اداروں میں پبلک ڈیلنگ کے شعبوں میں کام کرنے والی عورتیں خود کو ہمیشہ اس طرح سنبھال کر رکھتی ہیں کہ کئی کئی بچوں کی ماں ہوکر بھی دور سے لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں۔'' اس خم دار راستے میں کچھ دور بڑھ آنے کے بعد ویرا بولے بغیر نہ رہ سکی۔

اس کی بقراطیت پر میں چڑ گیا ''یہ ان کی اور ان کے آجروں کی مجبوری ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تب بھی انہیں پبلک ڈیلنگ سے ہٹا کر کسی ایسے کونے کھدرے میں لگا دیا جاتا ہے جہاں وہ فائلوں اور کاغذوں کے انبار میں دفن ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن یہ مان لو کہ تم نے اس کی دل آزاری کی تھی۔ قریب سے اور غور سے دیکھنے پر ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ خاصی پختہ عمر کی عورت ہے۔''

''میں نے اسے اسی حقیقت کا احساس دلایا تھا ورنہ وہ کسی دل پھینک لڑکی جیسی حرکتیں کررہی تھی اور مجھے زہر لگ رہی تھی۔''

''یہ تم بھی جانتی ہو کہ عورت کو اس کی صحیح عمر کا احساس دلانا گالی سے کم نہیں ہوتا۔''

''تم اس طرح اس کی وکالت کررہے ہو جیسے اس سے تمہاری پرانی آشنائی رہی ہو۔''

''سچ بولنے کے لیے کسی تعلق یا آشنائی کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔''

''میں نے کب جھوٹ بولا؟ یہ تو تم کہہ رہے ہو کہ عورت کو اس کی صحیح عمر کا احساس دلانا گالی سے کم نہیں ہوتا...... بلاوجہ مجھے جھوٹ بولنے اور منافقت سے کام لینے کی ترغیب دے رہے ہو۔''

''تمہارا خالی پیٹ بھر چکا ہے اس لیے اب تمہاری کھوپڑی چل پڑی ہے۔ تمہارے منہ لگنا بے کار ہے لیکن اتنا سمجھ لو کہ لوگوں سے اس طرح الجھ کر تم پرواز پر خود کو غیر ضروری طور پر نمایاں کرلوگی۔''

''پرواز شروع ہوگی تو دیکھا جائے گا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا ''اس وقت ہم زمین پر ہیں۔ زمین کی اور زمین والیوں کی بات کرو۔''

''وہ دو بچوں کی ماں ہوکر بھی تم سے دو چار برس چھوٹی نظر آرہی تھی۔'' میں نے اسے چڑایا۔

''ضرور آرہی ہوگی۔ یہاں بے توقیر گھرانوں کی اوباش اور خودسر لڑکیاں چودہ پندرہ برس کی عمر میں بھی اتنے بچے پیدا کرلیتی ہیں۔ بچوں کی تعداد کو عمر کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ تمہاری وہ ڈارلنگ چہرے سے چڑیل نظر آرہی تھی۔ تم بلاوجہ اسے حور قرار دینے پر تلے ہوئے ہو۔''

اس نے بات کو ایک بالکل نیا رنگ دے دیا تھا۔ بحث کے معاملے میں اس نے انتہائی جناتی دماغ پایا تھا۔ کسی بات پر اٹک جاتی تھی تو ہر لفظ کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا مفہوم پیدا کرلیتی تھی اور مخاطب کو زچ کردیتی تھی۔ بحث میں ہار ماننا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔

میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

گینگ وے کے آخری سرے سے جڑے ہوئے جہاز کے دروازے پر بھی ایک ائر ہوسٹس اپنے مرد ساتھی کے ہمراہ مسافروں کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ مسکراہٹوں کے تبادلے اور نشستوں کے بارے میں رسمی رہنمائی حاصل کرنے کے بعد میں آگے بڑھا تو کچن میں لندن بلکہ برطانیہ کے متعدد اخبارات اور رسائل سے سجی ہوئی ٹرالیاں نظر آئیں۔ مجھے اس طرف متوجہ پاتے ہی لڑکی نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں نے دو اخبار اٹھالیے۔

دوسرا اخبار اٹھاتے ہی میری نگاہ سن پر پڑی جو پہلے اخبار کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی سرخی سنسنی خیز اور دلچسپ تھی۔ میں نے ایک اخبار چھوڑ کر سن اٹھالیا۔

راہداری کی طرف مڑتے ہوئے میری اور ویرا کی نظریں چار ہوئیں تو اس کی آنکھیں کسی انجانی مسرت سے دمک رہی تھیں۔ شاید اس نے بھی سن کی شہ سرخی دیکھ لی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ سن نے لندن کی جس خبر کو اپنی سرخی کی زینت بنایا تھا، اس سے شہر کے دوسرے اخبارات کیوں محروم رہے تھے۔ ویرا نے ایئرپورٹ کے بک اسٹال سے جو اخبار خریدا تھا اس میں مذکورہ خبر کے بارے میں کوئی موہوم ترین اشارہ تک نہیں تھا۔

اس وقت پرواز کا اعلان ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہم دونوں جہاز میں قدم رکھنے والے پہلے مسافر نہیں تھے۔ ہم سے پہلے کئی اور محتاط مسافر جہاز میں قدم رنجہ فرما چکے تھے اور اس وقت وسیع و عریض کیبن میں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔

جہاز کے سفر میں درمیانی نشستیں کبھی بھی میری

پسندیدہ نہیں رہیں۔ کھڑکی کے ساتھ والی نشست میری پہلی ترجیح ہوتی ہے کیونکہ وہاں زیادہ سے زیادہ ایک اجنبی سے مفاہمت کی مجبوری درپیش ہوتی ہے۔ ہم نے مقررہ وقت پر بلکہ روایتی مفہوم میں قبل از وقت بورڈنگ کاؤنٹر سے رجوع کیا تھا۔ ہمیں اپنی پسند کی نشستیں کسی حیل وحجت کے بغیر مل گئی تھیں۔

ویرا مجھ سے پہلے، کھڑکی سے ملی ہوئی نشست پر براجمان ہوگئی۔ میں راہداری والے سرے پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے بیٹھتے ویرا نے میرے ہاتھ سے سن چھین لیا۔

''سرخ بی ایم ڈبلیو میں خون آلود لاش۔'' چند موٹے موٹے الفاظ پر مشتمل سن کی وہ سرخی دوسری تمام ذیلی خبروں کو نگل گئی تھی۔ بظاہر وہ اسی خبر کا ضمیمہ معلوم ہورہا تھا۔

''کمال ہے...... دوسرے اخباروں میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''خبر دیر سے ملی ہوگی۔'' اس نے اخبار کی لوح پر ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا ''یہ سن کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ صبح کی پہلی اشاعت میں سن بھی اس خبر سے محروم رہا ہوگا۔''

''آواز دھیمی رکھو!'' میں نے اس کا بازو دبا کر اضطراری لہجے میں کہا ''اس خبر میں ہماری غیر معمولی دلچسپی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔''

وہ تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرائی پھر بولی ''فکر مت کرو۔ اس وقت پورا جہاز خالی ہے اور پھر ہم اردو میں باتیں کررہے ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ ہم کسی خطرے کے بغیر جہاز میں آگئے ہیں تو ذرا سی دیر میں یہاں سے پرواز بھی کر جائیں گے۔''

بے اختیار میرا ہاتھ اپنی جیب میں رینگ گیا مگر پھر سگریٹ کا پیکٹ ٹٹول کر خالی ہی لوٹ آیا۔ سگریٹ پینے کی شدید طلب کے باوجود میں بے بس تھا کیونکہ رکے ہوئے طیارے میں تمباکو نوشی پر سخت پابندی ہوتی ہے۔

چند ثانیوں بعد ویرا نے ایک گہرا سانس لے کر سن میری گود میں ڈال دیا اور تفکر آمیز لہجے میں بولی ''یہ بالکل ابتدائی خبر ہے لاش کے لباس میں سے برآمد ہونے والے شناختی کاغذات سے اس کے اصل نام کا سراغ ملا ہے اور خبر میں اسی حوالے سے سنسنی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اس کا تبصرہ جاری رہا مگر میں اسے بھول کر خبر پڑھنے میں منہمک رہا۔

لاش کا سراغ لگانے کا سہرا لندن پولیس کے ایک تربیت یافتہ کتے کے سر تھا جسے ساتھ لے کر ایک سپاہی شہر کی متعدد پارکنگ لاٹس کا گشت کرنے کے بعد یوسٹن اسٹیشن پہنچا تھا، رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر شہر کی پارکنگ لاٹس میں کی جانے والی مجرمانہ کارروائیوں کا سراغ لگانے کے لیے وہ گشت لندن پولیس کے روزمرہ معمولات میں شامل تھا۔

ٹیری نامی کتا یوسٹن پر کار سے اترتے ہی بے چین ہوگیا اور مخصوص غراہٹوں کے ساتھ ایک طرف جانے کے لیے زور لگانے لگا۔ اس کی معیت میں سپاہی سرخ بی ایم ڈبلیو تک پہنچا تو کتے نے ڈکی کو سونگھ سونگھ کر اتنی اونچی آواز میں بھونکنا شروع کردیا کہ اسے قابو رکھنا دشوار ہوگیا۔

وائرلیس پر قریبی گشتی گاڑی کو موقع پر طلب کرکے بی ایم ڈبلیو کو نگرانی میں لے لیا گیا۔ گاڑی کے مالک کا سراغ لگانے کے لیے اسٹیشن کے پیجنگ سسٹم پر بار بار اعلانات نشر کرائے گئے۔ جب کوئی سراغ نہ ملا تو ایک مجسٹریٹ اور چند معزز شہریوں کی موجودگی میں مقامی رجسٹریشن نمبر والی اس بی ایم ڈبلیو کی ڈکی کھولی گئی جس میں ایک صحت مند اطالوی نوجوان کی مڑی تڑی لاش موجود تھی۔

لاش کی کنپٹی پر کسی شدید اور خون آلود ضرب کا نشان موجود تھا اور دل میں مڑی ہوئی پتلی اور دہری دھار کا ایک چاقو پیوست تھا۔

کاغذات کی بنا پر معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا نام راماکا روزینی ہے۔ اخبارات کے کرائم رپورٹروں کے لیے وہ نیا نام نہیں تھا۔ مافیا کے ڈان روزینی کا بیٹا اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور آئے دن لڑائی جھگڑے کی خبروں میں جگہ پاتا رہتا تھا۔

لندن کی سرزمین پر سسلی کے ایک خودسر اور طاقتور ڈان کے بیٹے کا سفاکانہ قتل ہر شخص کے لیے ایک بھیانک

سوالیہ نشان بن کر سامنے آیا تھا۔
سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ راماکا کیوں مارا گیا تھا؟ اس کے قاتل کون تھے؟

گینا اور جیمز پنڈت کے خون کی سرخی دھندلانے بھی نہ پائی تھی کہ راماکا کی لاش سامنے آگئی تھی۔ خبر اور اخباری تبصرے کے آخر میں سن نے اپنے قارئین کو سسپنس اور بے یقینی میں مبتلا کرنے کے لیے ایسی سطریں جمائی تھیں جو لرزہ خیز تھیں۔

''کیا سسلی کی مافیا اپنے ڈان کے بیٹے کے قتل پر خاموش رہے گی؟''

''ایسا تو نہیں کہ لندن کی پرسکون فضاؤں میں زبردست کشت وخون کی دھند منڈلا رہی ہو!''

میں نے اخبار موڑ کر اگلی نشست کے پشت گاہ سے لگے ہوئے تھیلے میں ڈال دیا۔

''اچھا ہوا کہ چلتے چلتے یہ خبر بھی سامنے آگئی۔ اس خبر کا امریکی اخبارات میں جگہ پانا ممکن نہیں تھا۔'' مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر ویرا نے دھیمی اور پرسکون آواز میں کہا۔

''یہ کوئی عام قتل نہیں تھا۔ مافیا کے بڑوں کو چھینک بھی آجائے تو یہ عالمی خبر بن جاتی ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ وہ کئی دن تک بند ڈکی میں سڑنے سے بچ گیا۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

وہ ہنس پڑی'' آج کل یہاں کا موسم اچھا ہے۔ مرنے والے کئی دنوں تک اپنی تازگی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی نے یہ خبر سکون بلکہ خوشی سے پڑھی ہوگی۔''

''وہ اپنے شوہر کی انگریزی سے نابلد معلوم ہوتی ہے۔ اسے انگریزی کی ذرا بھی شدبد ہوتی تو میں تمہارا بدلہ لینے کے لیے اس دانہ ڈالنے کی کوشش ضرور کرتا۔''

ویرا مجھے گھورنے لگی ''بدلے کا نام نہ لو۔ میں تمہاری ان حرکتوں سے خوب واقف ہوں، جہاں کسی خوب صورت عورت کو دیکھتے ہو، پھسل جاتے ہو۔ بس میرے سامنے تمہاری انا بلند ہونے لگتی ہے ورنہ ہر حسین وجمیل لڑکی کے سامنے تم ناک رگڑنے پر بھی آمادہ رہتے ہو۔''

''فضول الزام تراشی مت کرو۔'' میں نے بگڑ کر کہا ''میں کبھی بھی عورتوں کا ایسا رسیا نہیں رہا۔ یہ تمہارے اپنے دل کا چور ہے جو تمہیں میرے بارے میں خرافات بکنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔''

''بس، نازنینوں کے سامنے ناک رگڑنے کا ذکر سنتے ہی تنک گئے!'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی ''اور پھر جمال پرستی کا دعویٰ کرتے ہو...... ذرا اپنی اردو شاعری پڑھو۔ حسینوں کی گالیاں اور جوتیاں کھا کے بھی شاعر خوش بلکہ نازاں نظر آتے ہیں۔ تمہارے کوئی مشہور شاعر تو ایک مہ جبین کے چوکیدار سے ہی پٹ کر خوش ہوتے پھرتے تھے کہ اس نے نہ سہی، اس کے چوکیدار نے ان کو مار دھاڑ کے اعزاز سے نوازا تھا۔''

''تم نے ناشتے میں زیادہ پرخوری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب معدے کی زہریلی گیسیں تمہارے کمزور ذہن پر اثر انداز ہورہی ہیں۔ اردو شاعری میں کہیں بھی راہ چلتی عورتوں کا ذکر نہیں ہے۔ شاعروں نے جو کچھ کہا ہے، اپنے محبوب کے حوالے سے کہا......''

''ہاں...... آں ٹھیک ہے۔'' ویرا نے میری بات کاٹ دی ''جوتی محبوب کے ہاتھ میں ہو تو چمڑے کے بجائے مخمل کی بن جاتی ہے، اس کے چوکیدار کا ڈنڈا چھوئی موئی کی لچک دار شاخ کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ اسرار ورموز تو بس تم اور تمہارے شاعر ہی جانتے ہیں۔ مجھ جیسی عملی عورت خواب وخیال کی ان دیوانگیوں کو کہاں سمجھ سکتی ہے۔ یہ غنیمت ہوا کہ ہم لندن سے روانہ ہورہے ہیں۔ یہاں رکے رہتے تو میں تمہیں راماکا روزینی کی بیوہ کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑنے سے کہاں تک روک سکتی تھی۔''

''اب اپنی زبان کو لگام دو۔'' میں نے خشک لہجے میں اسے لتاڑا'' جہاز میں مسافروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ یہ لوگ اردو سمجھیں یا نہ سمجھیں، تمہاری زبان سے مرنے والے کا نام سن کر کوئی نہ کوئی چونک سکتا ہے۔ سیر وتفریح کے لیے آئے ہوئے لوگ ایسے مقامی جرائم میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے کہ فضائی سفر کے دوران میں ان ہی پر مغز زنی کرتے رہیں۔''

''تمہارا مشورہ مناسب ہے۔'' ویرا نے چڑانے والے انداز میں کہا ''اس کے لیے مرنے والے کے الفاظ

ہی مناسب ہیں۔اب تم میری زبان سے اس کا نام نہیں سنو گے۔''

''نام ہی نہیں، تم اس کا ذکر بھی نہیں کرو گی۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

''خوب زبردستی ہے؟ خود اس کی بیوہ کو دانہ ڈالنے کے ارادے باندھ رہے ہو اور مجھے زبان تک کھولنے کی آزادی نہیں دے رہے۔یاد رکھو یہ سراسر ظلم ہے اور ظلم حد سے بڑھنے لگتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔''

وہ واضح طور پر میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی''جہنم میں جاؤ۔'' یہ کہہ کر میں نے دوبارہ اخبار اٹھالیا۔ اس وقت مجھے ویرا پر باقاعدہ تاؤ آنے لگا تھا۔

''یہ ناممکن ہے۔ میں اکیلی جہنم میں نہیں جاسکتی۔'' ویرا نے فوراً ہی احتجاج کر ڈالا۔

''پھر جسے چاہو، اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''مرنے والا خوشی سے میرے ساتھ جہنم میں جاسکتا تھا مگر وہ پہلے ہی وہاں پہنچا ہوا ہے۔اب لے دے کر تم ہی رہ جاتے ہو۔'' اس وقت ویرا پر بولتے رہنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

چند ثانیوں تک وہ میرے جواب کی منتظر رہی۔ مجھے خاموش پا کر اس کی زبان دوبارہ چل پڑی''اس وقت ہم دونوں ایک کشتی بلکہ ایک جہاز کے سوار ہیں۔ دونوں کی منزل بھی ایک ہی ہوگی۔ یہ پرواز صحیح سلامت نیو جرسی کے ائرپورٹ پر اتر گئی تو نیویارک اور راستے میں طیارہ پھٹ کر گر پڑا تو دونوں براہ راست جہنم میں جائیں گے۔ میں اکیلی کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''خدا کا خوف کرو۔ایسی بدشگونی کی باتیں نہ کرو۔ یہ نہ بھولو کہ تمہاری کالی زبان کئی سو مسافروں کی جان لے سکتی ہے۔'' میں نے ہلکی سی پھریری لے کر کہا۔

وہ ہنس پڑی اور مجھے زبان دکھا کر بولی''میری زبان کالی نہیں، گلابی ہے۔ اگر اس وقت تم اس قدر توہم پرستی میں مبتلا ہو چکے ہو تو میری بددعا ہے کہ یہ جہاز بحر اوقیانوس پار کرتے ہوئے برمودا ٹرائی اینگل کے طلسم میں گھر کر نیست ونابود ہوجائے......''



اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات اٹھارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو ساتھ ہی شائع ہورہا ہے۔

